مرآۃ الغالب علیہ رحمت اللہ

حضرت غالب علیہ الرحمۃ کے اُردو دیوان کی مکمل

شرح

(از)

جناب سید وحید الدین احمد صاحب بیخود جانشین حضرت داغ مرحوم

(ناشر)

عثمانیہ بک ڈپو ۱۰۴ لوئر چیت پور روڈ۔ کلکتہ ۱۲

قیمت:۔ پانچ روپے (صہ/)

بہ اجازت

جناب آغا طاہر صاحب نبیرۂ حضرت آزاد

ناشر

عثمانیہ بُک ڈپو

۱/۱۰۴ لور چیت پور روڈ۔ کلکتہ ۱-۷

طبع دوم ۱۰۰۰

مطبوعہ

تاج پریس ۶/۱ ایڈن اسپتال روڈ

کلکتہ ۱/۱

هوالجمیل

دیباچہ

جب زمانے نے حضرت ذوق و مومن سے مسندِ سخن کو خالی پایا اور نظم کا چراغ گُل ہونے لگا تو آسمانی برکتوں کو آخر بار بصد التجا بلایا اور عروسِ سخن کو بنا سنوار کر فارسی کے ملک الشعرا و مرزا نوشہ کے سامنے لا بٹھایا۔ خدا کی قدرت ہے کل تک جس کا کلام "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" تھا، آج اُس کے سامنے زبان بھی سرنگوں ہے۔ محاورہ بھی ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ وہ ایچ پیچ کی غیر مانوس ترکیبیں بھی اُلجھ اُلجھ کر سُلجھ گئی ہیں جس کے لئے خود اپنا اُردو کلام باعثِ ننگ تھا۔ آج باعثِ فخر ہے۔

حقیقت بھی یوں ہے کہ دہلی کا وہ زمانہ جس میں یہ حضرات جلوہ افروز بزمِ ادب تھے نظم کی دنیا میں بہترین زمانہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ میر و سودا نے جو پیوند لگائے تھے، اُن پودوں میں اب پھل آ رہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص بذاتِ خود ایک انجمن اور مشاعرہ تھا۔ ہر ایک کی زبان فرہنگ آصفیہ کی کان تھی۔ دہلی کی آخری ادبی بہار کے افسانے میں اکثر ایسے نام نظر آتے ہیں جن کا نظیر ہم اب تک پیدا نہیں کر سکے، نہ اُمید ہے کہ نظم کی کان سے ایسے لعل بے بہا دوبارہ پیدا ہوں گے۔

اللہ اکبر۔ دہلی نے ایک وہ وقت دیکھا ہے جب کہ تاج ملک الشعرائی حضرت ذوق کے سر پر چمکتا تھا۔ اور زبان کی صفائی اور محاورہ کی چستی انتہا کو پہنچائی جا رہی تھی ادھر معنی آفرینی کی اقلیم پر حکیم مومن خاں صاحب مومن کی حکومت تھی جنکی نازک مزاجیاں شیشہ سے پتھر کو توڑ رہی تھیں، عروسِ سخن کے دولہا حضرت ظفر تھے کہ ہر آئین سخن آرائی

پر ایک نیا رنگ اور حاشیہ چڑھا رہے تھے۔

مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ اگرچہ فارسی میں ظہوری اور نظیری سے اُونچے اڑاتے تھے۔ اور ریختہ ان کی آنکھوں میں گرد سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا مگر اساتذہ کی بلند پروازیاں۔ احباب کی فرمائشیں، زمانے کی رفتار ان کو بھی اس انجمن میں لئے چلی آئی تھی۔ ان کے علاوہ مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہؔ۔ حکیم آغا جان عیشؔ، غلام علی خاں صاحب وحشتؔ۔ نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہؔ۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب نیرؔ۔ حافظ غلام رسول ویرانؔ۔ حافظ غلام رسول صاحب شوقؔ۔ حضرت ظہیرؔ۔ حضرت انورؔ۔ حضرت مجروحؔ۔ حضرت زین الدین صاحب عارفؔ۔ حضرت معینؔ۔ حضرت بشیرؔ۔ حضرت داغؔ۔ حضرت سالکؔ۔ مولوی عبد الکریم صاحب سوزؔ۔ مرزا قادر بخش صاحب صابرؔ۔ میاں خورسندؔ۔ میاں تشنہؔ تھے۔ اور ان کے علاوہ سارا شہر ایک برات تھی جو رات دن اُردو نظم کے بیاہ رچاتی تھی اور نئے سے نیا گل کھلاتی تھی اور زبان بجائے ریختہ اور ریختی کے زبان اُردو کہلانے لگی تھی۔

افسوس جب اُن میں سے بہت سے چراغ بجھ گئے تو اُردو بے سرپرست کے رہ گئی۔ قدرت کی نظر انتخاب اس شخص پر پڑی جس کو اس زبان میں شعر کہنا اور پڑھنا بھی عار تھا۔ مگر آفریں ہے اس ارسطو سخن پر جس وقت یہ بوجھ اس کی گردن پر رکھا گیا تو اس طرح سنبھالا گویا اُن کا اپنا مال تھا۔ ان کی ذاتی دولت تھی جو واپس آگئی۔ اس تغیر کو اگر معجزہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ اگر مرزا کے کلام کو تقسیم کیا جائے اور غدر سے کچھ دنوں پہلے کا کلام الگ کر دیا جائے، اس وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ مرزا اُردو میں شعر کہتے ہیں یا فارسی میں۔ آج جو ہم ان کے ہمعصر شعراء کے طعن آمیز اشعار مرزا کی نسبت سُنکر چونک اُٹھتے ہیں اس کی حقیقت اس وقت معلوم ہو۔ مگر جب اُردو کی ملک الشعرائی اور سرپرستی خود اُنھیں کے سر پر رکھی گئی تو آنکھیں کھُل گئیں۔

اس وقت زبان میں تغیر پیدا ہوا۔ میر و ذوق کی زبان اشعار میں نظر آنے لگی۔ معنی آفرینی جو مومن خاں صاحب کے قابو سے بھی نکل جایا کرتی تھی اب صاف محاورہ میں کھپ گئی اور شاعرانہ فلسفہ اُردو میں تکمیل کو پہنچا۔

غدر کے کچھ دنوں بعد جب مرزا کی شاعری نے اپنا پورا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھالیا اور شیرینیِ زبان۔ لطفِ سخن نے ہر طرف مرزا کا ڈنکا بجایا اور مرزا کے اُردو کلام کی بھی مانگ شروع ہوئی تو مرزا کے احباب نے اُردو دیوان چھپوانے کا قصد کیا مگر سارا دیوان چھپوانا بہت خطرناک تھا۔ لہٰذا انتخاب کیا گیا اور یہ سترہ سو اشعار کا انتخابی گلدستہ کٹ چھٹ کر سروسہی بن کر نکلا اور سارے ہندوستان میں پسندیدگی سے دیکھا گیا۔

مگر وہ زمانہ ایسا انقلاب خیز تھا کہ اچھے اچھے نقش مٹ گئے۔ فارسی جس نے ہندوستان میں آکر سب پرپُرزے درست کئے تھے مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ فنا ہوگئی۔ اُردو بچہ زبان۔ بازاری زبان۔ اس میں فلسفہ۔ حکمت۔ اخلاق۔ عشق کے انتہائی جذبات کہاں۔ کیونکہ اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے عام لوگ جن میں یہ باتیں مفقود، تو مرزا کا دیوان اپنی خصوصیات کی وجہ سے نہیں بلکہ شیرینیِ زبان اور اندازِ بیان کی وجہ سے پھیلا اور زندہ رہا۔

اس زمانے میں دو قسم کے لوگ مرزا کے اُردو دیوان کو پڑھتے تھے۔ اول وہ طبقہ جو مرزا کی فارسی شان سے آشنا تھا اور ہر طرح مرزا کی باتوں اور نکتوں کا عاشق تھا۔ دوسرے عام اُردو غزل خواں حضرات جو مرزا کو اُردو کا سب سے بڑا شاعر۔ مشکل پسند شاعر۔ غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ آخر پہلا طبقہ فنا ہوگیا۔ دوسرے طبقہ نے زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلائے اور پڑھنے کے ساتھ سمجھنے کی بھی کوشش کی جس کے لئے عام طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ جو مرزا کے کلام کا شائق ہوتا وہ پتہ لگاتا کہ اس وقت

مرزا کے کلام کا مفسر کون ہے۔ اس سے پڑھتا اور دوسروں کو بھی پڑھاتا۔

مگر جب تعلیم کے چرچے عام ہوئے اور ان چیزوں کی طرف ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ بڑھنے لگے تو اس وقت بعض حضرات نے شرح کی ضرورت سمجھی اور لکھی بھی گئیں جن میں سے مشہور جناب نواب حیدر یار جنگ طبا طبائی کی ہے۔ وہ ہماری خوش قسمتی کی وجہ سے ہم میں موجود ہیں، ورنہ وہ تو طبقہ اعلیٰ کے انسان ہیں۔ لہذا نئی روشنی کے خیالات کا انھوں نے بہت کم خیال رکھا اور اکثر اجتہاد سے کام لیا۔ دوسری جناب شوکت میرٹھی نے شرح لکھی مگر وہ شاید دو صدی پیچھے کے شاعر تھے، خدا جانے کیا کیا لکھ گئے۔ ان کی شرح خود اپنی ایک شرح چاہتی ہے۔

مولانا حالی نے یادگار میں اکثر اشعار کو اس طرح بیان کیا جس طرح حق تھا مگر مکمل شرح نہیں ہے۔ شاعری پر ریویو کرتے کرتے لکھ دیئے ہیں۔ بعد میں فٹ نوٹ کی شان سے جناب نظامی بدایونی۔ حضرت حسرت موہانی۔ حضرت سہا نے شرحیں نکالیں جنھوں نے بہت کچھ آسانی اور سہولت بہم پہنچائی اور اشتیاق کے جذبہ میں آگ لگائی اور ہر طرف غالب ہی غالب آوازیں آنے لگیں۔

گزشتہ سال مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو ایک جگہ حضرت غالب کا ذکر ہو رہا تھا اور اشعار پر بحث تھی۔ احباب اس کے مختلف معنی بیان کر رہے تھے۔ بعض جگہ دہلی کے خاص محاورے پر تذکرہ تھا۔ اکثر مروجہ شرحوں سے سند لاتے تھے۔ ایک صاحب جناب بیخود صاحب کی طرف اپنے معنوں کو منسوب کرتے تھے جو قرین قیاس اور نفیس تھے۔ اس دن مجھے خیال آیا کہ مرزا غالب دہلی کی جان۔ اُردو کی جان۔ پھر اب تک کسی دہلی والے نے شرح نہیں لکھی۔ اگر ایسا ہو جائے تو ضرور بہتر صورت پیدا ہو جائے گی۔ اس کا تذکرہ کئی جگہ کیا گیا۔ اکثر اصحاب نے جناب حاجی سید وحید الدین صاحب بیخود جانشیں حضرت داغ کا نام تجویز کیا اور کہا کہ اس وقت مرزا کے دیوان کے مفسر ہیں۔

شاید ان کے بعد دہلی میں ایسا آدمی میسر نہ آئے۔

اِس خیال کے آتے ہی میں آغا حیدر حسن صاحب قدرؔ شاگرد رشید جناب بیخودؔ صاحب کو ساتھ لے کر پہنچا اور اپنا منشاء ظاہر کیا۔ حضرت بیخودؔ کی حالت یہ ہے کہ دلی انگریزی حکومت کی نا ناآفرینیوں کی جولانگاہ ہے، مگر اُردو کے حق میں صحرا ہو گئی ہے تو اسی اُجڑی بستی میں حضرت بیخودؔ سجادۂ ادب بچھائے قناعت کے گوشہ میں درس و تدریس کے سلسلہ سے قیام رکھتے ہیں۔ ہاتھوں میں اِس قدر رعشہ ہے کہ اپنا نام دونوں ہاتھوں سے قلم تھام کر بمشکل تحریر فرماتے ہیں۔ انھوں نے ہر چند اِن باتوں کا عذر فرمایا مگر میں نے اور اُن کے حلقۂ تلامذہ نے آخر ان کو منا لیا اور ایک کاتب ملازم رکھ کر یہ شرح لکھنی شروع کر دی۔

اِس شرح کی اشاعت کے لئے سب سے پہلے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ دوسرا حضرت بیخودؔ صاحب کا شکریہ۔ مگر وہ میں کیا ادا کر سکتا ہوں۔ اہل زبان، اہل ملک ادا کریں۔ میں تو خود ہمیشہ فخر کیا کروں گا کہ میری ناچیز کوشش سے یہ گراں بہا چیز تیار ہو گئی اس کے ابتدا میں حضرت بیخودؔ صاحب کا وعدہ تھا کہ مرزا کی اُردو شاعری پر ایک مقدمہ لکھوں گا مگر شاعرانہ نازک مزاجی نے اُردو دانوں کو اس سے محروم کر دیا۔ شاید آئندہ کرم کی نگاہ ہو جائے تو تحریر فرما دیں۔

مرزا کے اُردو کلام پر مقدمہ لکھنا میرا کام نہیں۔ نہ شاعرانہ حیثیت سے نہ فلسفیانہ شان سے۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں بہت بڑی ہیں۔ حضرت بیخودؔ نے شرح کو عام فہم بنانے کی جس قدر کوشش کی ہے، اگر مقدمہ بھی ساتھ تحریر فرما دیتے تو بہت کچھ امداد ملتی۔

حضرت بیخودؔ صاحب کی شرح زیادہ تر اسی خیال سے چھپوائی گئی ہے کہ شاعرانہ ترکیبیں، زبان کے نکتے۔ دلی والوں کا خاص طرزِ ادا۔ عشقیہ جذبات سب عام فہم

ہو جائیں۔ اور کوئی بات سوائے یورپین فلسفہ کے باقی نہ رہے، سو وہ میدان ابھی بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم نے ابھی ابتدا کی ہے۔ خدا ہمارے ملک میں ایسے ہونہار پیدا کرے کہ اس کی فلسفیانہ شرحیں لکھیں اور اس چھوٹے سے دیوان کو آسمانِ ادب پر پہنچا دیں۔

یہ شرح انشاءاللہ ہر سمجھدار اور ذی حس انسان کو اُس کے تخیل میں بلند پروازی کرنا سکھلائے گی۔ اور غالب کے سمجھنے کے علاوہ وہ اپنے آپ کو بھی سمجھنے کے قابل ہو جائے گا، انشاءاللہ +

دعا کا محتاج

طاہر نبیرۂ حضرت آزاد

۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزل

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مطلب یہ ہے کہ ہستی موجبِ ملال و آزار ہے بسبب ناپائداری اور فانی ہونے کے۔ تشریح یہ ہے کہ نقش عالم یعنی موجودات عالم فریادی ہے نقاشِ ازل کی شوخیِ تحریر کا (فریادی کا لباس قدیم دستور ایران کے موافق کاغذ کا ہوا کرتا تھا جس طرح ہندوستان میں فریاد کرنے والے دن کو مشعل جلا کر لاتے تھے یا عرب میں مقتول کا لباس برچھے پر رکھ کر قصاص لینے کے لئے جاتے تھے) شوخی کے معنی ہیں قیام پذیر نہ ہونا۔ اور قیام پذیر نہ ہونا ثابت ہے تصویر کے کاغذی پیرہن ہونے سے۔ یعنی عام دستور ہے کہ تصویر کاغذ پر کھینچی جاتی ہے اور کاغذ جلد بگڑ جانے والی چیز ہے۔ ہر پیکرِ تصویر سے مراد جملہ حیوانات۔ جمادات۔ نباتات سے ہے۔ اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے، پھول دن بھر میں کمُلا جاتا ہے۔ انسان کی موت کا کوئی وقت معین نہیں ہے۔ لکڑی۔ پتھر۔ دھات کی بنی ہوئی اشیاء بھی انجام کار بیکار اور شکستہ ہو جاتی ہیں۔ جب موجوداتِ عالم کا یہ حال ہو تو نقشِ ہستی کا ایسی ناپائداری اور بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے بلند تخیل اور غیر معمولی جدت کا ثبوت کامل ہے۔ میری رائے میں شعر معنی خیز اور خیال ایک اچھوتا خیال ہے۔ اس شعر کو بے معنی کہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاوِ کاوِ کے معنی کاوش اور کاہش کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں، فرہاد کے واسطے حسب فرمائش شیریں، جوئے شیر کا لانا اس قدر دشوار اور مشکل نہ تھا جس قدر ایک عاشق وصل طلب تمنا نصیب کے لئے شبِ فراق کا سحر کرنا اور وہ بھی سخت جانی کی حالت میں یعنی سخت جانی نے مرجانے کی اُمید بھی قطع کردی ہے۔ فرہاد کے واسطے کوہِ بے ستون کا کاٹنا ایک شغل تنہائی

تھا. عاشق کو تنہائی کی رات کا کاٹنا ایک صدمۂ جاں گسل ہے۔

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے　　　سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

دم شمشیر آبداری شمشیر کو کہتے ہیں اور آب ہمیشہ باڑھ کے باہر کے حصتہ پر ہوا کرتی ہے. عاشق آبِ شمشیر کا سینۂ شمشیر سے باہر ہونا اپنے جذبۂ بے اختیار شوق کی دلیل بتاتا ہے اور دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے. شعر کے آبدار ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے　　　مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

آگہی کے معنی اطلاعیابی اور خبرداری کے ہیں. مطلب شعر کا یہ ہے کہ سامع کی اشعار فہمی کا شوق صیاد بن کر جس قدر چاہے فریب کے جال بچھائے مگر میرے اشعار کا مطلب طائر عنقا صفت ہے جو کسی کے دامِ فریب میں پھنستا ہوا معلوم نہیں ہوتا. یعنی میرا کلام سراسر اسرار غیبی ہے۔ عام فہم نہیں ہے جو ہر کس و ناکس سمجھ سکے. چنانچہ مرزا صاحب اُردو کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "شعر گوئی مضمون نگاری کا نام ہے. قافیہ پیمائی کو شعر گوئی نہیں کہتے۔"

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا　　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیر پا بیقرار و مضطرب ہونے کا استعارہ ہے. حلقۂ زنجیر کا گرمیِ وحشت سے موئے آتش دیدہ بن جانا جتا رہا ہے کہ اب زنجیر زنجیر نہیں رہی ہے. یعنی مجھ کو قید کرنے کے لئے زنجیر کافی نہیں ہے قاعدہ ہے بال کو جب آگ پر رکھا جاتا ہے تو وہ آگ کی گرمی سے مرجھا کر حلقہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور بودا ہو جاتا ہے. مرزا صاحب فرماتے ہیں. حلقۂ زنجیر میری گرمی وحشت کے مقابلے میں موئے مجاعد سے زیادہ ناپائدار ہے۔ زنجیر کی کڑیوں کو موئے آتش دیدہ سے تشبیہ دینی نئی طرح کی جدت ہے۔

غزل

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　　　صحرا مگر بہ تنگیِ چشم حسود تھا

فرماتے ہیں. قیس کے سوا مرد میدان عشق کامل پیدا نہ ہوا. شاید اس کا سبب یہ ہو کہ صحرا چشم حاسد

کی طرح تنگ تھا جس میں گنجایش ہی کسی دوسرے عاشق کی نہ تھی مطلب شعر کا یہ ہے قبیلۂ عامر میں سے پھر کوئی قیس جیسا عاشق کامل پیدا نہ ہوا جو دشتِ نجد کو آباد کرتا۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست　　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی پریشاں حالی اور پریشاں خیالی۔ سویدا سودا کی تصغیر۔ دل پہ ایک کالا دھبہ ہوا کرتا ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں میرے دل پر جو نقش سویدا ہے وہ میری آشفتہ حالی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یعنی میں نے جو پریشاں حالی میں افشائے راز کے خوف سے دھواں دھار آہیں ضبط کی ہیں اُس سے میرے دل پر یہ داغ پڑ گیا ہے۔ چنانچہ دھوئیں سے سیاہ داغ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ داغ کی پونجی دھواں تھی۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ　　جب آنکھ کھُل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

مطلب یہ ہے۔ جن آلام ہجر۔ صدمات رشک خواہشاتِ وصل میں عہد شباب گذرا ہے۔ اور جو وصل اور ملاقاتوں کے مزے لوٹے ہیں وہ سب ولولے اور جوش کا زمانہ گزر جانے کے بعد ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی انسان یہ سب باتیں خواب میں دیکھتا ہو اور آنکھ کھُل جانے پر اِن باتوں کے اثر فوائد اور نقائص فوراً طبیعت سے زائل ہو جائیں۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز　　لیکن یہی کہ رفت گیا اور بُود تھا

مکتبِ غمِ دل بالکل نیا اور اچھوتا استعارہ ہے۔ فرماتے ہیں دل کھوئے ہوئے مجھ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر ابھی غمِ دل کی مکتب میں یہی سبق لے رہا ہوں کہ رفت گیا اور بُود تھا یعنی دل کے جانے کا بھی افسوس ہے۔ اور یہ بھی یاد آتا ہے کہ دل کبھی میرے پہلو میں تھا بھی مگر یہ یاد نہیں آتا کہ دل کب کھویا اور کیونکر کھویا۔ بے اختیاری عشق کی تصویر اس سے بہتر لفظوں میں نہیں کھنچ سکتی۔ اس پر طرہ بیخودی کی آمیزش۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی　　میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ جیسا میں اصل میں تھا اور جیسا مجھ کو ہونا چاہیئے تھا ویسا کسی لباس

میں بھی ظاہر نہ ہو سکا۔ انجام کار کفن نے میرا داغ عیوب برہنگی چھپا لیا ورنہ میں ہر لباس میں یعنی آدمیت کو دھبہ لگانے والا قرار پاتا رہا۔ ہر لباس سے مراد یہاں مختلف زمانے مختلف اور ہر عمر ہے۔ یعنی میں وہی تو ہوں جس کو ملائک نے سجدہ کیا تھا۔ دنیا میں آنے کے بعد میری وہ وقعت وہ عزت میرے اعمال و افعال کی وجہ سے باقی نہ رہی۔ لڑکپن کی بے تمیزیاں۔ جوانی کی بے اعتدالیاں۔ نفس پرستیاں۔ پیری کی ہوسناکیاں، میرے جامہ حقیقت کو دھبہ ہی لگاتی رہیں۔ البتہ مرجانے کے بعد کفن نے ان داغوں کو چھپا لیا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

فرماتے ہیں۔ بغیر تیشہ کے کوہکن شیریں کے عشق میں جان نہ دے سکا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ محبت کا نشہ اس حد تک نہ پہنچا تھا کہ فرہاد بغیر اسباب قتل کے قتل ہو جاتا یعنی شیریں کا نام سُن کر ایک آہ کھینچتا اور جان سے گزر جاتا۔ مگر یہ نہ کر سکا۔ اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ رسوم و قیود کا پابند تھا۔ اس کو یوں بیان کیا ہے کہ "سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا"۔ خمار نشہ کے آمادگی حالت کو کہتے ہیں اور قیود جمع ہے قید کی۔ یہاں قید بمعنی پابندیِ رسم استعمال ہوا ہے۔

غزل

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

معشوق کا یہ کہنا سُن کر کہ تمہارا دل جو گم ہو گیا ہے اگر ہم کو کہیں گرا پڑا مل گیا تو ہم تم کو واپس نہ دیں گے۔ مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں، دل ہمارے پاس ہے کہاں جو ہم کھوئیں گے۔ ہاں یہ بات سُن کر ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے ہیں۔ یعنی ہمارا دل آپ ہی نے چرا لیا ہے۔ اب الزام سے بری ہونے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہمیں مل گیا تو ہم نہ دیں گے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی۔ درد لا دوا پایا

فرماتے ہیں۔ زندگی کا لطف طبیعت نے عشق سے پایا ہے۔ یعنی بے عشق زندگی گزارنا ایک درد لا دوا تھی۔ اس کی دوا مل گئی مگر درد عشق سے لا دوا ہے۔ اسکی دوا دنیا میں کسی کے پاس

نہیں ہے۔" درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا" یہ اسلوبِ بیان مرزا صاحب کے سوا مبدءِ فیاض سے کس کو عطا ہوا ہے۔

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

دوستدارِ دشمن۔ یعنی دشمن کا دوست۔ دشمن سے مراد یہاں معشوق سے ہے، فرماتے ہیں وہ ہمارا دشمن ہے اور دل اس کا دوست ہے۔ اب ہم دل پر خاک بھروسہ کرسکتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں۔ آہ و نالہ میں اثر نہیں۔ اثر کیونکر ہو دل سے نالہ کیا جائے تو تاثیر بخشے، افسوس اِس بات کا ہے نہ آہ اثر کرتی ہے نہ نالہ رسا ہوتا ہے۔ دل کی دشمنی کا خوب ثبوت دیا ہے۔

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری حُسن کو تغافل میں جُراُت آزما پایا

اِس بیان کے قربان جایئے۔ کیسے پیچیدہ خیال کو کس حُسن و خوبی سے بیان کیا ہے۔ سادگی، بھولا پن۔ پرکاری۔ چالاکی۔ بے خودی۔ غفلت۔ ہشیاری۔ خبرداری۔ فرماتے ہیں۔ معشوق کو تغافل یعنی غفلت میں جراُت آزما پایا۔ مطلب یہ ہے۔ عشاق کا دل دیکھنے کے لئے معشوقوں کا بھولا پن ہوا کرتا ہے۔ درحقیقت یہ بھولا پن خاص ہشیاری اور عین چالاکی ہے۔ نشستِ الفاظ کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

غنچہ پھر لگا کِھلنے آج ہم نے اپنا دل خوں کیا ہوا دیکھا۔ گُم کیا ہوا پایا

مطلب یہ ہے۔ ہمارا دل خون ہو کر آنکھوں کی راہ سے زمین پر ٹپک گیا تھا اور پہلو میں کہیں اس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ آج ہم نے اسی دل کو دیکھ لیا اور پالیا۔ یعنی یہ غنچۂ گل جو فصلِ بہاراں میں پھر دوبارہ کِھلا ہے ہمارا دل ہی تو ہے جو خزاں کے زمانے میں خون ہو گیا تھا دل کو اکثر غنچہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اسقدر یعنی ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

فرماتے ہیں۔ دل کی حقیقتِ حال سے ہم واقف و خبردار نہیں ہیں کہ کب گیا اور کیونکر گیا یعنی عشق ایک بے اختیاری شے ہے جو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس وقت پیدا ہو گیا اور کس طرح پیدا

ہو گیا۔ لیکن اس قدر ہم جانتے ہیں کہ ہم نے دل کو ہزاروں بار ڈھونڈا ہے اور تم نے اس کو ہزاروں بار پایا ہے۔

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

فرماتے ہیں۔ ناصح کی نصیحت نے بے جا نے زخم دل پر نمک چھڑک دیا جس کا مزہ کچھ دل ہی لے رہا ہے آپ سے یعنی حضرت ناصح سے تو کوئی پوچھے کہ آپ کو کیا لطف حاصل ہوا۔

غزل

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

فرماتے ہیں۔ میرا دل سوزِ نہاں سے بے خوف ہو کر جل گیا۔ اور اس کے جلنے کی صورت یہ تھی کہ "آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا" آتشِ خاموش وہ آگ جو چپکے چپکے سُلگا کرتی ہے اور جس میں شعلہ نہیں اُٹھتا۔ سوزِ نہاں کے مقابلے میں آتشِ خاموش کا لفظ مصرعہ ثانی میں استعمال کرنا انتہائے بلاغت ہے۔ مرزا صاحب کے بیان کی خصوصیات میں سے یہ بات ہے کہ بغیر ارادہ اور تلاش کے اکثر لفظی رعایتیں واقع ہو جاتی ہیں، جن کو صنعتِ الفاظ میں شمار کیا گیا ہے۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مطلب یہ ہے۔ عشق میں یاس و ناامیدی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب دل میں ذوقِ وصل اور یادِ یار تک باقی نہیں ہے۔ اس کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ خانۂ دل میں ایسی آگ لگی کہ جو کچھ سرمایہ تھا وہ سب جل گیا اب کچھ باقی نہیں رہا۔ قاعدہ ہے ناامیدی جب حد سے گزر جاتی ہے تو توقع خود بخود مٹ جایا کرتی ہے۔ جیسے ہجوم یاس نے ایسا کیا ہے دل کہ حسرت کو تیرے آنے کی اب امید باقی ہے نہ خواہش ہے۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

فرماتے ہیں۔ میں عدم سے بھی کچھ آگے نکل گیا ہوں یعنی فنا فی اللہ ہو گیا ہوں۔ البتہ جب اِس منزل کو طے کر رہا تھا تو بارہا میری آہِ آتشیں سے عنقا کے بازو میں آگ لگ گئی تھی۔

مطلب یہ ہے، میں نے ابتدائے تعلیم فنا میں شہرتِ عنقا کو مٹا دیا تھا جس کو معدوم ہونیکی ایک سب سے زیادہ دلیل سمجھا جاتا ہے۔ غافل سے یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو ترقیات انسانی کو سمجھ نہیں سکتے۔

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں　　　　کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

فرماتے ہیں میں اپنے پُرسوز مضامین کی گرمی کا بیان کہاں جاکر کروں۔ میں نے سوچا تھا شہر کو چھوڑ کر جنگل میں بیان کروں گا۔ رمیدگی کا خیال آتے ہی جنگل میں آگ لگ گئی۔ مرزا صاحب کا مدعا اس بیان سے یہ ہے کہ نافہموں کی کثرت دیکھ کر جیسا پُرسوز شعر لکھنے کو میرا جی چاہتا ہے لکھ نہیں سکتا اور اپنے تخیل کی پوری پوری بلند پروازیاں دکھا نہیں سکتا یعنی نافہموں کے سامنے اظہار کمال سے ہچکچاتا ہوں جوہر اندیشہ سے جوہر فکر مراد ہے۔

دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار　　　　اِس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

معشوق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ یہ جو تو میرے سینے کے داغوں کی سیر اور روشنی دیکھ کر تعجب کر رہا ہے اور حیرت میں بتلا ہے۔ میرے دل کے مقابلہ میں ان کی کچھ حقیقت نہ تھی اگر میرا دل میرے پہلو میں ہوتا اور تو اُس کا تماشہ دیکھتا تو حقیقتِ حال سے واقف ہوتا مگر کیا کروں وہ کارفرما ہی مٹ گیا۔ البتہ یہ اس کا پرتو اور اثر باقی رہ گیا ہے جس کو تو دیکھ کر حیرت و تعجب کر رہا ہے۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل　　　　دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہل دنیا جل گیا

فرماتے ہیں شگفتگی خاطر جو روزِ ازل میں خصوصیت کے ساتھ مجھ کو ملی تھی جس کی بدولت میں زمانہ بھر میں لطیفہ گو اور بذلہ سنج مشہور ہو گیا تھا۔ اب اس کے مقابلہ میں افسردہ خاطری کا تمنائی اور آرزومند ہوں۔ اور اس خواہش کا اصلی سبب طرز تپاک اہل دنیا ہے۔ یعنی یہ لوگ مجھ سے منافقانہ برتاؤ کرتے ہیں۔

غزل

شوقِ ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

قیس کا لقب مجنوں ہے۔ مجنوں دیوانہ کو کہتے ہیں۔ دیوانہ اکثر ترک لباس کر دیتا ہے۔ شوق کے معنی یہاں عشق کے لیے گئے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ عشق دنیا کے سر و ساماں کا دشمن نکلا۔ ساماں دنیا میں لباس بھی داخل ہے۔ مطلب یہ ہے۔ رنگ عشق ایسا پختہ واقع ہوا تھا کہ قیس کو تصویر کے لباس میں بھی اُس نے [illegible] ہی رکھا۔ رنگ تصویر جس سے دستی تصویر کھینچی جاتی ہے وہ بھی قیس کی عریانی کا پردہ نہ بن سکا۔ اب ہر رنگ کے معنی ملاحظہ ہوں۔ یعنی عشق میں۔ جنون میں۔ عریانی میں۔ تصویر کے رنگ میں۔ الغرض ہر رنگ میں عشق دشمنِ ننگ و ناموس ہی رہا۔ ظاہر ہے کہ قیس عاشق تھا جنگل میں رہا۔ ترک لباس کیا۔ دیوانہ لقب پایا۔ مرزا صاحب کے کمال کو دیکھئے کہ اُنھوں نے پردۂ تصویر میں بھی اس کو عریاں ہی دکھایا۔

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

تنگ دلی اور تنگ چشمی کا استعمال رشک و حسد کے موقع پر ہوتا ہے اور یہاں تنگ دلی سے رشک کے عربی کے معنی مقصود ہیں جس کو عربی میں غبطہ کہتے ہیں۔ اور غبطہ کے معنی جس پر رشک کیا جائے اس کے صفات حاصل کرنے کے ہیں۔ پرافشاندن کے معنی اہل ایران کے محاورہ میں ترکِ تعلق کردن کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ زخم نے غبطۂ دل کی داد نہ دی یارب جس کے سبب سے تیر بھی ترکِ تعلق کر کے سینۂ بسمل سے نکل گیا۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ رشک دل نے تیر کی خلش سے سینہ کو بچا دیا اور وہ اس طرح کہ دل نے سینہ کے رشک سے جس میں یار کا تیر جاکر جا لگا تھا جان دے دی۔ اب تیر یار نے دیکھا کہ دلِ عاشق بغیر زخم کے مر گیا، میری ضرورت باقی نہ رہی۔ ترکِ تعلق کر کے سینے سے نکل گیا۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پھول کی خوشبو۔ دل کی فریاد۔ چراغ کا دھواں۔ یہ سب چیزیں ہوا کے ساتھ پھیلنے والی اور بکھر جانے والی ہیں۔ شاعر ان پر رشک کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی پریشانی کا باعث ہوا نہیں

ہے بلکہ یہ بھی تجھ پر عاشق ہوکر تیری بزم سے نکلتی ہیں اس لئے پریشان ہیں۔ مدعا یہ ہے، کہ تجھے دیکھ کر اور تجھ سے مل کر یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی پریشان نہ ہو یعنی تجھ پر عاشق نہ ہوجائے۔

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد	کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

مائدہ کے معنی کھانا دینے والے یا کھانا تقسیم کرنے والے کے ہیں۔ مرزا صاحب نے اس مقام پر دسترخوان کے معنی لئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میرا دل حسرت زدہ لذتِ درد کا دسترخوان تھا جس پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ یاروں کو اُن کی قابلیت و ذوق کے موافق حصہ میرے دسترخوان سے ملا۔ یہاں کچھ کمی نہ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی اپنی قابلیت کے موافق لوگ مجھ سے مستفیض ہوئے۔

ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند	سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

فرماتے ہیں میری ہمت اور میرا حوصلہ اس قدر دشوار پسند واقع ہوا ہے کہ فنا کی تعلیم اس کے واسطے ایک معمولی سا کام سمجھنا چاہیئے جیسے کسی مولوی کو الف۔ ب۔ ت پڑھائی جائے، گویا مشکل کی بات ہے جس کام کو ایک زمانہ دشوار اور مشکل سمجھتا ہے وہ بھی میرے واسطے آسان نکلا۔ ایک اور جگہ پر بھی مرزا صاحب نے اس مضمون کو بیان کیا ہے، وہاں فرماتے ہیں ؎

فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے	کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالبؔ	آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

پھر کا لفظ اِس مطلب کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ گریہ میں دوبارہ شور و غل پیدا ہوا۔ شور و غل پانی کی وہ آواز جو دریا یا سمندر میں جوش کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں پہلی بار تو میں نے اس جوش کو اس قدر ضبط کیا تھا کہ دریائے گریہ کا ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہ نکلنے دیا۔ افسوس ہے وہ اب دریا بن کر نکلا اور طوفان کی صورت اس نے پیدا کرلی۔ شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ عشق نے ظاہر ہوجانے کا سامان پیدا کرلیا۔

غزل

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا — عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

فرماتے ہیں وہ شخص دھمکانے سے مر گیا جو میدان جنگ میں پہلے کبھی نہ اُترا تھا۔ یہ اشارہ ہے فرہاد کی طرف۔ عشق نبرد پیشہ وہ سپاہی جو ہمیشہ لڑتا رہتا ہے اپنے مقابلہ میں ایک بہادر سپاہی کو بُلا رہا ہے اور وہ بہادر سپاہی ہم ہیں۔ ہم نے فرہاد کی طرح عشق کی دھمکی میں آکر جان نہیں دی بلکہ مردانگی کے ساتھ عشق اور مصائبِ عشق کا مقابلہ زندگی بھر کرتے رہے۔

تھا زندگی میں مَوت کا کھٹکا لگا ہوا — اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

فرماتے ہیں۔ مجھے زندگی میں بھی مَوت یاد تھی اِس لئے میں نے اپنے کو فنا ہونے سے پیشتر فنا کر دیا تھا۔ اس بیان کا لطف کچھ اہل تصوّف ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ جو مُوتوا قبل ان تموتوا کے راز سے آشنا ہیں۔ دوسرے مصرعے میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے، "اُڑنے سے پیشتر بھی میرا رنگ زرد تھا" یعنی موت کی مُردنی چھا جانے سے پہلے میرے مُنہ پر موت کی مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ اِس زمین میں ایسا بلند شعر کہنا مرزا ہی جیسے ماہرِ فن اور مسلّم الثبوت اُستاد کا کام تھا۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں! — مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

فرماتے ہیں۔ ابتدائے عشق میں اُس وقت جب کہ میں وفاداری کے متعلق نسخوں کی تالیف کر رہا تھا اور ادویۂ وفا کی ایک ایک دوا کا خواص و مزاج قایم کر رہا تھا اور وہ ایسا وقت تھا کہ میرا خیال وفا کی ایک ایک خوبی کو علٰحدہ علٰحدہ جانچ رہا تھا، مجھ پر ستم کا آغاز ہو گیا۔ اور میری وفا کے نسخے نامکمل اور ناتمام رہ گئے۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اِس رہگذر میں جلوۂ گُل آگے گرد تھا

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی خوشی اور فارغ البالی کے زمانے میں دل شگفتہ اور طبع رنگین رکھتے تھے۔ ہر وقت وہ بہاریں پیش نظر رہتی تھیں جن کے سامنے جلوۂ گل بھی گرد ہوا جاتا تھا مگر زمانے کا کچھ ایسا انقلاب ہو گیا ہے کہ اب دل سے جگر تک ایک دریائے خون کے سوا

اور کچھ بھی نہیں ہے. جب دل شگفتہ رکھتے تھے اب با خاطر پریشان زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں. انقلاب زمانہ کی کس قدر سچی اور پُر اثر تصویر کھینچی ہے.

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

فرماتے ہیں. عشق پیدا ہو جانے کے بعد یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ آدمی اُس سے نجات پاسکے. یعنی جب تک دل پہلو میں تھا اُس وقت تک اندوہِ عشق نے دوسرا رنگ دوسرا پہلو اختیار کر رکھا تھا. جب سے دل جاتا رہا دل کے جانے کا درد و غم اُسی طرح پہلو میں رہا. مطلب یہ ہے, جان بچنے کا کوئی پہلو نہ دل کی موجودگی میں تھا نہ دل کے جانے کے بعد نظر آتا ہے.

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

قاعدہ ہے کہ دیوانے آدمی کو پاگل خانے میں مقیّد رکھ کر اُس کے جنون کا علاج کیا کرتے ہیں. مرزا صاحب فرماتے ہیں. دوست آشنا میری وحشت کا کچھ علاج ہی نہ کر سکے. وحشت اور دیوانگی سے باز رکھنے کے لئے مجھ کو قید کیا تھا. مگر قید خانہ میں بھی میرا خیال اسی طرف بیاباں نورد رہا. جس طرح میں خود قید ہونے سے پیشتر وحشت کے عالم میں جنگل جنگل پڑا پھرتا تھا.

یہ نعش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

فرماتے ہیں. اسدؔ خستہ جاں جب تک زندہ رہا آزادی کے عالم میں رہا. قید علایق سے بالکل آزاد تھا. مرنے کے بعد اس کی لاش کا بے کفن ہونا بتا رہا ہے کہ وہ اب بھی گور و کفن کی قید سے آزاد ہے. " حق مغفرت کرے " اس جملۂ دعائیہ نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے.

غزل

شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

یہ ساری غزل اُس زمانہ کی ہے جب مرزا صاحب پر فارسیت کا رنگ غالب تھا.

ردیف کے سوا پورے پورے مصرعے فارسی میں ہیں۔ یہاں تک کہ مطلع کے مصرعۂ اولیٰ میں ردیف کا پہلو بھی فارسی ہے۔ یعنی اہل ایران کے ہاں مرغوب آمد محاورہ ہے۔ مگر معنی کے اعتبار سے یہ ایک ایسا اچھوتا مضمون ہے جس کو آج تک کسی شاعر کے خیال نے مس نہیں کیا۔ فرماتے ہیں شمار سبحہ میرے بتِ مشکل پسند کو بہت ہی پسند آیا ہے۔ نہ اس لئے کہ وہ بھی تسبیح پر پڑھنا چاہتا ہے بلکہ اِس واسطے کہ ایک جھپٹے میں سَو دلوں پر قبضہ حاصل کر لینے کی ترکیب ہاتھ آگئی۔ جس طرح زُہاد و عباد سَو دانوں کی تسبیح کو سمیٹ کر مٹھی میں لے لیتے ہیں اسی طرح میرا معشوق جو ایک بُتِ عیار ہے زاہدوں اور عابدوں کی دیکھا دیکھی سَو دلوں کو مٹھی میں مار لیتا ہے۔ تسبیح کے دانوں سے دل کا استعارہ کیا ہے جو نہایت قریب الفہم اور نیا استعارہ ہے۔

بہ فیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے — کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

یہاں بیدلی کے معنی بھی نااُمیدی کے لئے گئے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں نااُمیدی کے فیض سے ہمیشہ کی ناکامیابی آسان ہوگئی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے جب کوئی آدمی کسی کام سے پورا پورا نااُمید ہو جاتا ہے تو اس کام کی کامیابی میں جو کاوش اور کاہش دلی کوششوں کی وجہ سے ہوئی ہے، ہٹ جایا کرتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں یہ مطلب ادا کیا گیا ہے کہ ہمارا عقدۂ مشکل کشاکش کو پسند آگیا ہے۔ قاعدہ ہے جو شے کسی کو مرغوبِ طبع ہوتی ہے اور پسند آجاتی ہے تو وہ اُس کو قایم رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے امکان تک اس کی حفاظت میں مصروف رہتا ہے جب کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آگیا تو وہ اسے کیوں کھلنے دے گی۔ اور جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارا عقدۂ دشوار لاینحل ہے تو اُمیدِ عقدہ کشائی اُٹھ کر نااُمیدی کی صورت میں ہمیشہ کو تسکینِ خاطر حاصل ہوگئی۔

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ہوا کے معنی یہاں شوق کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ قاتل کو پھولوں کے دیکھنے کا شوق اور

یہ شوق اس کی ستمگاری کا آئینہ ہے۔ یعنی ہمارا قاتل جو باغ میں سیر کے واسطے جاتا ہے وہ باغ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے اور رنگ رنگ کے پھول دیکھنے کے لئے نہیں جاتا بلکہ وہ تو صرف اُن پھولوں کو دیکھنے جاتا ہے جو شاخوں سے جھڑ کر زمین پر گر پڑے ہیں اور ہوا کے جھونکوں سے کروٹیں بدل رہے ہیں وہ اُن جھڑے ہوئے پھولوں کو تماشائے رقص بسمل سمجھتا ہے، اور اس کو ان کے دیکھنے سے فرحت و مسرت حاصل ہوتی ہے۔

جراحت تحفۂ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ — مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

مرزا صاحب کا پہلودار بیان اس مقطع میں دو معنی پیدا کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ میرا غمخوار جو دوست کو سمجھانے اور مجھ سے ملاقات پر آمادہ کرنے کے لئے گیا تھا وہ وہاں سے تحفہ میں زخم ہیرے کی کنی۔ داغِ جگر لے کر واپس آیا ہے یہ مطلب یہ ہے کہ وہ خود عاشق ہو گیا۔ دوسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ حضرت عشق یہ سامان خرابی لے کر جناب اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ کی ملاقات کو تشریف لائے ہیں۔

غزل

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلّی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

فرماتے ہیں دنیا میں جو لوگ وفاداری سے کسی کے دل پر نقشِ وفا قایم کر دیتے ہیں وہ گویا ایک بیکار کام میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اس لئے نقشِ وفا اہلِ وفا کے لئے موجب تسلّی خاطر اور سبب اطمینانِ طبیعت نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اہلِ دنیا دستور دنیا کے موافق وفا کے صلے میں جفا و ستم کے مستحق قرار دیئے جاتے ہیں۔ مرزا صاحب اپنی تسلّی خاطر ان لفظوں سے فرماتے ہیں۔ وفا وہ لفظ ہے جس کے کچھ معنی ہی نہیں ہیں، گویا وفاداری دنیا میں بیکار بات ہے۔

سبزۂ خط سے ترا کاکُلِ سرکش نہ دبا — یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

مشہور ہے کہ زمرد سے سانپ اندھا ہو جایا کرتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں تیرے سبزۂ خط

سے زلف کا افعی سرکش اندھا نہ ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ خط نکل آنے پر بھی زلفوں کی دلفریبی اور اور سرکشی میں فرق نہ آیا۔ سبزۂ خط کو زمرد سے اور کاکل کو سانپ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں　　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ مر جانے کے بعد فکرِ وفا سے چھٹکارا ہو جاتا لیکن وہ ستمگر میرے مرنے پر رضامند نہ ہوا۔ نزاکتِ خیال اس شعر میں یہ پیدا کی گئی ہے کہ موت جو ایک بے اختیاری اور ناگزیر امر ہے اس کو اختیاری اور دوست کی مرضی کا تابع ظاہر کیا گیا ہے مگر دوست ستمگر ہے وہ عاشق کے مرنے پر رضامند نہیں ہوتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی موت میری بدنامی کا باعث قرار پائے گی۔ علاوہ ازیں میرے شغلِ ستم میں فرق آجائے گا اور سب سے زیادہ یہ خیال مانع ہے کہ ایسا وفادار دوسرا شخص مجھ کو کہاں ملے گا۔ لفظی اور معنوی خوبیوں کی اس شعر میں کوئی انتہا نہیں رہی ہے۔

دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی　　　گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ اگر سانس راہ منزل پرہیزگاری نہ بن سکا تو کچھ غم نہیں۔ میرا دل گزرگاہِ جام و شراب تو بن سکتا ہے۔ میں جام و شربت کے خیال ہی میں دل کو مست رکھوں گا۔ اگر زہد و تقویٰ سے طبیعت کو خوش نہیں کر سکتا۔ رندی اور پرہیزگاری کو برابر تصور کیا گیا ہے۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی　　　گوش منت کشِ گلبانگ تسلی نہ ہوا

مطلب یہ ہے کہ اگر تو نے وصل کا وعدہ نہ کیا تو بھی میری خوشی کا باعث ہے اس سبب سے کہ میرے کان کبھی تسلی کی آواز سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ اگرچہ میرا مقصود وصل ہی تھا لیکن اسلئے کہ میں کبھی شرمندۂ احسان نہ ہوا تھا۔ اسی ناکامیابی سے خوش ہوں۔

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے　　　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ محرومی قسمت ہمارے حصہ میں آگئی ہے۔ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں وہی نہیں ہوتا یہاں تک ہماری قسمت کو ہم سے ضد ہے کہ ہم نے دنیا کے غمنسوں سے تنگ آکر یہ چاہا

تھا کہ بلا سے مر ہی جائیں تو یہ بھی نہ ہوا۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰؑ نہ ہوا

حریف، مد مقابل۔ فرماتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے ابھی پورا قُم بِاِذنِ اللہ نہ کہا تھا صرف ہونٹوں کو خفیف سی جنبش ہوئی تھی کہ غالبؔ کا کام تمام ہوگیا۔ یعنی وہ اتنا نحیف و ناتواں تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے ہونٹوں کی حرکت کو بھی برداشت نہ کر سکا۔

غزل

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

طاقِ نسیاں اُس طاق کو کہتے ہیں جس میں کچھ رکھ کر بھول جائیں۔ طاقِ نسیاں کا گلدستہ وہ گلدستہ ہے جس کو طاقِ نسیاں میں رکھ کر بھول گئے ہوں۔ بیخودوں کی بہشت کو طاقِ نسیاں کے گلدستہ سے تشبیہ دینی بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو آج تک کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزری۔ مطلب یہ ہے کہ زاہد جس باغِ جنت کی اس قدر مدح کرتا ہے وہ ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا وہ گلدستہ ہے جس کو ہم نے دل سے اُتار دیا اور بھلا دیا۔

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

خون کے قطرے کو مونگے کے دانے سے جو تسبیح میں ڈالا جاتا ہے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں۔ مژگانِ یار کی کاوش نے قطرہ خوں آنسو بنا دیا ہے جنھوں نے مسلسل لڑی وار جمع ہو کر تسبیح مرجاں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مضمون شعر ندرت سے خالی نہیں ہے۔

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

سطوت رعب۔ نیستاں نے کا جنگل۔ نے بانسری کو کہتے ہیں۔ نے نوازی بھی محاورہ ہے۔ اور بانسری بجانی بھی بولا جاتا ہے۔ دانتوں میں تنکا لینا اظہارِ انکسار کرنا۔ ہندوستان میں بھی اس کا عمل درآمد ہے۔ اور خس بدنداں گرفتن فارسی محاورہ بھی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں قاتل کا رعب داب بھی میرے نالوں کو نہ روک سکا۔ اس کے خوف سے اظہارِ عجز کے لئے جواب

میں نے دانتوں میں دبایا وہ نَے بن کر خود بخود بجنے لگا اور اس سے نالہ کی آواز پیدا ہو گئی۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے　　مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا

فرماتے ہیں۔ اگر مجھکو زمانے نے مہلت دی تو میں تم کو سیر دکھاؤں گا۔ میرا ہر ایک داغ سروِ چراغاں کا بیج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داغِ عشق ابھی دل میں پیدا ہوا ہے اور وہ گویا تخم ہے سروِ چراغاں کا۔ اگر زمانہ کا کوئی انقلاب پیش نہ آیا تو وہ میرے دل سے تھوڑے دنوں میں سروِ چراغاں پیدا ہو جائیگا۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے　　کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

شبنمستاں مرکب ہے شبنم اور ستاں سے۔ شبنم اوس کو کہتے ہیں۔ ستاں وہ مقام جہاں اوس پڑتی ہو۔ آئینہ خانہ وہ مکان جس میں دیواروں پر چاروں طرف آئینے کے ٹکڑے نصب کئے گئے ہوں بعرفِ عام میں جس کو شیش محل کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں تیرے جلوے نے شیش محل کا وہ حال کر دیا ہے جو آفتاب کی گرمی شبنم کا کر دیتی ہے۔ جس طرح شبنم کے قطرے آفتاب کی گرمی سے بہہ کر اُڑ جاتے ہیں اسی طرح تیرے جلوے کی گرمی سے آئینے پانی ہو کر بہہ گئے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تعمیر عمارت مکان۔ خرابہ۔ ویرانہ۔ کھنڈر۔ ہیولا۔ مادہ۔ خونِ گرم۔ سرگرمی۔ مطلب یہ ہے کہ میرا جسم فانی ہے۔ یعنی میرا وجود میری فنا کی دلیل ہے۔ جس طرح دہقان کی سرگرمی خود اس کے کھلیان پر بجلی کا کام دیتی ہے اُسی طرح میرے جسم میں فنا ہونے کی قابلیت پوشیدہ رکھ دی گئی۔ دوسرا مصرعہ پہلے مصرعے کی شرح تصور کیا جائے۔

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشہ کر　　مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

سبزہ سے مراد سبزۂ بیگانہ ہے۔ اور سبزۂ بیگانہ اُس گھاس کو کہتے ہیں جو برسات کے موسم میں بے موقع مقام پر پیدا ہو جاتی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ مکان کے ویران ہونے کے بعد یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ اس میں جگہ جگہ یہ گھاس اُگ رہی ہے۔ دربان کا کام بیگانہ آدمی کو گھر کے اندر نہ آنے دینے کا ہے اس لئے وہ سبزۂ بیگانہ کو کھود کھود کر گھر سے باہر نکالتا ہے۔ ویرانی

کو خطاب کر کے کہنا۔ اے ویرانی تو یہ سَیر تو دیکھ. لطف سے خالی نہیں ہے۔

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں   چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میری خاموشی میں چھپی ہوئی لاکھوں آرزوئیں ہیں. گویا میں بے زبان بجھا ہوا چراغ ہوں گورِ غریباں کا۔ چراغ کی لَو کو آدمی کی زبان سے تشبیہ دی ہے. اور بجھے ہوئے چراغ سے مراد بے زبان آدمی ہے۔ یہ تشبیہ خوں گشتہ آرزوؤں سے مناسبت رکھتی ہے۔

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے   دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

فرماتے ہیں۔ ابھی تک تھوڑا سا خیالِ یار کا عکس باقی ہے۔ اگرچہ میری افسردہ خاطری نے خیالِ یار کو دل سے بُھلا دیا ہے. لیکن اس ذرا سے پرتو میں بھی اس بلا کا نور ہے کہ میرے دلِ افسردہ پر حجرۂ زندانِ یوسفؑ کا گمان ہوتا ہے۔ حجرہ چھوٹی کوٹھری کو کہتے ہیں۔ دل افسردگی سے تنگ آکر حجرہ بن گیا ہے۔

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ   سبب کیا، خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

تبسم ہائے پنہاں۔ وہ تبسم جس کا اثر ہونٹوں پر برائے نام ظاہر ہو۔ فرماتے ہیں. خواب میں آکر تبسم پنہاں کا سبب شاید یہ ہے کہ آپ کسی مقام پر غیر کے پہلو میں آرام فرما رہے ہیں، اور میرے جلانے کے واسطے خواب میں آکر چوری سے مسکراتے ہیں۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا   قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیرے مژگاں کا

فرماتے ہیں. کس کس عاشق کا لہو پانی کی طرح تو نے بہایا ہوگا۔ یعنی کن کن لوگوں کو بے گناہ قتل کیا ہوگا۔ تیری مژگاں کا آنسوؤں سے تر ہونا قیامت سے کسی طرح کم نہیں ہے. معلوم ہوتا ہے اب اُن بے گناہوں کی یاد تجھ کو رُلا رہی ہے۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ   کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

فرماتے ہیں۔ جادۂ راہِ فنا دنیا کے اجزائے پریشاں کا شیرازہ ہے۔ تمام اوراق عالم فنا ہو کر اسی ایک ڈورے میں منسلک ہو جاتے ہیں. مطلب یہ ہے کہ جس رشتے میں تمام اوراقِ عالم سِئے ہوئے

ہیں میں اُس رشتے کو بھولا نہیں ہوں یعنی جادۂ فنا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

غزل

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا	حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

یک بیاباں ماندگی۔ بہت تھک جانا۔ ذوق سے مراد یہاں ذوق صحرانوردی ہے۔ فرماتے ہیں امیں خواہ کیسا ہی تھک جاؤں میرا شوقِ صحرانوردی کم نہ ہوگا جس طرح موجِ آب آگے چمکنے کی غرض سے اُبھرتی ہے اُسی طرح میرا نقش قدم آگے بڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے	کہ موجِ بوئے گُل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

مطلب یہ ہے، پہلے مجھے چمن سے محبت تھی اب نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ بوئے گل جو بیشتر مسرت اور خوشی پیدا کرتی تھی اب اس سے میرا ناک میں دم ہے۔ زمانہ کے انقلاب سے محبت نے نفرت کی صورت پیدا کر لی ہے۔

قطعہ

سراپا رہن عشق و ناگزیر اُلفتِ ہستی	عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

مطلب یہ ہے کہ سراپا مبتلائے عشق بھی ہوں اور اپنی جان کو بھی عزیز رکھتا ہوں میری مثال ایک آتش پرست کی سی ہے کہ آگ کی پرستش بھی کرتا ہوں اور خرمن کے جل جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ ناگزیر الفتِ ہستی کا یہ مطلب ہے کہ اپنے کو عزیز رکھنے پر مجبور ہوں۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے میری خلقت میں یہ بات ودیعت کر دی ہے کہ اپنی جان کو عزیز رکھوں۔

بقدر ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی	جو تو دریائے مَے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

فرماتے ہیں۔ اے ساقی شراب پلانے میں جس قدر تیرا حوصلہ بڑھا ہوا ہے اُسی قدر شراب پینے میں میں بھی عالی ظرف واقع ہوا ہوں۔ یعنی تو اگر دریائے مَے ہے تو میں ساحل کی انگڑائی ہوں قاعدہ ہے کہ شراب خوار کو نشہ کے اُتار پر انگڑائیاں آنے لگتی ہیں۔ ساحل یعنی دریا کا کنارہ باوجود دریا قریب ہونے کے ہمیشہ تشنہ لب رہا کرتا ہے۔ اس مثال سے یہ مطلب نکلتا ہے

کہ ساقی جس قدر دریا دلی سے شراب پلا رہا ہے اُسی قدر میں بھی عالی ظرف ہونیکی وجہ سے شراب کا پیاسا ہوں۔

غزل

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

فرماتے ہیں۔ راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے اور بج رہے ہیں اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔ بے مثل شعر لکھا ہے۔

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے　　یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

فرماتے ہیں۔ میرا اُڑا ہوا رنگ میرے دوست کی صبحِ بہارِ نظارہ ہے اور یہی وقت تو ہے جب اُس کے گلہائے ناز کِھلا کرتے ہیں اِس لئے معشوق سے خطاب کرکے فرماتے ہیں صبح کے وقت میرے مُنہ پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی دیکھ کر تو بھی اپنے ناز و انداز کے پھول کھلانے میں مصروف ناز و انداز ہو۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز　　میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

مژہ ہائے دراز سے یہاں دل میں اُتر جانے والی اور گھر کر لینے والی پلکیں مراد ہیں۔ فرماتے ہیں تو اور غیر کی طرف یہ تیز تیز نگاہیں۔ میں اور دل میں گھر کر لینے والی پلکوں کی تکلیف، مطلب یہ ہے تو جو لطف و عنایت کی نگاہیں غیر پر کرتا ہے مجھ کو رشک و حسد پیدا ہوتا ہے اور اُس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تیرا عشق رشک کی برچھیاں میرے دل میں چبھوتا ہے۔

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں　　طعمہ ہے ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

فرماتے ہیں۔ میں جو اپنی آہ کو ضبط کر رہا ہوں اس میں میں نے اپنا فائدہ سمجھ رکھا ہے ورنہ میرا جسم زار میرے ایک ہی نفسِ جانگداز میں گُھل کر آتش عشق کی خوراک بن جائے یعنی جس طرح شمع پگھل کر بہہ جاتی ہے، میری آہ مجھ کو فنا کر دینے کے لئے کافی ہے۔

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شیشہ باز [illegible] کا بھال متی ہوتا ہے جو تماشا کرتے وقت شیشے یا بوتل کو اُچھال کر سر و دوش پر [illegible] ہے اور ناچنے میں جسم کے ہر حصّہ پر اُس کو لے آتا ہے۔ فرماتے ہیں بہار کا موسم آنے سے شراب میں ایسا جوش پیدا ہو گیا ہے کہ جہاں جہاں فرش کے کونوں پر شراب کے بھرے ہوئے شیشے رکھے ہیں۔ اپنے اپنے مقاموں پر وہ اسی طرح اُچھل رہے ہیں جس طرح بازیگر کے سر و دوش پر جنبش دینے سے شیشہ اُچھلتا ہے اور پھر اُسی مقام پر قایم ہو جاتا ہے۔

کاوش کا دل کرے ہے تقاضہ کہ ہے ہنوز ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

فرماتے ہیں۔ یار کی گرہ بندِ قبا ہم سے آدھی کھُل کر رہ گئی پوری نہ کھُل سکی اِس جرم میں ہمارا دل ہم سے کاوش کا تقاضا کر رہا ہے اور ناخن پر ابھی تک گرہ بندِ قبا کا قرضہ باقی ہے بہتر ہے کہ ہم اپنے دل کو اس ناخن سے کہ جس سے بندِ قبا پورا نہ کھُل سکا تھا کرید کر زخمی کرلیں۔ اس سے زیادہ اس ناکامی کا بدلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

تاراج کرنا محاورہ ہے۔ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب غنیم کی فوج فتحیاب ہو کر شہر میں داخل ہوتی ہے اور اسباب وغیرہ لوٹنے پر دست دراز کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مکانوں کو بھی ڈھاتی اور مسمار کرتی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کاوشِ غمِ ہجراں نے اے اسدؔ دل پر فتحیاب ہو کر اس کو لوٹ لیا اور برباد کر دیا۔ سینے میں جو کچھ رازِ عشق یا رازِ حقیقت کے خزانے چھپے ہوئے تھے وہ سب ظاہر ہو گئے۔

غزل

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا

قلعۂ معلّی میں بعض بعض موقعوں پر متواتر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ بالخصوص اخیر بادشاہ

ظلِّ سبحانی بہادر شاہ کے عہد میں اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اِسی کے متعلق فرماتے ہیں ابزمِ سخن شاہنشاہ میں شاعروں کا دورِ دورہ پھر شروع ہو گیا۔ وہ زمانہ وہ موسم آگیا جسمیں ہفتہ وار مشاعرے جاری ہو گئے۔ گویا دفترِ سخن کھُل گیا۔ دوسرے مصرعہ میں اس خوشگوار موسم کے لئے دعا کرتے ہیں کہ الہٰی اس کانِ گوہر کے دروازے کو ہمیشہ کھُلا رکھنا۔

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھُلا　　اِس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھُلا

اس مطلع میں پھر اسی مضمون کو دوسرے لفظوں میں دُہرایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ رات ہو گئی بزمِ سخن منعقد ہونے کا وقت آگیا۔ چمکنے والے ستاروں کا منظر کھُل گیا۔ چمکنے والے ستاروں سے یہاں اشعار مراد ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں "اِس تکلف سے وہ منظر کھُلا ہے کہ گویا بُت کدہ کا در کھُلا۔ یعنی وہ انجمِ رخشندہ جو اشعار کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے آراستہ و پیراستہ ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے ڈھلے ہوئے بُت سامنے رکھدیے ہیں۔ جو مُنہ سے بول رہے ہیں۔

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب　　آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھُلا

دُشنہ چھُری کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں ہوں تو دیوانہ لیکن دشمن دوست نما کا فریب نہیں کھاؤں گا۔ آستیں میں چھُری چھپا کر لایا ہے۔ اور ہتھیلی میں کھُلا ہوا نشتر لے رکھا ہے۔ بظاہر فصد لینی چاہتا ہے جو دیوانہ کا علاج ہے۔ اور دل میں قتل کا ارادہ رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہری دوست باطن میں دشمن ہوا کرتے ہیں۔

گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید　　پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا

اس ردیف کو معولہ کہتے ہیں۔ یہاں کھُلنے کے معنی بے تکلف ہو جانے کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اس کی پیچیدہ باتیں میں نہیں سمجھ سکتا اور اس کے پوشیدہ رازمیں نہیں پا سکتا۔ لیکن میں اسی میں خوش ہوں کہ مجھ سے وہ پری پیکر بے تکلف تو ہو گیا۔

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال　　خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھُلا

فرماتے ہیں۔ میں خیال حسنِ یار میں ایسا محو ہو گیا ہوں کہ اب اس کو حُسنِ عمل خیال کرتا ہوں اور اس خیال کرنے کی وجہ یہ واقع ہوئی ہے کہ خلد کی ایک کھڑکی میری قبر کے اندر کھل گئی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ معشوق حقیقی کے تصور کامل نے مجھ کو عبادت کا کام دیا ہے اور اسی کے ذریعہ سے میری بخشش ہو گئی ہے۔ بخشش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جنت کا دروازہ قبر میں کھول دیا جائے۔

زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

اس شعر کا یہ ٹکڑا "کہ دیکھا ہی نہیں" مرزا صاحب کے حصہ کا ہے۔ معشوق حقیقی کا حُسنِ دلفریب کس نے دیکھا ہے۔ شعر کی تشریح یہ ہے، باوجود اس قدر پردوں کے، جو ظہور تجلیات قلب عشاق پر ہو رہا ہے وہ ایسا ہے کہ اُس کی صفت بیان ہو ہی نہیں سکتی۔ قاعدہ ہے سیاہ زلفیں گورے اور خوبصورت چہرے پر بے انتہا بھلی معلوم ہوا کرتی ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ نقاب زلفوں سے بھی بڑھ کر خوشنما معلوم ہوئی۔ مرزا صاحب نے زمانہ قدیم کے موافق نقاب کو مذکر باندھا ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ اب دلی والے بالاتفاق نقاب کو مؤنث استعمال کرتے ہیں۔

جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا

شعر سیدھا اور صاف ہے۔ معشوق کی تلوّن مزاجی۔ طبیعت کی شوخی۔ بالخصوص بدگمانی کی تصویر سادے لفظوں میں کھینچ کر دکھائی گئی ہے۔

آج اِدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول

شبِ غم کی تکلیفوں سے گھبرا کر اپنے دل سے سوال پیش ہے۔ کیا سبب ہے رات کیوں اندھیری ہے۔ گویا حواس ایسے بگڑ گئے ہیں کہ دماغ میں سمجھنے کی بھی قابلیت نہیں رہی ہے۔ پھر خود ہی سوچ کر جواب دیتے ہیں۔ بلاؤں کا نزول ہے۔ یعنی مجھ پر شبِ فراق میں آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور دیدۂ اختر اُس کے تماشائی ہیں۔ اِس لئے تاروں نے اپنا مُنہ آسمان کی طرف کر لیا ہے۔ اگر تاروں کی روشنی ہوتی اور میں ان بلاؤں کو آسمان سے اُترتے ہوئے دیکھ سکتا تو شاید کچھ اپنی حفاظت کی تدبیر کر سکتا۔ اب یہ بات تو خیال میں آگئی

کہ یہ رات شبِ غم ہے اِس لئے اندھیری ہے مگر نزولِ بلا سے بچنے کی تدبیر اندھیر اگھُپ ہونے کے سبب سے کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال　　نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا

فرماتے ہیں۔ میں وطن کی تکلیفوں سے بچ کر پردیس میں آرہا تھا، مگر مسافرت میں بھی حادثوں کی یہ کثرت ہے کہ جو خط نامہ بر وطن سے لاتا ہے وہ کھُلا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی کسی نہ کسی عزیز کی خبرِ مرگ درج ہوتی ہے۔ اِس صورت میں یہاں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کی رسم ہے کہ جس خط میں کسی کی موت کا واقعہ تحریر کیا جاتا ہے اس خط کا ایک کنارہ بھی کتر لیتے ہیں۔ اور لفافہ بھی نیم وا رکھتے ہیں۔

اُسکی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند　　واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھُلا

یہ مقطع نعتیہ ہے۔ شبِ معراج کا واقعہ کس خوبصورتی سے کیسے مختصر جملے میں ادا ہوگیا ہے یعنی گنبدِ بے در کا کھُلنا بتا رہا ہے کہ سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم شبِ معراج میں آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔

غزل قطعہ بند

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا　　شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

فرماتے ہیں۔ رات کو میرے سوزِ دل کی بجلی سے ابر کا پِتّہ پانی ہوگیا تھا اور جو بھنور اُس میں پڑتا تھا وہ ایک شعلۂ جوالہ بن گیا تھا۔

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام　　گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

وہاں تو اُس کو مینہ برسنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ وصل کا وعدہ کیونکر ایفا ہو سکتا تھا اور یہاں اُس کے انتظار میں یہ حال تھا کہ روتے روتے تکیہ کی روئی گویا پانی کا جھاگ بن گئی تھی۔

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال　　یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

وہاں تو اُس کی خود آرائی بناؤ سنگار کے لئے موتی پرو رہی تھی اور اس مصروفیت میں وعدہ

بھی فراموش ہو گیا تھا۔ یہاں یہ حال تھا کہ انتظار میں روتے روتے یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ آنسوؤں کی کثرت نے تارِ نظر کو بھی گم کر دیا تھا۔ مدعا یہ ہے، کہ معشوق چاہتا تھا کہ ظاہری آرائش میں کوئی کمی اور کسر نہ رہ جائے اور عاشق کا شوق اس بات کا متقاضی تھا کہ وصل کی گھڑی جلد آجائے۔ خود آرائی اور بیتابی شوق کی تصویر اس سے بہتر لفظوں میں کھنچ نہیں سکتی۔

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جُو   یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

وہاں تو اس کثرت سے پھول کھلے ہوئے تھے کہ ان کے عکس سے نہر کے پانی میں چراغ روشن نظر آتے تھے اور یہاں خون کے آنسو ندی کی طرح آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جُو   واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

فرماتے ہیں۔ میرا سرِ شوریدہ جس میں عشق و محبت کا جوش بھرا ہوا تھا، فرقت کی بیتابی اور بیخوابی سے دیوار ڈھونڈھ رہا تھا (مرزا صاحب دیوار سے سر پھوڑ کر مر جانے کی تکلیف کو فرقت میں جاگنے کی ایذا پر ترجیح دیتے ہیں) دوسرے مصرعہ میں بمقابلہ اپنی حالت کے معشوق کی حالت پر رشک کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ وہاں وہ فرقِ ناز کمخواب کے تکیوں پر رکھا ہوا تھا۔ وہ آرام سے سوتا تھا اور میں سر پھوڑنے کی جستجو میں تھا۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی   جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرماتے ہیں۔ یہاں ہماری گرم آہیں شمع کی طرح روشن ہو گئی تھیں۔ منہ سے سانس کے ساتھ شعلے نکل رہے تھے اور وہ شعلے ہماری بیخودی عشق میں اضافہ کر لے جاتے تھے وہاں فرش پر پھولوں کا بچھونا ہو رہا تھا اُس پر صحبت احباب گرم تھی۔ یعنی رقیبوں سے بیٹھے ہوئے ہنس بول رہے تھے۔

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا   یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

اِس شعر میں ترتیب بدل دی ہے۔ پہلے مصرعہ میں معشوق کی حالت دکھائی ہے۔ فرماتے ہیں

زمین سے آسمان تک وہاں خوشی کی لہروں کا ایک طوفان برپا تھا (کثرت کے لئے طوفان کا لفظ استعمال کیا ہے) یاں زمین سے آسمان تک ہمارے جلانے کے لئے آگ بھری ہوئی تھی یعنی حسرت۔ افسوس۔ رشک۔ رقیب۔ جوشِش محبت۔ اضطرابِ دل۔ یہ ساری بلائیں ہم کو تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ اپنی اور معشوق کی حالت کا تقابل مطلع سے مقطع تک جس حُسن و خوبی کے ساتھ کیا ہے اس کا لطف اہلِ مذاق اُٹھا سکتے ہیں۔

ناگہاں اس رنگ سے خوننابہ ٹپکانے لگا　　　دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

یہ شعر گریز کا ہے۔ اوپر جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کو ختم کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ ناگہاں یعنی یکایک اس طرح سے دل میں اُمنگ پیدا ہو گئی کہ دوسری غزل اس زمین میں اور لکھنی چاہیئے۔ اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "اس رنگ سے خوننابہ ٹپکانے لگا" وہ دل جو کاوشِ ناخن سے لذت یاب ہو چکا تھا۔

غزل

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا　　　تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

سپند کالا دانہ جو اکثر بچوں پر سے نظر اُتارنے کی غرض سے جلا کر اس کی دھونی دیتے ہیں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ رات کو نالۂ دل میں مطلق اثر نہ تھا۔ ہمارا دوست بزمِ غیر میں تھا اور وہ نالہ جو نہایت بیتاب تھا اور اپنے اضطراب کی وجہ سے بار بار زبان پر آجاتا تھا، بزمِ غیر کے لئے کالا دانہ بن گیا تھا۔ یعنی بزمِ غیر کو نظر بد سے بچا رہا تھا۔ نالہ کی بے اثری بالکل اچھوتے خیال کے ساتھ نئے الفاظ میں دکھائی گئی ہے۔

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے　　　خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

مطلب یہ ہے۔ سیلاب کے آنے سے میرا دل بہت ہی نشاط انگیز ہے۔ شاید میرا گھر صدائے آب سے ساز کا ہمسر ہو گیا تھا۔ ساز سے یہاں جلترنگ مراد ہے جو چینی کے سات پیالوں میں پانی بھر کر ایک چھوٹی نَے کے ذریعے سے بجایا جاتا ہے۔

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں   پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

سنجاب کا پوستین بنا کر پہنا جاتا ہے۔ اِس پوستین کو بھی سنجاب کہتے ہیں۔ خاکی رنگ کا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں جس زمانے میں خاک نشیں تھا اُس زمانے کے غرور اور تکبر کا کیا حال بیان کروں۔ اپنے خیال میں ایسا سمجھتا تھا گویا مسندِ سنجاب پر بیٹھا ہوا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ قناعت اور گوشہ نشینی بھی بہت کم کبر و غرور سے خالی ہوتی ہے۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں   ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

کچھ نہ کی۔ یعنی اچھی بات نہ کی۔ ہماری ہیٹی کر دی۔ جنونِ نارسا سے یہاں مراد عشقِ ناقص ہے۔ فرماتے ہیں۔ عشقِ ناقص نے ہم کو جلوۂ دوست سے فیضیاب نہ ہونے دیا۔ ورنہ یہاں یعنی دنیا میں تو ایک ایک خاک کا ذرہ خورشیدِ عالم تاب بنا ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ اکتسابِ فیض سے محروم رہے اور تجلیاتِ نورِ الٰہی نہ دیکھ سکے۔

قطعہ

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے   کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

فرماتے ہیں۔ یہ آج نئی بات کیا ہے کہ تو اپنے اسیروں سے بے پروا ہو گیا۔ کل تک تو تیرا دل وفا اور محبت کا دروازہ بنا ہوا تھا۔

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا   انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

فرماتے ہیں۔ وہ دن بھی تجھ کو یاد ہے کہ تیرے جال کا ہر حلقہ شکار کے انتظار میں دیدۂ بیخواب بنا ہوا تھا۔ حلقۂ دام کی تشبیہ دیدۂ بے خواب سے (جو نیند نہ آنے کی وجہ سے ہر وقت کھلا رہتا ہے) کس قدر بلیغ واقع ہوئی ہے۔

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے   اُس کے سیلِ گریہ سے گردوں کفِ سیلاب تھا

فرماتے ہیں۔ رات کو میں نے غالبؔ کو رونے سے روک لیا، ورنہ تم تماشہ دیکھتے کہ اُس کا سیلِ گریہ آسمان تک پہنچ کر آسمان کو ایک پانی کا بلبلا بنا دیتا۔

غزل

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے۔ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی اور اس لئے اُس کے ایک ایک قطرہ کا حساب اسی طرح دینا پڑیگا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے (از یادگار غالب)

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہر آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

فرماتے ہیں۔ تو نے آئینہ اس حالت میں توڑا ہے کہ جب تو اس میں اپنا مُنہ دیکھ رہا تھا اور تیرا عکس اس میں نظر آرہا تھا تو آئینہ میں اپنا تماشائی تھا اور میں یہ موقع غنیمت سمجھ کر تجھ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں سینکڑوں آرزوئیں، ہزاروں تمنائیں۔ لاکھوں خواہشیں جوش مار رہی تھیں، تیرے غرورِ حسن نے یہ گوارہ نہ کیا کہ تو اپنا ثانی آئینہ میں دیکھتا۔ تو نے آئینہ توڑ ڈالا اور اس کے ٹوٹ جانے سے میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ گویا آرزوؤں کا ایک آباد شہر تیرے آئینہ توڑ دینے سے برباد ہوگیا۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں　　جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

فرماتے ہیں۔ میں نے رہگزرِ معشوق کی آرزو میں جان دی ہے میرے اس بے مثل انجام کا انعام مجھ کو یہ ملنا چاہیئے کہ لوگ میری نعش کو گلیوں میں کھینچے پھریں۔ نزاکت ولطافت معانی اس شعر میں یہ رکھی گئی ہے کہ معشوق کی اس گلی کا پتہ نہیں دیا گیا جس کی آرزو میں جان دی گئی ہے صرف یہ ارشاد ہوتا ہے کہ میری نعش کو گلیوں میں کھینچے پھرو اور دل میں یہ خیال ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ میری نعش کو معشوق کی گلی میں بھی لے جائیں گے۔ یوں دلی مدعا حاصل ہو جائے گا۔ یہ ندرت معانی غالب ہی کے شعر میں ہوا کرتی ہے۔

موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال　　ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

فرماتے ہیں۔ دشتِ وفا کا کیا حال مجھ سے پوچھتے ہو۔ میں کیا بیان کروں۔ خیر اتنا بتا دیتا ہوں

دشتِ وفا موجِ سراب کی طرح دھوکا دینے والا ہے جس طرح موجِ سراب پانی کا دھوکا دیکر طالب آب کو ہلاک کردیتی ہے۔ اسی طرح دشتِ وفا میں خیالی اُمید کے علاوہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس کی مثال یہ پیش کی گئی کہ صحرائے وفا کی خاک کا ذرہ جوہرِ تیغ کی مانند آبدار ہے۔ مدعا یہ ہے کہ وفاداری انجام میں عاشق کی جان لے لیتی ہے۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب　　دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

فرماتے ہیں۔ ناتجربہ کاری سے اوروں کی طرح ہم بھی غمِ عشق کو کم سمجھا کرتے تھے، مگر جب اس بلا میں پھنس گئے تو حقیقتِ حال سے خبردار ہوئے۔ یعنی غمِ عشق کم ہونے پر بھی ساری دنیا کے غم سے کچھ زیادہ ہی نکلا۔

غزل

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کرسکتا (از یادگارِ غالب)

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی　　در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

فرماتے ہیں۔ میرا گریہ یہ چاہتا ہے کہ میرا گھر ڈھے جائے۔ گھر کے در و دیوار سے صحرا بننا ٹپکتا ہے یعنی ظاہر ہوتا ہے کہ اب یہ گھر کثرتِ آبِ گریہ سے گر کر بیاباں بن جائے گا۔ گریہ کی رعایت سے ٹپکنے کا لفظ بے اختیار مرزا صاحب کے خامۂ گوہر بار سے ٹپک گیا ہے جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو　　آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

فرماتے ہیں۔ دیوانگیٔ شوق۔ یعنی کثرتِ شوق نے مجھ کو ایسا خود رفتہ بنا دیا ہے کہ میں بار بار

معشوقِ حقیقی کا مشتاقِ جمال ہو کر اپنی خودی سے گزر جاتا ہوں اور نارسائی کی وجہ سے حیران ہو کر سوچتا رہ جاتا ہوں کہ ہیں میں کہاں اور اس کا دیدار کہاں۔

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

فرماتے ہیں۔ جلوۂ یار بار بار یہی کہتا ہے کہ مجھے دیکھ آئینہ فولادی کا جوہر مژگاں بنا چاہتا ہے۔ اِس لئے کہ آئینہ کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس بیان میں مرزا صاحب نے جو خوبی رکھی ہے وہ آئینہ سے زیادہ روشن ہے۔

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

فرماتے ہیں۔ قتل گاہ میں اہلِ تمنا کی خوشی کا حال مت پوچھو۔ شمشیرِ یار کا عریاں ہونا شہادت طلب لوگوں کے لئے عیدِ نظارہ ہے۔ شمشیر کو ہلال سے تشبیہ دی جاتی ہے اور رمضان مبارک کا چاند دیکھ کر تلوار دیکھا کرتے ہیں۔ یہاں شمشیر کا دیکھنا ہلالِ عید دیکھنے کے مقابل کہا گیا ہے۔ اور یہ معنی شعر کے الفاظ سے بغیر فکر و غور کے نکل آتے ہیں۔

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا

فرماتے ہیں۔ ہم تو داغِ تمنائے نشاط قبر میں لے چلے۔ اب تو ہو اور تنہائی کے عالم میں تجھ کو سَو سَو طرح سے باغ کی مانند پھلنا پھولنا نصیب ہو۔

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

یہ شعر دولخت ہے۔ اور دولخت شعر میں اکثر فعل محذوف ہوتا ہے۔ اس خوبی کے ساتھ دونوں مصرعوں کا کانٹے کی تول تُلا ہونا مرزا ہی جیسے کاملِ فن کا کام ہے۔ معنی شعر کے یہ ہیں۔ دل کے ایک ایک پارچہ کا زخمِ تمنا کھانا باعثِ عشرت و شادمانی ہے اور زخمِ جگر کا نمکداں میں سرتاپا ڈوبا ہوا ہونا لذتِ عشق حاصل کرنے کی دلیل ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دوسرے مصرعہ میں طنزاً بطور استعارہ کے دیر پشیماں کی جگہ زود پشیماں کہا گیا ہے یہ ویسا ہی

استعارہ ہے جیسا قرآن مجید میں اَنْذِرْهُمْ کی جگہ بَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْم کہا گیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے میرے قتل کے بعد اُس نے جفا و ظلم سے توبہ کر لی۔ ہائے اُس جلد پشیمان ہو جانے والے کا پشیماں ہو جانا۔ یعنی زندگی بھر تو اپنے ظلم سے پشیماں نہ ہوا اور قتل کے بعد جب کام قبضۂ اختیار سے باہر ہو گیا تو پشیماں ہوا۔ اس زود پشیماں کے لفظ کا مزا بیان نہیں ہو سکتا۔ یہ وجدانی کیفیت ہے۔ تحریر میں نہیں آسکتی۔ اہلِ مذاق ہی کچھ اس کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ایسے بلند شعر کے بعد ایسا عالی رتبہ مقطع کہنا حضرت غالبؔ ہی کا کام تھا۔ عالمِ وحشت میں جنون کے ہاتھ سے گریباں دھجیاں ہوتا ہے۔ ہجر میں خود عاشق اپنے گریباں کا ایک ایک تار الگ کرتا ہے۔ وصل میں معشوق کی دست درازیاں گریبان عاشق کے پُرزے اُڑاتی ہیں اور پھر وہ گریباں کا کپڑا کتنا ہے۔ صرف چار گرہ۔ اس تخصیص کو تو دیکھئے۔

غزل

شب خمار شوق ساقی رستخیز انداز تھا تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

فرماتے ہیں۔ رات کو شوق ساقی نے طول کھینچ کر خمار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ خمار نشہ کے اُتار کی حالت کو کہتے ہیں یہ رستخیز انداز تھا۔ یعنی قیامت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جس طرح قیامت کے دن مُردے قبروں سے اُٹھیں گے۔ اسی طرح جو چیز جہاں رکھی ہوئی تھی وہ بلند ہونی شروع ہو گئی یہاں تک کہ شراب کا احاطہ یعنی جس ظرف میں شراب رکھی ہوئی تھی وہ بھی انگڑائی کی طرح اپنے مقام سے اُبھرتا معلوم ہوتا تھا۔ قاعدہ ہے شراب خوار کو نشہ کے اُتار کے وقت جماہی اور انگڑائی آتی ہے۔ انگڑائی میں ہاتھ بلند ہو کر آپس میں مل جاتے ہیں اور یہی شکل رستخیز کی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میری طرح انتظار ساقی میں شیشہ کے اندر شراب کو بھی انگڑائیاں آنے لگی تھیں۔ شراب میں جوشش آجانے کو انگڑائی سے تشبیہ دی ہے جو مرزا صاحب کے تخیل کی بلند پروازی کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھُلا   جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

فرماتے ہیں۔ ابھی میں نے ایک ہی قدم وحشت میں بڑھایا تھا کہ دفترِ امکاں کا سبق میرے سامنے آگیا اور مجھ کو معلوم ہو گیا کہ جادۂ دشتِ دو عالم کے اجزا کا شیرازہ تھا یعنی دونوں جہان کی کیفیت مجھ پر منکشف ہو گئی۔

مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے   خانۂ مجنونِ صحراگرد بے دروازہ تھا

یہ مشہور ہے کہ لیلیٰ کئی بار کششِ محبتِ قیس سے مجبور ہو کر بسواری محمل دشتِ مجنوں میں گئی ہے اور بخوف غمازیِ ساربان یا بپاس عصمت مجنوں سے مل نہ سکی۔ اِس کے قریب ہو کر گزر گئی۔ مرزا صاحب اس قصہ کی طرف کنایۃً اشارہ کرنے کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ "خانۂ مجنونِ صحراگرد بے دروازہ تھا" یعنی لیلیٰ کا روکنے والا وہاں کوئی دربان نہ تھا۔ پھر کیا سبب مانع ہوا کہ لیلیٰ باوجود کششِ عشق کے مجنوں تک نہ پہنچ سکی۔

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن   دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

فرماتے ہیں۔ جو لوگ حُسنِ معشوق کو بناؤ سنگار سے مستغنی بتاتے ہیں وہ گویا حُسن کے استغنا کو رُسوا اور بدنام کرتے ہیں۔ دست معشوق مہندی کا منت پذیر ہے اور رخسار معشوق غازہ کا گروی ہے مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کو حنا کی اور رخسار کو غازہ کی احتیاج ہے اور یہ دونوں چیزیں باعثِ آرائشِ حُسن ہیں۔

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد   یادگارِ نالہ اِک دیوانِ بے شیرازہ تھا

اس شعر میں مرزا صاحب اپنے کمالِ شاعری کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ میرے دل کے ٹکڑے یعنی میرے عالی مضامین جو نالۂ دل کی صورت میں بے اختیار میری زبان سے نکل گئے تھے اُن کو میرے جوشِ طبیعت نے اوراقِ دل بنا کر ہوا پر اُڑا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے اچھوتے خیالات کو عالم میں پھیلا دیا۔ اب جو میں نے خیال کر کے دیکھا تو "یادگارِ نالہ اِک دیوانِ بے شیرازہ تھا" یہ اشارہ اُس اُردو دیوان کی طرف ہے۔ اِسی مضمون کو فارسی میں بھی

ادا کیا ہے، وہ یہ ہے ؎

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما — ما بدیں مرتبہ راضی غالب

غزل

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

فرماتے ہیں۔ دوست میری غمخواری میں کیا کوشش و سعی کریں گے (لفظ کیا) سے سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میں مرزا صاحب نے لطف یہ رکھا ہے کہ ان کی کوشش کو سمجھ کر ان سے سوال کیا ہے اور پھر اس سمجھے ہوئے معاملہ کو دوسرے مصرعہ میں خود ہی ظاہر کر دیا ہے۔ یعنی "زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا"۔ اس مطلب کو اس خوبی کے ساتھ بیان کرنا کہ دوست غمخواری میں اس سے زیادہ کیا کوشش کریں گے کہ میرے ناخن کاٹ ڈالیں گے۔ میں زخم کو دیوانگی کی حالت میں جو ناخن سے کرید تا رہتا ہوں اور اچھا نہیں ہونے دیتا۔ ناخن کٹ جانے کے بعد زخم کے جلد اچھا ہو جانے کی اُمید کی جاتی ہے۔ میں اپنے دوستوں کے مقابلہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب تک زخم مندمل ہو گا میرے کٹے ہوئے ناخن بھی بڑھ جائیں گے اور انکی ساری کوشش دم بھر میں بیکار ہو جائے گی۔ اِس لئے کہ میں زخم کو پھر گہرا کر لوں گا۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک — ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

معشوق سے خطاب کر کے فرماتے ہیں۔ بندہ پرور آپ کی بے نیازی حد سے گزر گئی۔ کب تلک یہی حالت رہے گی کہ ہم اپنا حالِ دل عرض کریں گے اور آپ بے پروائی سے "کیا فرمادیں گے۔ یعنی کیا کہا ہم نے نہیں سُنا۔ دوسرا پہلو لفظ "کیا" سے طنز کا نکلتا ہے یعنی جو کچھ تو نے کہا وہ جھوٹ کہا۔ اس شعر میں "کیا" کا ایک پہلو استفساریہ ہے اور دوسرا پہلو طنزیہ۔

حضرتِ ناصح جو آئیں دیدۂ دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا

اِس شعر سے جو مرزا صاحب کی شوخیٔ طبع جواں کا خاص اقتضائے طبیعت ہے ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی ایک مصرعہ میں حضرتِ ناصح کی یہ وقعت و عزت ظاہر کی جاتی ہے کہ ان کی تشریف آوری کے

وقت دیدہ و دل فرشِ راہ ہیں اور دوسرے مصرعہ میں ان کی فہمائش کو اس حقارت سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مجھے کیا سمجھا سکتے ہیں۔ اُن کی ہستی کیا ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

یعنی قتل کرنے میں سب سے بڑا عذر یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاس اس وقت تلوار نہیں ہے اس عذر کو میں نے پہلے ہی سے مٹا دیا ہے کہ میں خود تلوار باندھ کر جاتا ہوں اور کفن بھی ساتھ باندھ لیا ہے۔ کفن ساتھ باندھ لینے سے شعر میں یہ لطف پیدا ہو گیا کہ مجھ سے بڑھ کر اور کون سرفروش ہو سکتا ہے کہ میں کفن باندھ کر آیا ہوں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی! یہ جنونِ عشق کے انداز چھُٹ جائیں گے کیا

خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ ناصح کو قید کرنے والا بتایا ہے۔ حالانکہ ناصح کسی کو قید نہیں کرتا۔ ترکِ عشق کی نصیحت کیا کرتا ہے۔ بار بار سمجھانے اور مجبور کر کے اپنے پاس بٹھانے کو مزاحاً قید کر لینے سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ جنونِ عشق کے انداز چھُٹ نہیں سکتے۔ ہم ناصح کے سامنے بھی اپنے خیالات میں مستغرق رہتے ہیں۔

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

شعر دو لخت ہے۔ دونوں مصرعے برابر کے واقع ہوئے ہیں۔ مطلب صاف ہے۔ زنجیر سے اس لئے نہیں بھاگ سکتے کہ خانہ زادِ زلف ہیں اور زنداں سے یوں نہیں گھبرا سکتے کہ گرفتارِ وفا ہیں پہلے ہی سے زنجیرِ زلف اور طوقِ وفا دست و گردن میں آویزاں ہے۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ ہم نے مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

فرماتے ہیں۔ ہماری غذا تو غمِ الفت ہے۔ اور غمِ الفت اُسی وقت نصیب ہوتا ہے جب انسان کسی پر عاشق ہو جائے۔ دلّی میں غمِ اُلفت کا قحط ہے۔ یعنی یہاں اب ایسے معشوق نہیں ہیں جن سے اُلفت کی جائے۔

غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا   اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

مرنے پر اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہماری قسمت میں وصالِ یار لکھا ہی نہیں ہے۔ اور اگر اور بھی زندہ رہتے تو بھی یہی انتظار ہوتا جو اب تک رہا۔ انتظار اس لئے رہا کہ دلِ عاشق کبھی وصلِ معشوق سے نا اُمید ہوتا ہی نہیں۔

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا   کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ تو جو ہم کو یہ الزام دیتا ہے کہ وعدۂ وصل سُن کر تجھ کو مرجانا چاہیئے تھا۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر ہمارا زندہ رہنا اس وجہ سے ہوا کہ ہم نے تیرے وعدہ کو غلط سمجھا۔ اگر ہمیں اعتبار ہوتا تو ضرور شادیِ مرگ ہو جاتے۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا   کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

فرماتے ہیں۔ تیری نزاکت مانع عہد شکنی ہے۔ اس نزاکت پر جو تو نے عہد توڑا تو ہم کو معلوم ہو گیا کہ عہد بودا بندھا تھا۔ اگر مضبوط بندھا تو تجھ سے نہ ٹوٹ سکتا۔ کس خوبی سے معشوق کو الزام عہد شکنی سے بری کیا ہے اور اپنے دل کو تسلی دی ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو   یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تیرِ نیم کش وہ تیر جس کے چھوڑتے وقت کمان پوری نہ کھینچی گئی ہو معشوق تیر جگر میں اُلجھا ہوا دیکھ کر شرماتا اور خجل ہوتا ہے اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ کیوں میرا تیر اس کے جگر سے پار نہ ہوا۔ مرزا صاحب اُس کی شرمندگی کو ان لفظوں سے مٹاتے ہیں کہ "تیرے تیرِ نیم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے" قاعدہ ہے تیر کے زخم میں رہ جانے سے بہ نسبت اُس کے پار ہو جانے کے زخمی کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور معشوق اِسی واسطے تیر یا تلوار کا وار کرتا ہے کہ عاشق کو زیادہ ایذا پہنچے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

دوستوں کی شکایت میں فرماتے ہیں۔ یہ کیسی دوستی ہے کہ ہر دوست ناصح بن کر ترکِ عشق کی فہمائش کرتا ہے۔ اگر دوستی کا دعویٰ تھا تو میرے دردِ عشق کا علاج کیا ہوتا اور رفعِ غم کی

تدبیر سوچی ہوتی۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

فرماتے ہیں۔ تم جس کو غم سمجھتے ہو یہ اگر شرار ہوتا تو پتھر کی رگوں سے بھی اس طرح لہو جاری ہو جاتا کہ پھر کبھی نہ تھم سکتا۔ مگر وہ شرر نہیں بلکہ شرر سے زیادہ جلانے والی شے ہے اس کو انسان ہی برداشت کر سکتا ہے۔ پتھر میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اس تکلیف کو سہہ سکتا۔

غم اگرچہ جانگسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

اول مصرعہ کا دوسرا حصہ " یہ کہاں بچیں کہ دل ہے " یہ ثابت کر رہا ہے کہ دل موردِ آفات اور مخزنِ رنج و آلام پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی دل کے لئے غم کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اگر غمِ عشق نہ ہوتا تو غمِ روزگار ہوتا۔ غمِ عشق میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ جانگسل بھی ثابت ہوا۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

فرماتے ہیں شبِ غم کی کیا حقیقت بیان کروں۔ وہ موت سے زیادہ تکلیف دینے والی بلا ہے۔ مرنا جس کو زمانے میں کوئی انسان پسند نہیں کرتا ساری دنیا جس سے گھبراتی اور ڈرتی ہے، اس تکلیف شبِ غم کے مقابلہ میں میرے لئے وہ بھی اچھا تھا۔ شبِ غم میں تو ہزاروں بار مجھے مرنا پڑتا ہے۔ موت کی ایذا اٹھاتا ہوں اور پھر نہیں مرتا۔ شبِ غم کو موت پر کس خوبی سے ترجیح دی ہے۔

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

فرماتے ہیں۔ ہم مرنے کے بعد متہم بہ وجوہ ہی رہے۔ اگر ہم غرقِ دریا ہو جاتے تو نہ ہمارا جنازہ اٹھتا نہ مزار کا نشان باقی رہتا۔

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

معشوقِ حقیقی کی یکتائی کا ثبوت مرزا صاحب نے اُس کے دوچار نہ ہونے سے دیا ہے یعنی اگر یکتا نہ ہوتا اور دوئی کی ذرا سی بھی جھلک ہوتی تو ضرور کہیں نہ کہیں نظر آ جاتا۔

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ دونوں باتیں مرزا صاحب کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ایک اسلوب بیان دوسرے تصوّف کا رنگ۔ حضرت استادی مولانا حالی مرحوم نے یادگارِ غالب میں اس مقطع پر یہ لطیفہ تحریر فرمایا ہے کہ جس وقت یہ غزل بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سُن کر کہا بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔

غزل

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یہاں نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ کام کرنے کی اُمنگ جو دلوں میں پیدا ہو گئی ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ دنیا میں رہنے کا زمانہ تھوڑا ہے۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو جینے کا کچھ مزا نہ تھا۔ زمانہ کی چہل پہل کا محرک یہی خیال ہے کہ موت سر پر کھڑی ہوئی ہے جو کچھ کرنا ہے جلد انجام دے لو۔ قاعدہ ہے جس قدر فرصت زیادہ ہوتی ہے آدمی اُتنا ہی تساہل سے کام انجام دیتا ہے۔ بے مثل مطلع لکھا ہے۔

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا　　کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

فرماتے ہیں۔ جب دیکھو تم تجاہل کو کام میں لاتے ہو۔ آخر تمہارا دلی منشا کیا ہے۔ یعنی ہر بات پر تم "کیا" کہہ دیتے ہو۔ کوئی بات سُنتے اور سمجھتے ہی نہیں ہو۔

نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں　　شکایت ہائے رنگیں کا گِلا کیا

یعنی رقیب پر تمہاری رعایتیں بے محل دیکھتا ہوں۔ اور جب محبت بھرے الفاظ میں تم سے اس کا گِلا کرتا ہوں تو تم مجھ سے اُلٹی شکایت کرنے لگتے ہو۔ یہ کیا بات ہے کچھ بتاؤ تو سہی۔

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں　　تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

نگاہِ بے محابا۔ بے تکلف اور بے حجاب ہو کر دیکھنا۔ فرماتے ہیں مجھ سے آنکھیں چار کرو

میں تمہاری نگاہ کی تاب نہ لاکر تڑپ جاؤں گا۔ تم تغافل سے میرے صبر و استقلال کو کیوں آزماتے ہو چشم پوشی سے گھبرانے اور بے قرار ہونے والا نہیں ہوں۔

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

فرماتے ہیں، رقیب کی جھوٹی محبت کی مثال ایسی ہے کہ جیسے شعلۂ خس دم بھر میں روشنی دے کر بجھ جاتا ہے۔ رقیب کو ناموس وفا کا پاس خاک بھی نہیں ہے۔ اس کی محبت چار دن کی چاندنی ہے۔ ہمیشہ قایم نہیں رہے گی۔ عشق ناقص کو شعلۂ خس سے تشبیہ دینی ایک ایسا ہی اچھوتا خیال ہے جیسا مرزا صاحب کا اکثر کلام۔

نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے تغافل ہائے ساقی کا گِلا کیا

فرماتے ہیں، ہم تو مست الست ہیں۔ ہمارا ہر سانس ایک موج بیخودی ہے۔ ہمیں نہ ساقی کی ضرورت نہ شراب کی احتیاج۔ ہم کیوں تغافل ساقی کا گلا کریں۔ دوسرے معنی اس شعر میں یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ہم اپنے حال میں مست ہیں ہمیں دنیا کے ہست و نیست کا کیا غم۔

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

فرماتے ہیں۔ ہم تو بوئے یار کے سونگھنے والے ہیں۔ ہمارا دماغ عطر پیراہن یار کی خوشبو جس پر غیروں نے عطر ملا ہے پسند نہیں کرتا۔ صبا اگر رقیب کے کوچے سے عطر پیراہن کی خوشبو لے کر آئی ہے تو ہم اس کو کیا کریں۔ آوارگی کا لفظ بتا رہا ہے کہ صبا کوچۂ رقیب سے بن کر آئی ہے۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

فرماتے ہیں۔ قطرہ جو ایک جزو ضعیف دریا کا ہے۔ جب اس کے دل سے یہ آواز نکلتی ہے کہ میں دریا ہوں اور وہ دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے تو ہمارا کیا پوچھنا ہے۔ ہم تو اپنے مبدء کے ساتھ عینیت کا دعوٰی رکھتے ہیں۔ یعنی ہم تو قطرہ کے مقابلہ میں ایک انسان کا جسم ہیں۔ ہمارا سراپا تو اُس کی ذات کا ایک بڑا حصہ ہے۔

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

فرماتے ہیں۔ شہیدانِ نگاہ کا خون بہا لیا جانا دستور کے خلاف ہے۔ پھر تو کیوں ڈرتا ہے۔ بے خوف ہو کر میری طرف دیکھ اگر میں مر جاؤں گا تو اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ تجھ سے میرے قتل کی باز پرس نہ ہوگی۔ جس خوبی اور ندرت کے ساتھ مرزا صاحب نے اِس مضمون کو ادا کیا ہے وہ ظاہر ہے۔

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن ۔۔۔ شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

فرماتے ہیں۔ جنسِ وفا جو میرے دل میں تھی وہ گویا قیمتِ دل تھی۔ یعنی میرا دل اسی وجہ سے قیمتی سمجھا جاتا تھا کہ اُس میں جنسِ وفا تھی تو نے دل کو توڑ کر اس کو غارت کر دیا تو اب تو میری سُن اور مکرر کہتا ہوں کہ میری بات سُن۔ شکستِ دل کی صدا نالہ ہوا کرتا ہے جس سے تو ڈرتا ہے اور سُننا نہیں چاہتا۔ تو خوف نہ کر تو نے دل نہیں توڑا بلکہ قیمتِ دل توڑی ہے قیمتِ دل کی شکستگی میں کوئی صدا پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں تجھے ڈرنا نہ چاہیئے۔

کیا کِس نے جگرداری کا دعویٰ ۔۔۔ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

فرماتے ہیں۔ تو جو ستم یا تغافل یا تکلیفِ فراق سے مجھے تڑپانا اور بے چین کرنا چاہتا ہے میں نے کب تجھ سے جگرداری یعنی بہادری اور مضبوطی کا دعویٰ کیا ہے۔ بھلا دلِ عاشق کا صبر ہی کیا ایک ذرا سے ناز و انداز میں تو اُس کو بے صبر بنا سکتا ہے۔

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ۔۔۔ یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا

قاتل وعدۂ صبر آزما کی صفت ہے۔ اور کافر فتنۂ طاقت رُبا کی۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ سے وعدۂ صبر آزما کیوں کیا جاتا ہے اور اسی پہلے مصرعہ کا مضمون دوسرے مصرعہ میں دوسرے لفظوں کے ساتھ اُلٹ دیا جاتا ہے۔ بندشِ الفاظ قابلِ داد ہے۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اسکی ہر بات ۔۔۔ عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

اس مقطع میں مرزا صاحب نے کیا کو حرفِ علت قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے، اے غالبؔ اس کی ہر ایک بات جانستاں ہے۔ خواہ عبارت ہو۔ خواہ اشارت واداہو، جان لینے میں یہ سب کی

سب مساوات کا درجہ رکھتی ہیں۔

غزل

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا — پھر غلط کیا ہے کہ ہمسا کوئی پیدا نہ ہوا

درخور۔ فارسی محاورہ ہے۔ بمعنی لائق و سزاوار استعمال ہوتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آپ غیر پر تو ظلم و ستم کرتے ہی نہیں۔ قہر و غضب کے لئے ہم ہی مخصوص ہو گئے ہیں۔ پھر اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم سا کوئی دوسرا آپ کا چاہنے والا پیدا نہیں ہوا تو اس میں جھوٹ کیا ہے۔ آپ ہمارے قول کو کیوں نہیں تسلیم کر لیتے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

خودبیں و خودپسند یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ یعنی دوسرے کو اپنے سے کم سمجھنا۔ مگر یہاں مرزا صاحب نے خودبیں کے معنی خودداری کے لئے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عبادتِ الٰہی میں بھی اپنے کو ایسا لئے دیئے رکھتے ہیں کہ اگر ہم کو درِ کعبہ کھُلتا ہوا نہیں ملتا تو کنڈی کھٹکھٹا کر دروازہ کھلوانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اس لئے واپس چلے آتے ہیں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ مرزا صاحب زندگی میں خودداری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا — روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

یعنی تیرا مد مقابل کوئی نہ بن سکا۔ دعویٰ متضمنِ دلیل واقع ہوا ہے۔

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں — تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

چشمِ معشوق کو نرگس بیمار اور چشمِ بیمار کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں بھی تیرے عشق کا بیمار ہوں اس لئے مجھے بھی ہمنامی کا فخر حاصل ہو گیا ہے۔ اگر میں اچھا نہ ہوا تو اس میں بُرائی کی کیا بات ہے۔ تیری آنکھ کا ہمنام مشہور ہو جاؤں گا۔

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا — خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ وہ نالہ جو بے اثری اور نارسائی کی وجہ سے لب تک نہیں آیا ہے۔ میرے سینہ کا داغ

بن کر رہ گیا ہے یعنی اُس نے میرے جوشِ عشق کو دھبہ لگا دیا، اسکی تمثیل پیش کرتے ہیں کہ جس قطرہ میں دریا بننے کی قابلیت نہیں ہوتی وہ خاک میں جذب ہو کر رہ جایا کرتا ہے۔

نام کا میرے ہے جو دُکھ کہ کسی کو نہ ملا　　کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ وہ ایذائے محبت جو کسی کو نہ ملی میرے لئے مخصوص کر دی گئی ہے اور وہ فتنۂ قیامت جو کبھی برپا نہ ہوا میرے کام میں مصروف ہے یعنی میرے واسطے تکلیفیں اور مصیبتیں جمع کر رہا ہے۔

ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب　　حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

فرماتے ہیں جس طرح داستان گو امیر حمزہ کی داستان بیان کرتا ہے اور سننے والے خوشی کے ساتھ سُنتے رہتے ہیں عشق کا ذکر ایسا بے اثر نہیں ہے اس کے بیان کرنے والے کے رونگٹے رونگٹے سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ نہ ٹپکے خونناب میں استفہام اقراری ہے یعنی ضرور خونناب ٹپکے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دیدۂ بینا یعنی نگاہِ عارف کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کُل نظر نہ آجائے۔ اس کے مصرعۂ اولیٰ میں بھی استفہام اقراری ہے۔ جس خوبی کے ساتھ یہ بلیغ مضمون مرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔ حدِ توصیف سے باہر ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے　　دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

مرزا صاحب اپنی عادت کے موافق اس مقطع میں بھی شوخی برت گئے۔ ایک معمولی مضمون کو نرالے پہلو نئے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ معشوق نے غالب کا امتحانِ عشق لینے کے لئے ایک دن مقرر کیا تھا۔ اُس کو یوں بیان فرمایا ہے کہ شہر میں یہ خبر مشہور تھی کہ آج میرزا غالب کے پُرزے اُڑیں گے۔ عالم تماشائی سیر دیکھنے معشوق کے کوچے میں جمع ہو گئے مگر یہ تماشا ملتوی رہا اور امتحانِ عشق دو وفا میں بغیر امتحان دیئے کامیابی حاصل ہو گئی۔

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں　　کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ ہم جنون اور وحشت میں دور دور کے دکھاوے کرنے والے گدائے بے سروپا ہیں کہ مجنوں پر بھی سبقت لے گئے ہیں (بیان کیا جاتا ہے. مجنوں کے پاس ہرن آ جایا کرتے تھے اور مجنون اُن کی آنکھوں سے لیلیٰ کی آنکھوں کو تشبیہ دیا کرتا تھا) مرزا صاحب اپنے جنون کی حالت کو مجنون سے کامل تر ظاہر کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ سرپنجۂ مژگانِ آہو میر الپشتِ خار ہے۔ یعنی وحشت کے عالم میں آہو جیسے وحشی جانور کو بھی پسِ پشت چھوڑ جاتا ہوں وہ بھی مجھ پر سبقت حاصل نہیں کر سکتا۔

غزل

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوئ پارسائی کا

فرماتے ہیں۔ میں اپنے گناہوں کے سبب سے بارگاہ الٰہی میں تقرب حاصل نہ کر سکا اور باوجود میرے گناہوں کے اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کے لطف و کرم مجھ پر فرمائے۔ اب میں ان عنایتوں کے بدلے میں شرمِ نارسائی کا تحفہ پیش کرتا ہوں۔ یعنی باوجود اپنے گناہوں کے بھی جو گناہوں کی حسرتیں میرے دل میں خون ہو گئی ہیں۔ اور صدہا قسم کی ہیں۔ ان ہی کے ساتھ میں پارسائی کا دعویٰ بھی پیش کرتا ہوں۔

نہ ہو حُسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے دعوئ پارسائی کا

حُسنِ تماشا دوست سے یہ مطلب ہے کہ جس حُسن کے جلوے ذرّے ذرّے اور پتے پتے میں نظر آتے ہیں اور دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا دوست ہر جگہ۔ ہر رنگ۔ ہر شے میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے اور پھر کہیں موجود نہیں۔ کسی جگہ قیام نہیں کرتا۔ بااین ہمہ اُس پر بیوفائی کا الزام بھی عاید نہیں ہو سکتا۔ دیکھنے والوں کی سینکڑوں نگاہیں اِس مضمون پر مُہریں کرتی ہیں اور کر چکی ہیں کہ ہم اُس کے پردے تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکیں۔ یعنی یہاں تک پارسائی ہے کہ پردے کے قریب تک کسی نظر کو رسائی حاصل نہیں ہے۔ پھر دعویٰ پارسائی کی صداقت میں کِس کو کلام ہو سکتا ہے۔

زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا چراغِ خانۂ درویش ہو کاسا گدائی کا

معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ زکوٰۃِ حسن دے یعنی حسن کا چالیسواں حصہ بھی سال بھر میں اگر مجھ کو مل جایا کرے تو آفتاب کی طرح کاسۂ گدائی روشن ہو کر چراغِ خانۂ درویش بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل کو اپنے عرفان سے آفتاب کیطرح روشن اور منور کر دے۔

نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر رہا مانند خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

فرماتے ہیں۔ تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لئے قتل نہیں کیا کہ خونِ بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے۔ مگر صورت میں تیری گردن پر بجائے خونِ بے گناہ حق آشنائی رہ گیا۔ (از یادگارِ غالب)

تمنائے زبان محوِ سپاس بے زبانی ہے مٹا جس سے تقاضہ شکوۂ بے دست و پائی کا

فرماتے ہیں میری تمنا یہ تھی کہ میں تجھ سے ایسی زبان مانگوں جس سے تیری درگاہ میں اپنا عرضِ حال کر سکوں مگر اس درخواست یا دعا سے پہلے میری زبان محوِ سپاس بے زبانی ہو گئی۔ یعنی مجھ کو وہ خاص زبان نہ ملنے سے یہ فائدہ پہنچا کہ میں تیری بارگاہ میں بے دست و پائی یعنی بے سر و سامانی کا گلا پیش ہی نہ کر سکا اور اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھ کو بجائے زبانِ شکایت کے درجۂ تسلیم و رضا عطا ہو گیا۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

فرماتے ہیں۔ میرے نفس اور نکہتِ گل میں کچھ فرق نہیں ہے وہی اک بات ہے یعنی ان دونوں کو مساوات کا درجہ حاصل ہے اور اس کا باعث جلوۂ چمن۔ فصلِ بہار اور جوشِ گل ہے۔ چمن میں جوشِ گل سے نکہتِ گل پیدا ہوتی ہے اور میں چمن کی بہار دیکھ کر رنگیں نوائی کے ساتھ غزل سرائی شروع کر دیتا ہوں۔

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

معشوق سے فرماتے ہیں۔ اے بے وفا اب تو تیری بے وفائی کا چرچا عدم تک پہنچ گیا ہے۔ اب تو بے وفائی چھوڑ دے اور اس کا ثبوت یہ دیتے ہیں کہ زمانہ بھر کے معشوق تجھ کو طعنے دیتے ہیں۔ پیغارہ کے معنی طعنے اور تشنے کے ہیں اور معشوق کی صفت بے دہانی ہوتی ہے اسلئے دہن کو عدم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے کو تیری بے وفائی کا چرچا ایک معشوق سے لیکر دوسرے معشوق تک اور دوسرے سے لے کر ہزارہا معشوق تک پہنچا ہے۔ زنجیر رسوائی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عدم میں پہنچ کر انسان کی ساری عادتیں بدل جاتی ہیں مگر تیری بیوفائی کی عادت عدم تک پہنچ کر بھی نہ بدلی۔

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ تو جو طرح طرح کی شکایتیں اور قسم قسم کے گِلے لکھ کر خط کو طول دے رہا ہے اِس سے کیا فائدہ۔ مختصر سا فقرہ لکھدے کہ ستمہائے جُدائی اور آزارِ فراق بیان کرنے کی حسرت دل میں رکھتا ہوں۔ آپ خود تشریف لا کر یا مجھ کو بُلا کر میری مصیبت کے واقعات میری زبان سے سُن لیجئے۔

غزل

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا بے تکلّف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ اگر شبِ فرقت کا رنج و غم بیان نہ کیا جائے گا اور تم دل لگا کر اُس کو نہ سُن لوگے تو بڑی قباحت پیدا ہو جائے گی کہ چاند میں جو داغ ہے وہ میرا مُہرِ دہاں ہو جائے گا یعنی جس طرح چاند کے داغ کو سارا زمانہ دیکھتا ہے اِسی طرح تمہاری جُدائی کی تکلیفوں کا حال لوگوں پر کھل جائے گا گویا میری خموشی نہاں بن کر افشائے رازِ محبت کر دے گی اور پھر تم بدنام ہو جاؤ گے۔ اِس سے بہتر یہ ہے کہ میری مصیبت کا حال تم سُن لو تا کہ میرا دل غم کے بوجھ سے ہلکا ہو جائے دل کی بھڑاس نکل جائے گی تو راز چھپا رہے گا۔

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ اگر یہی قاعدہ قرار پا گیا ہے کہ شامِ ہجر کی سختیاں پتوں کو پانی کر دیتی ہیں اور خون کے آنسوؤں سے رُلوا دیتی ہیں تو عجب نہیں کہ چاندنی سیلِ آب بن کر میرے گھر کے در و دیوار کو بہا لے جائے۔

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر　　ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

جوشِ عشق اور رعبِ حسن کی تصویر ایسے صاف اور سادے لفظوں میں کھینچی ہے کہ قابلِ ستائش ہے۔ مرزا صاحب لب و رخسار کے بوسہ کا شوق بوجہ ادبِ عشق ظاہر نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ پاؤں کا بوسہ تقاضائے دل سے مجبور ہو کر سونے کی حالت میں لے تو لوں مگر خوف اِس بات کا ہے کہ مجھ سے بدگمان ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ میری پاک محبت کا یقین اُس کے دل سے مٹ جائے گا اور مجھ کو بوالہوس خیال کرے گا۔

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا　　یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ ہم تو سمجھے ہوئے تھے کہ دل کو وفاداریوں کے کام میں صرف کریں گے اور زندگی بھر وفاداری میں ہمارا ساتھ دیگا۔ اس کی خبر نہ تھی کہ یہ پہلے ہی معشوق کے امتحان کی نذر ہو جائیگا۔ اور ایک ہی نگاہ میں ایسا کارکُن کارگزار اور مددگار کام آجائے گا۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا　　مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

عجیب بلیغ شعر کہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ایک عالم کے دل میں تیری جگہ ہے۔ ساری دنیا تجھ سے محبت کرتی ہے۔ ہر کس و ناکس تجھ پر فریفتہ ہے۔ اگر تو ہم سے راضی ہو گیا تو سارا زمانہ ہم پر مہربان ہو جائے گا۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط　　شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ تیری نگاہ قہر و غضب رسوائی اور بدنامی کے خوف سے اگر اسی طرح ضبط نالۂ آہ کی تعلیم دیتی رہی تو کیا عجب ہے کہ شعلۂ آتش گھاس کے تنکوں میں اسی طرح چھپ جائے جس طرح خون رگوں میں پوشیدہ ہے۔

باغ میں مجھکو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر ہر گلِ تر ایک چشمِ خونفشاں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ عشق کے غم و رنج سے میری حالت ایسی زار و نزار ہو گئی ہے کہ جو مجھے دیکھتا ہے اُسکی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اگر تو مجھ کو اپنے ساتھ باغ میں لے جائے گا تو گلاب کے تر و تازہ پھول چشم خونفشاں بن کر میرے حال پر خون کے آنسو بہائیں گے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سیر باغ میں بجائے طرب و انبساط تجھ کو بے لطفی حاصل ہوگی۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ میں تیرے ظلم بیجا صرف اس توقع پر اُٹھا رہا ہوں کہ حشر کے دن میرا تیرا انصاف خدا کے سامنے ہو جائے گا اور مجھے میری مظلومی کی داد مل جائے گی۔ اگر خدانخواستہ حشر میں بھی انصاف نہ ہوا تو پھر مجھ پر قیامت گزر جائے گی۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسدؔ دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

مثل مشہور ہے۔ نادان کی دوستی جی کا زیاں۔ فرماتے ہیں اے اسدؔ اس دوستی میں کیا فائدہ ہے۔ آخر تو عقلمند ہے اس بات کو اپنے دل میں سوچ کہ نادان کی دوستی میں جان کا ضرر ہوا کرتا ہے۔ لطف اس شعر میں یہ پیدا کیا گیا ہے کہ دل کو فریب دے کر عشق سے باز رکھنا چاہتے ہیں اور یہ بات عاشق کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ جان کے خوف سے عشق کو ترک کر دے۔

غزل

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

فرماتے ہیں میرا دردِ عشق دوا سے مٹ نہ سکا اور میں اچھا نہ ہو سکا، میرے لئے یہ کچھ بڑی بات نہیں ہوئی۔ اگر میں اچھا ہو جاتا تو میرے دردِ عشق کو دوا کا منت پذیر ہونا پڑتا اور مجھ کو کسی کا احسان اُٹھانا منظور نہ تھا اس لئے اچھا ہی ہوا کہ میں اچھا نہ ہوا۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اِک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ فیصلہ کے وقت رقیبوں کو کیوں جمع کرتے ہو۔ جھگڑا ہمارا تمہارا ہے وہ بھی

صرف گِلا اور شکایت کرنے کا اس کو تماشہ بنانے سے کیا فائدہ۔ یہ بات ہم کو کسی طرح گوارہ نہیں کہ ہماری شکایت تمہارے منہ سے ہمارے رقیب سنیں اور تمہاری ہاں میں ہاں ملائیں

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ۔۔۔۔ تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ ہمارے لئے اور ایسی کونسی جگہ ہے جہاں جاکر آرزوئے قتل پوری کریں جب تو ہی خنجر کا امتحان لینے سے ہچکچاتا ہے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ۔۔۔۔ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

شیریں دہنی معشوق کی تعریف پر دعویٰ کس قدر متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تیرے ہونٹ ایسے شیریں ہیں کہ رقیب جیسا بوالہوس بھی گالیاں کھا کر پی گیا اور بدمزا نہ ہوا حالانکہ چاشنیٔ عشق سے محروم تھا مگر تلخیٔ دشنام اس کو بھی گوارا ہو گئی۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ۔۔۔۔ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

شوق مہماں نوازی کا یہ جوش کہ خبر آمدِ معشوق سن کر بے اختیار آنکھیں بچھا دینے کو جی چاہتا تھا اور بے سروسامانی کی یہ کیفیت کہ آج گھر میں بوریا بھی نہیں رہا۔ کل تک تو تھا بھی اب ان کی تشریف آوری کے خیال سے مرزا صاحب دل ہی دل میں شرمائے جاتے ہیں کہ ہائے وہ آئیں گے تو میری بے سروسامانی کو دیکھ کر دل میں کیا خیال کریں گے۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ۔۔۔۔ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مرزا صاحب نے اس شعر میں عجب شوخی برتی ہے جو کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ شعر اور اس کے بعد کا شعر دونوں بیت الغزل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔ (از یادگار غالب)

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی ۔۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ ہم نے زندگی بھر یہ ایک ہی کام کیا ہے کہ جان دیدی لیکن پھر سوچکر سمجھے کہ وہ جان تو اُسی کی دی ہوئی تھی۔ اُس کی امانت اُس کو واپس کردی۔ اس میں کون سی فخر کی بات ہے۔ حق تو یہ ہے یعنی سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا حق ہم سے کچھ بھی ادا نہ ہو سکا اِس خیال۔ اِن الفاظ۔ اِس بندش کا کیا کہنا ہے۔

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما　　　کام گر رُک گیا روا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ زخم اگر دب بھی گیا یعنی اس کی کشادگی باندھ دینے سے مٹ بھی گئی اور لبِ زخم باہم پیوستہ ہو بھی گئے تو بھی خون بند نہ ہوا، مگر اس کے خلاف کام رُک گیا تو وہ روا نہ ہوا۔ قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ جس طرح زخم دب جانے سے لہو جاری رہا، اسی طرح کام رُک جانے پر بھی روا ہوتا۔ اپنی بدنصیبی کا اظہار کس سادگی سے کیا ہے۔ کتنے بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے　　　لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

فرماتے ہیں۔ ہم تو سڑک سڑک چلے جاتے تھے معشوق نے ہم سے دل چھین لیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دل لیتے ہی غائب گیا۔ دلستانی کا قاعدہ یہ ہے کہ ٹھہر کر دم لے کر ہم کو اپنا نام و نشان گھر کا پتہ ملنے کا وقت بتاتا۔ اُس نے تو یہ کچھ بھی نہ کیا۔ دل لیتے ہی چوروں کی طرح بھاگ نکلا۔ اب ہمیں کون بتائے کہ رہزنی تھی یا دلستانی۔ اِس شعر میں معمولہ قافیہ نے اور بھی لطف پیدا کر دیا۔

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں　　　آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

سُنا گیا ہے کہ یہ مشاعرہ قلعہ میں کسی شہزادہ کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے طرح میں غزل نہ لکھی تھی۔ جب اصرار مبالغہ کی حد تک پہنچ گیا تو غیر طرح غزل پڑھ دی۔ مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا۔

غزل ۱۰

گِلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا　　گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

مرزا صاحب تعجب کے لہجہ میں فرماتے ہیں۔ شوق کو تنگیِ جا کا گِلہ دل میں بھی ہے "بھی" کا لفظ بتا رہا ہے کہ دل ایسی وسیع چیز ہے کہ دونوں عالم اس میں سما جاتے ہیں اور پھر خالی رہتا ہے باوجود اِس وسعت کے شوق کو جگہ کی تنگی کا گِلہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق کی وسعت بھی دل کی وسعت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ (اب تنگیِ جا کا ثبوت ملاحظہ ہو) فرماتے ہیں۔ گہر میں دریا کی روانی محو ہو گئی یعنی کوزے میں دریا سما گیا۔ مگر پہنچ جانے کے سبب سے موجوں کی حرکت بند ہو گئی دل کو گوہر سے اور شوق کو دریا سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ اِس مطلع میں دریا کوزے کے اندر بند کر لیا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ چستی بندش۔ تناسب الفاظ۔ طریق بیان میں فرق نہیں آنے پایا۔ دونوں مصرعے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب　　مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

فرماتے ہیں۔ یہ تو میں جانتا ہوں اور اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ تو قیامت تک میرے کسی خط کا جواب نہیں لکھے گا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ ذوقِ خامہ فرسائی مجھ پر ظلم کرتا ہے اِس لئے بار بار تجھ کو خط بھیج رہا ہوں۔ باوجودیکہ اُمید جواب سے قطع نظر کر چکا ہوں۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی　　دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

فرماتے ہیں۔ بہار اگر ایسی ہی بے ثبات اور بے بنیاد ہے تو بہار ہی کیا ہے۔ یعنی موسمِ بہار خزاں کے پاؤں کا رنگ حنا ہے جو بہت جلد اُڑ جائے گا اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے عیش دنیا کے عیش کی مدت بہت ہی قلیل ہوتی ہے اور کلفتِ خاطر زندگی بھر قایم رہتی ہے مطلب شعر یہ ہے کہ دنیا میں عیش و آرام کا زمانہ کم ہے اور رنج و مصیبت کا دَور دورہ زیادہ۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو　　مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

قاعدہ ہے کہ رنج و مصیبت کے وقت عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ ناگوار ہوا کرتی ہے چنانچہ

انشاءاللہ خاں انشا کہتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ مجھے غمِ فراق کی حالت میں سیرِ باغ کے لئے کیوں گھسیٹتے لئے جاتے ہو۔ مجھ کو خندہ ہائے بیجا کا دماغ نہیں ہے۔ خندۂ گل کو خندۂ بیجا سے اِس لئے تعبیر کیا ہے کہ وہ کچھ سوچ سمجھ کر از راہِ تعجب یا تمسخر نہیں ہنستا۔ خندۂ بیجا رنج و غم کی حالت میں زیادہ تر ناگوارِ خاطر ہوا کرتا ہے۔ شعر کی عمدگی میں کلام نہیں۔

غزل

ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

فرماتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ میرا رونگٹا رونگٹا چشمِ بینا بن گیا ہے۔ ذرّے ذرّے میں اُس کی تجلیاں دیکھ رہا ہوں، پھر بھی مجھ کو محرمیِ حُسن کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا۔ یعنی کنہہ ذات اور معرفتِ الٰہی سے محروم ہوں۔

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

ناز و ادا کو طلبِ دل کا تقاضا کہنا نئی طرح کی جدّت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُدھر سے ابھی ناز و ادا کا بھی آغاز نہ ہوا تھا ہم نے پہلے ہی سے دل نذر کر دیا۔ دوسری لطافتِ خیال اِس شعر میں یہ ہے کہ محض حُسن جو سادگی کے عالم میں تھا ہم اُس پر عاشق ہو گئے۔ ناز و ادا جس کو زیورِ حُسن سمجھا جاتا ہے فریفتگی کے لئے اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے مری نگاہ میں ہے جمع خرچ دریا کا

مرزا صاحب معشوق سے شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو یہ نہ کہہ کہ تیرا گریہ تیری حسرتِ دل کے برابر ہے۔ نہیں ہرگز یہ بات نہیں ہے۔ میری نگاہ میں دریا کا جمع و خرچ ہے۔ یعنی جس قدر میں نے آنسو بہائے ہیں اس سے بہت زیادہ حسرتِ گریہ میرے دل میں موجود ہے حسرتِ دل کے مقابلہ میں ابھی کچھ بھی نہیں رویا ہوں۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسدؔ جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

یعنی فلک کو دیکھ کے خدا یاد آتا ہے اِس لئے کہ آسمان جو ظلم و ستم مجھ پر کرتا ہے وہ سب اُسی کے حکم سے ہوتے ہیں۔ بغیر حکم الٰہی کے آسمان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ شعر بہت صاف اور خیال بہت پاکیزہ ہے۔

غزل

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفَس پرور ہوا خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

خود مرزا صاحب اِس مطلع کی شرح اپنے ایک خط میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ "خیال تو دقیق نظم کیا گیا ہے لیکن لطف زیادہ نہیں" وہ فرماتے ہیں "قطرہ جو ٹپکنے میں بے اختیار ہے افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا اور برابر برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالے کا خط اس تاگے کی صورت بن گیا جس میں موتی پروئے گئے ہوں"

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

فرماتے ہیں معشوق کو میرے عشق کا یقین آگیا ہے اور اس قدر اس کا اعتبار جم گیا ہے کہ اگر غیر بھی بھولے چوکے سے کبھی آہ و فریاد کرتا ہے تو وہ یعنی معشوق خوف بدنامی اور رُسوائی سے مجھ پر خفا ہوتا ہے غیر کی طرف اس کا گمان بھی نہیں جاتا۔

غزل

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا تپشِ شوق نے ہر ذرّہ پہ اِک دل باندھا

فرماتے ہیں۔ سفر کے وقت جو یار نے اونٹ پر محمل کسا اور باندھا۔ ہماری تپشِ شوق نے ہر ذرّۂ خاک پر ایک دل باندھ دیا جو ختمِ سفر تک یار کے ساتھ ساتھ رہا۔ مطلب یہ ہے کہ دوست کو رخصت کرتے وقت ہمارا شوق یہ چاہتا تھا کہ ہم بھی اُس کے ہمراہ روانہ ہو جائیں۔ اور اُس بیقراری کی حالت میں خاک کے ذرّوں کو دیکھ کر جو سواری کے وقت زمین سے گرد و غبار بن کر بلند ہوتے تھے ہم سمجھتے تھے کہ ہر ذرّہ پر ایک دل بندھا ہوا ہے ورنہ خاک

کے ذرّے میں یہ تڑپ کہاں ہوتی ہے۔

اہلِ بینش نے بحیرت کدۂ شوخیِ ناز   جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

اہلِ بینش سے یہاں وہ اہلِ تماشہ مراد ہیں جو یار کے آئینہ دیکھتے وقت اِدھر اُدھر موجود ہیں اور حیرت کدہ وہ آئینہ ہے جس میں عکسِ یار شوخی و ناز کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔ یہاں آئینہ سے مراد فولادی آئینہ ہے جس میں جوہر ہوا کرتے ہیں۔ جوہرِ فولاد کا رنگ سبز ہوتا ہے اور رنگ کو ہمیشہ طوطی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اِس لئے فرماتے ہیں کہ پہلوؤں سے دیکھنے والوں کو ہر ایک رُخ سے جوہرِ آئینہ کی سبزی متحرک نظر آتی ہے اِس وجہ سے اُسے طوطیِ بسمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ نہایت لطیف اور بدیع ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جوہرِ آئینہ فولادی کی تیزی جو اطراف و جوانب سے متحرک نظر آ رہی ہے یہ طوطی بسمل ہے جس کو شوخیِ ناز کی چھری سے بسمل کر دیا گیا ہے۔

یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا   عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

عربدہ کے معنی بدخوئی اور جنگجوئی کے ہیں۔ یاس و اُمید نے ایک میدانِ جنگ مانگ لیا ہے آپس میں لڑائی ہو رہی ہے۔ کبھی یاس غالب آجاتی ہے کبھی اُمید۔ دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں۔ عجزِ ہمت نے ایک طلسم باندھا ہے یعنی طلسم بنایا ہے جس میں یاس و اُمید کی باہم لڑائی ہو رہی ہے۔ یاس چاہتی ہے میں فتح حاصل کر لوں۔ اُمید کی کوشش ہے میں شکست دیدوں۔ شعر کا مطلب یہ ہے جو شخص ہمت نہیں رکھتا وہ سائل بن کر اُمید و بیم میں مبتلا رہتا ہے یعنی سوال کرنے کے بعد جب تک کچھ ملے یا جواب صاف سے اُمید کا طلسم ٹوٹے یاس و اُمید میں باہم جھگڑا رہا کرتا ہے۔

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالبؔ   گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

فرماتے ہیں۔ ذوقِ سخن کی تشنگی کے مضامین جیسے باندھنے چاہتے تھے ہم سے اے غالبؔ نہ بندھ سکے باوجودیکہ دل کھول کے دریا کو بھی ہم نے ساحل باندھا۔ ساحل کو تمام شعراء

تشنہ لب لکھتے چلے آئے ہیں۔ اگرچہ آغوش میں دریا کو رکھتا ہے مگر پھر بھی خشک لب نظر آتا ہے۔ دل کھول کر کوئی کام کرنا کسی کام میں مبالغہ کر لینے کو کہتے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ ذوقِ سخن اس درجہ غالب تھا کہ باوجود بہت کچھ لکھنے کے طبیعت مضامین سے سیر نہ ہوئی۔

غزل

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں   گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

فرماتے ہیں۔ تعجب اور حسرت کی بات ہے مجھ جیسا بادہ خوار جس کو ساری دنیا شرابخوار جانتی بزمِ مے سے اِس طرح پیاسا چلا آئے۔ یہ مانا کہ میں نے توبہ کر لی تھی اور بپاس توبہ ساقی سے شراب نہ مانگی مگر ساقی کو کیا ہو گیا تھا کہ اُس نے بے طلب کے مجھ کو نہ دی اور زبردستی نہ پلادی۔ جن لفظوں میں مرزا صاحب نے اِس مضمون کو بیان کیا ہے کچھ اہلِ زبان ہی اس کا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں   وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

اِس مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور مطلع میں بھی باندھا ہے۔ وہاں یوں فرماتے ہیں ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی   دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

مرقومہ بالا شعر میں بھی تیر سے مراد تیرِ نظر ہے یعنی وہ زمانہ اب کہاں ہے کہ دل پہلو میں اپنے مقام پر رہتا تھا اور جگر سینے میں اپنی جگہ قیام پذیر تھا۔ اب تو عشق نے دونوں کو ایک ہی تیر میں چھید کر زمین پر ڈال دیا ہے۔

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں   جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

مطلب صرف اتنا ہے کہ جب مدافعتِ مصائب کی قدرت حاصل تھی اس وقت مصیبتیں نہ پڑیں جس وقت اُن کے دفعیہ کی طاقت باقی نہ رہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مضمون کو اس استعارہ میں بیان کیا ہے کہ "جب رشتہ بے گرہ تھا" یعنی کسی مشکل کا سامنا پیش نہ آیا تھا

تو "ناخن گرہ کشا تھا" یعنی اُس کے وظیفہ کی قدرت تھی۔ مشکل گرہ کا استعارہ ہے اور تدبیر ناخن کا استعارہ۔

غزل

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا　　بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

فرماتے ہیں۔ ہمارے گھر کی قسمت ہی میں ویران ہونا لکھا تھا لوگ ہم پر رونے کا الزام کیوں رکھتے ہیں۔ جو گھر کثرتِ گریہ سے دریا بن گیا ہے وہی گھر نہ رونے کی حالت میں جنگل بن جاتا غرض یہ ہے کہ بدنصیبی اپنا رنگ دکھائے بغیر کسی طرح نہیں رہتی۔

تنگیِ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے　　کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

اِس شعر میں بھی مسطورۂ بالا مطلع کا مضمون دوسری ترکیب اور دوسرے الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل کو موردِ رنج و بلا رہنا لازمی اور ناگزیر ہے۔ یعنی اگر دل تنگ نہ ہوتا۔ واشُدِ خاطر کی بدولت اِس قدر پریشانی بڑھ جاتی کہ پریشاں ہو جاتا۔

بعدِ یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے　　کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

فرماتے ہیں۔ عمر بھر عبادت کرنے کے بعد جنّت میں باریابی حاصل ہو جاتی رضواں ہمکو نہ روکتا دریار کا پاسبان اس قدر سخت گیر ہے کہ عمر بھر التجائیں کرنے کے بعد بھی خانۂ دوست میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ کاش دربان رضوان ہوتا جو بہشت کا دربان ہے۔ اُس سے یہ اُمید ہو سکتی تھی کہ وہ عمر بھر عبادت کرنے کے بعد نہ روکتا۔

غزل

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کس خوبی کے ساتھ نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں کہ جب دنیا پیدا نہ ہوئی تھی اُس وقت صرف خدا ہی خدا تھا۔ اگر اس عالمِ امکان کو پیدا نہ کیا جاتا تو بھی خدا ہی خدا ہوتا۔ پس میری ہستی نے ظاہر ہو کر مجھ کو ایک دوسرا جسم قرار دیا اور

دوسرے جسم نے قرار پاکر مجھ کو برباد کر دیا۔ اگر میں پیدا نہ ہوتا اور میرا وجود نہ ہوتا تو خیال کرنا چاہیئے کہ میں کیا ہوتا۔ یعنی خدا ہوتا اس واسطے کہ یہ پہلے ہی بتادیا گیا ہے کہ جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا۔ اور کچھ نہ ہوتا تو بھی خدا ہی خدا ہوتا۔

ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا　　نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اس شعر میں لفظ بےحس نے ثبوت دعویٰ کے ساتھ عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں جب ہمارا سر غم والم کی کثرت سے ایسا بےحس ہوگیا تھا کہ ہر وقت اُس کو زانو پر رکھنا پڑتا تھا تو ایسے سر کے کٹ جانے کا غم والم بے فائدہ ہے۔ یعنی کثرتِ غم نے سر کے کٹنے کو پہلے بیکار کر دیا تھا۔ بیکار شے کا ضائع ہونا کچھ افسوس کی بات نہیں۔

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے　　وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یہاں "کیا" کا لفظ تحقیر کے معنی پر استعمال ہوا ہے جس سے انتہا درجہ کی بےدلی اور ناامیدی ظاہر ہوتی ہے۔ گویا دنیا کی بےثباتی کا خیال کسی کام میں نظر کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ غالب کو مرے ہوئے ایک عرصۂ دراز گزر گیا ہے مگر اب تک ہم کو وہ اور اُس کی باتیں یاد آتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہر بات پر یہ کہا کرتا تھا کہ اگر خوش نصیبی سے ایسا بھی ہوتا تو کیا ہوتا۔ یعنی ع دنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ۔

غزل

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا　　یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

فرماتے ہیں۔ اب کے سال بہار باغ میں ایسے زور شور سے آئی ہے کہ ذرہ بھر زمین بھی بیکار نہیں رہی ہے۔ باغ کی روشیں جو کثرتِ بہار سے سبزہ زار ہوگئی ہیں۔ وہ گویا مرہم زنگار کی بتیاں بن گئی ہیں۔ داغ لالہ کے واسطے (مرہم زنگار ہمیشہ زخم کو کاٹتا اور صاف کرتا ہے) یعنی لالے کا داغ مٹا دینے کے واسطے مرہم زنگار ہی کا استعمال مناسب سمجھا گیا ہے۔

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی　　کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

فرماتے ہیں۔ بغیر شرابِ محبت الٰہی کے کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ آشوبِ آگہی کی برداشت کر سکے۔ ایاغ کے معنی پیالہ کے ہیں۔ اور یہاں پیالے سے مراد وہ گلاس ہے جس پر شراب ناپنے کے لئے خطوط کھینچے ہوئے ہوتے ہیں۔ انگریزی میں جس کو منم میجر یا اونس میجر کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عجزِ حوصلہ کی وجہ سے ہم نے پیمانۂ شراب پر نشانات بنا دیئے ہیں اور اسی سے شراب ناپ کر پیتے ہیں۔ اور مقدارِ شراب دن بدن بڑھاتے جاتے ہیں۔ آشوبِ آگہی کی طاقتِ برداشت بقدرِ خطوطِ جام رفتہ رفتہ پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یعنی ذکر و اشغال کی دن بدن مہارت و مشق زیادہ کرتے جاتے ہیں۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

فرماتے ہیں۔ دیوانے آدمی کی حرکات پر جس طرح عام آدمی ہنستے ہیں اسی طرح بلبل کے شوق نغمہ و فریفتگی پر پھول خندہ زن ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس کو عشق کہتے ہیں وہ درحقیقت ایک قسم کا خللِ دماغ ہے۔ انسان نے غلطی سے خللِ دماغ کا نام عشق رکھ لیا ہے۔ مصرعہ ثانی کی بے ساختگی قابل مدح و ستائش ہے۔

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے　　تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

فرماتے ہیں۔ فکرِ سخن کا نشہ مجھے آجکل کا نہیں روزِ ازل سے نشۂ فکرِ سخن ساتھ لے کر آیا ہوں۔ تریاک کے معنی افیون کے بھی ہیں اور چنڈو کے چھینٹے کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح چنڈو باز چراغ کی لو کے ذریعہ سے افیون کا دھواں نے کی وساطت سے حقہ کی طرح کھینچتے ہیں اور پیتے ہیں۔ اسی طرح دودِ چراغ سے نشۂ فکرِ سخن کرتا ہوں۔ قاعدہ ہے کہ فکرِ سخن یا مشقِ سخن زیادہ تر رات کے وقت کی جاتی ہے اور رات کو لکھنے کی غرض سے شمع یا چراغ کا قریب ہونا بھی لازمی ہے۔ طالب علم بھی عموماً رات ہی کو سبق یاد کرتے ہیں۔

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے　　پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

اِس شعر میں مرزا صاحب نے محسوسات کو تمثیل کا جامہ پہنا دیا ہے۔ یہاں عشق سے دنیا کی

محبت اور بندِ عشق سے اُس محبت میں پھنسا ہوا ہو نامراد ہے۔ فرماتے ہیں سو بار دنیا کی فکروں سے ہم آزاد ہوئے ہیں اور دنیا اہلِ دنیا سے قطع تعلق کر چکے ہیں۔ مگر اِس بات سے مجبور ہیں کہ دل فارغ البالی کا دشمن واقع ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں رہ کر بغیر شغل فکر آدمی رہ ہی نہیں سکتا۔

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار　　　یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

فرماتے ہیں۔ انسان کی آنکھ اِسی واسطے پیدا کی گئی ہے کہ ہمیشہ خون کے آنسو بہاتی رہے۔ اگر آنکھ سے خونِ دل نہیں بہتا تو موجِ نگاہ کے بدلے آنکھوں میں خاک اُڑنے لگتی ہے۔ یعنی آنکھ کی زیبائش اور رونق خاک میں مل جاتی ہے۔ یہ میکدہ یعنی چشمِ انسان بغیر شراب کے خراب ہو جاتا ہے۔ تناسبِ الفاظ کی کیا بات ہے۔

باغ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل　　　ابرِ بہار خمکدہ کِس کے دماغ کا

فرماتے ہیں۔ میرے غنچہ خاطر کی کھلانے والی تیرے باغِ حسن کی بہار ہے اور یہ باغ سدا بہار اور ہمیشہ شگفتہ رہنے والا ہے۔ میری مستی کا سبب ابرِ بہاری نہیں ہو سکتا۔ معلوم نہیں یہ خمکدہ یعنی ابرِ بہاراں کس کے مست کرنے اور بیہوش کر دینے کے واسطے پیدا کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معمولی شرابخوار بہار سے لطف اُٹھا سکتے ہیں اور ان کا دماغ فصلِ گل میں چمن کی سیر سے فرحت و انبساط حاصل کر سکتا ہے۔ میرے شگفتہ کرنے کے لئے تیرا باغِ حسن اور تیرے حسن کی بہار ہے۔

غزل

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا　　　رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

فرماتے ہیں۔ معشوق میری چینِ جبیں سے میرے غمِ پنہاں کو سمجھ گیا (غمِ پنہاں کے معنی یہاں رنجشِ دلی کے ہیں) پھر اِسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔ خط کا مضمون پتہ کی بے ربطی سے اُس پر کھل گیا۔ چینِ جبیں سے استعارہ لفافہ خط سے اور غمِ پنہاں کا استعارہ

راز مکتوب سے کیا ہے۔

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

حضرات صوفیہ کے ہاں صفائی قلب کے لئے بہت سے طریقے ذکر کے رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ قادریہ خاندان کا یہ طریقہ ہے کہ ناف کے مقام سے سانس کو کھینچ کر سینے تک لاتے ہیں، اور دہنی جانب سے گردن کو حرکت دے کر قلب کے اوپر ضرب لگاتے ہیں اور اس خیالی سانس کی کشش کو عربی خط میں لفظ اِلّا اللہ کی صورت تصور کرتے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میں بھی اپنے آئینۂ دل کی جِلا چاک گریباں سے کرتا رہا ہوں۔ انجام کار مجھ کو یہ ثابت ہوا کہ ایک الف سے زیادہ میرے آئینہ دل کی جِلا نہیں ہوئی۔ اور یہ ویسی ہی ایک سیدھی لکیر ہے جو آئینۂ فولادی کو صیقل کرتے وقت ابتدا میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ مجھ پر اپنی غلطی ثابت ہو گئی اور اب میں سمجھ گیا ہوں کہ میرا گریباں جس کو میں نے مصقلہ سمجھا تھا (مصقلہ گھوڑے کی نعل کی صورت کا ایک آلۂ آہنی ہوتا ہے جس سے آئینۂ فولادی یا تلوار وغیرہ ہتھیاروں کو صیقل کیا کرتے ہیں) وہ حقیقت میں مصقلہ نہیں ہے بلکہ گریبان ہے۔ اب میں اُسے بیکار شے سمجھ کر چاک کر رہا ہوں اور اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ گریبان سے یہاں مراد گریباں کی کنٹھی سے ہے جو بالکل مصقلہ سے مشابہت رکھتی ہے۔

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ   اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

فرماتے ہیں۔ میری گرفتاریِ خاطر کا سبب مجھ سے شرح و بسط کے ساتھ یعنی مفصل نہ پوچھو میں اپنا پورا پورا راز کھولنا نہیں چاہتا۔ مجمل حال یہ ہے کہ دل میرا اس قدر تنگ ہو گیا ہے کہ میں اُس کو زنداں سمجھتا ہوں۔

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام   رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

فرماتے ہیں۔ میری بدگمانی نے یہ بات منظور نہ کی کہ وہ دیر تک سرگرم خرام ناز رہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ نزاکت کے سبب سے چلنے میں اُس کو پسینہ آیا اور ماتھے پر اس پسینے

کے قطرے جمع ہو گئے۔ میں ہر قطرہ کو یہ سمجھا کہ رقیب کی چشمِ حیراں اُس کے رُخ پر جمی ہوئی ہے۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا ۔۔۔ نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

عجز کو خس اور تند خوئی کو شعلہ سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے۔ میں نے اپنی عاجزی اور اُس کی بدمزاجی سے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح شعلۂ سوزاں گھاس پھونس کو جلا دیتا ہے اُس کا غصہ میری بربادی اور قتل کا باعث ہوگا۔

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ۔۔۔ ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستان سمجھا

فرماتے ہیں۔ جب سفرِ عشق میں تکان بہت بڑھ گئی اور کمزوری پیدا ہو گئی تو ضعف نے آرام لینا چاہا۔ مسافر ہمیشہ تھک جانے کے بعد آرام لینے کے لئے سایہ کی تلاش کیا کرتا ہے چونکہ میرا سفر سفرِ عشق تھا۔ یہاں درخت یا دیوار کا سایہ تو مفقود ہی تھا۔ میں نے اپنے سایہ کو شبستان سمجھ کر آرام لینا چاہا۔ استعاروں سے قطع نظر کر لینے کے بعد اِس شعر میں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ جب خردمی اور ناکامی حد سے گزر جاتی ہے تو انسان یاس اور ناامیدی کو اپنا ہمدم قرار دے کر تسکین خاطر حاصل کر لیتا ہے۔

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ ۔۔۔ دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

فرماتے ہیں۔ مژۂ یار سے میرا دل مرنے کے وقت تک بھاگتا اور ڈرتا ہی رہا۔ اور نادانی سے بھاگنے کو میں دفعیۂ قضا سمجھتا رہا۔ تعجب ہے کہ پیکانِ قضا کا دفعیہ میں نے اِس قدر آسان سمجھ لیا تھا۔

دل دیا جان کے کیوں اُسکو وفادار اسدؔ ۔۔۔ غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ تم نے اُس کو وفادار سمجھ کر کیوں اپنا دل دیا۔ بالفرض محال اگر دل کا دینا ہی مقصود تھا تو بے وفا سمجھ کر دیا ہوتا۔ بہت بڑی غلطی کی جو کافر کو مسلماں سمجھا۔ یعنی وفاداری تو شرطِ اسلام ہے۔ کافر کو اس سے کیا تعلق۔

غزل

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا

فرماتے ہیں۔ مجھے اپنا دیدۂ تر پھر یاد آیا جس کے ذریعہ سے میرے بہت سے حوصلے نکلا کرتے تھے۔ اور آتش عشق۔ آتش شوق۔ آتش رشک کچھ بجھا جایا کرتی تھی۔ یعنی کسی قدر تسکین حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں میرے دل و جگر دیدۂ تر کے یاد آجانے سے آرزومند فریاد ہو گئے۔ مرزا صاحب نے فارسی محاورے کے موافق یہاں ہوئے کی جگہ آیا استعمال فرمایا ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اُس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔ (از یادگار غالب)

سادگی ہائے تمنّا یعنی　　　پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ آرزو اور تمنّا کی سادگی کو تو دیکھو یعنی پھر نگاہِ یار کی نیرنگیوں کا تماشہ یاد آیا مطلب یہ ہے کہ نگاہِ یار نے جو اشارے کنائے سے باتیں کی تھیں اور عاشق اپنی سادگی سے آرزو پوری ہونے کا ذریعہ سمجھا تھا بلکہ اپنی کامیابی کا یقین کامل ہو گیا تھا لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ ظاہر یہ ہوا کہ معشوق کی نگاہوں کا وہ ایک فریب تھا مگر اس میں ایک قسم کا لطف حاصل ہو چکا ہے اس لئے وہ پھر یاد آتا ہے۔

عذرِ درماندگی اے حسرتِ دل　　　نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ اے حسرتِ دل میں تجھ سے اپنے قاصر رہنے کا عذر کرتا ہوں میں ضرور تیری خواہش کے موافق نالہ کرتا لیکن مجبور اس سے ہو گیا کہ مجھ کو اپنا جگر یاد آگیا۔ یعنی میں نالہ

کرتا تو جگر شق ہو جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ حسرتِ دل اس بات کی متقاضی تھی کہ نالہ کیا جائے اور اُس کے اثر سے کامیابی حاصل کی جائے۔ مگر ہمارا نالہ ایسا پُر درد نالہ تھا کہ اُس کے مُنہ سے نکلتے ہی جگر شق ہو جاتا۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ‏ ‏ ‏ ‏ کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ زندگی بسر ہونے کے لئے کسی پر عاشق ہونا لازمی امر نہیں ہے۔ بغیر عشق کے بھی آدمی جی سکتا ہے۔ تیری راہ گزر کا یاد آنا ہمارے لئے مصیبت کا سبب ہو گیا۔ نہ تیری راہ گزر جس کی ہم مدت سے شہرت سنا کرتے تھے دیکھنے کے لئے جاتے نہ تجھ سے دوچار ہوتے نہ تیرا عشق پیدا ہوتا نہ اس مصیبت میں پھنستے جس میں اب گرفتار ہیں۔ خوبی اِس شعر میں یہ رکھی ہے کہ امور قضا و قدر کو اپنی نادانی کا سبب سمجھ کر اُس پر افسوس ظاہر کیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کے زمانہ میں رہ گزر کو مذکر بولا اور لکھا جاتا تھا لیکن اب بالاتفاق اہلِ دہلی مؤنث استعمال کرتے ہیں۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ‏ ‏ ‏ ‏ گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

اِس شعر میں مرزا صاحب اپنی معمولی شوخی برت گئے ہیں جس سے شعر کے دو معنی پیدا ہو گئے ایک یہ کہ جب تیرا گھر ہم کو خلد میں یاد آئے گا اور رضواں سے اس کا ذکر کریں گے، رضواں تیرے گھر پر خلد کو ترجیح دے گا ہم بھلا کیونکر اس بات کو تسلیم کریں گے ضرور آپس میں جھگڑا ہو گا وہ ہمیں جھٹلائے گا ہم اُسے جھٹلائیں گے یہاں تک کہ لڑائی کی نوبت آجائیگی۔ دوسرے لطیف معنی یہ نکلتے ہیں کہ جب تیرا گھر خلد میں ہم کو یاد آئے گا تو ہم خلد سے نکل کر بھاگنا چاہیں گے۔ رضوان روکے گا باہم خوب گُتھم گُتھا ہوگی۔

آہ وہ جُرأتِ فریاد کہاں ‏ ‏ ‏ ‏ دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ جگر کی موجودگی کے زمانے میں جو فریاد کرتے وقت جرأت سے کام لیا جاتا تھا وہ جرأت اب جگر کے مٹ جانے کے بعد باقی نہ رہی دل مآل اندیشی کی وجہ سے نالہ

کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے اور اس کا سبب معشوق کی بدنامی کا خوف ہے۔ اگر جگر سینے میں ہوتا تو وہ اس قسم کا پس و پیش نہ کرتا نالہ میں اثر ہوتا یا نہ ہوتا مگر نالہ ضرور کیا جاتا۔

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال　　دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ تیرے کوچے میں ہمارا دل کھو یا گیا ہے اس لیئے رہ رہ کر تیرے کوچے کا خیال آتا ہے۔ شاید یہ بات کہ دلِ گم گشتہ ہم کو بار بار یاد آتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس مضمون کو ادا کرنے میں آدابِ عشق اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ دوست کو دل کی چوری کا الزام نہیں دیتے بلکہ اُس کے کوچے میں دل کا گم ہو جانا ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری نزاکتِ معانی اس شعر میں یہ ہے کہ بے چین کرنے والے معشوق کی یاد ہے۔ مگر اخفائے رازِ عشق کے لیئے دلِ گم گشتہ کے یاد آنے کا بہانہ کیا جاتا ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اِس شعر میں دو معنی نکلتے ہیں۔ اوّل یہ کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اِس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کے گھر یاد آجاتا ہے۔ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے مگر ذرا غور کرنے کے بعد یہ دوسرے معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے ایسی ویرانی کہیں نہیں ہوگی۔ مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اُس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　سنگ اٹھایا تھا سر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ میں نے بچپن کے زمانے میں لڑکوں کی دیکھا دیکھی مجنوں پر پتھر اُٹھایا تھا مگر فوراً ہی مجھ کو اپنا سر یاد آگیا۔ یعنی یہ خیال ہوا کہ میرے سر میں بھی اسی قسم کا سودائے عشق سمایا ہوا ہے۔ یعنی میرا مزاج تو بچپن سے عاشقانہ تھا۔

غزل

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا　　آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ وعدہ پر آپ تشریف تو لے آئے مگر دیر کر کے آئے اِس توقف کی کوئی وجہ

ضرور ہو گی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ غیر آپ کو یہاں آنے سے روکتا تھا۔

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا اِس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

طنزاً زشتیِ تقدیر کو خوبیِ تقدیر کہا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ تجھ سے مجھے اپنی تباہی کا گلا بیجا ہے اس میں ضرور کچھ نہ کچھ میری بھی بدنصیبی کی شراکت تھی۔ معشوق کو کثرتِ محبت کی وجہ سے الزام دیتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلادوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ میں وہی شکار ہوں جو کبھی تیرے گھوڑے کے شکاربند میں باندھا گیا تھا اور تو نے مجھ کو حقیر سمجھ کر کھول پھینکا تھا۔ تو شاید مجھ کو بھول گیا ہو۔ مگر ابھی تک اپنے کو تیرا شکار ہی سمجھے جاتا ہوں۔ نخچیر شکار کو کہتے ہیں۔ فتراک اُس سُوتی رسّی یا تسمہ کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی زین میں گینڈیوں کے چاروں طرف بندھی ہوئی یا پیوستہ ہوتا ہے۔

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ تیرا وحشی تیری زلف کی یاد کو جس میں پہلے قید رہ چکا ہے ابھی تک بھولا نہیں البتہ اس کے ساتھ ایک خفیف سا خیال گرانباریِ زنجیر کا بھی تھا۔ اس بیان سے قیدِ زلف کے مقابلے میں قیدِ زنجیر کی سختی کو کم درجہ کا ثابت کرنا منظور تھا۔

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اِس شعر میں مرزا صاحب نے اس مضمون کو کہ معشوق نے آن کی آن میں اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے اِس طرح ادا کیا ہے " بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا۔ دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے۔ مجھ سے گفتگو بھی کرنی چاہیئے تھی۔ میں تقریر سُننے کا بھی مشتاق تھا۔ آنکھوں کو تو دیدار سے کچھ تھوڑی بہت تسلی ہو گئی مگر دل کا ارمان نہ نکلا۔ یہ جب ہی نکلتا کہ میرے پاس تھوڑی دیر ٹھہر کر مجھ سے بات چیت کی جاتی۔

یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ میں نے اُس کو یوسف کہدیا (یعنی غلام بنادیا) بڑی خیر ہوگئی کہ وہ مجھ سے اپنی یہ تعریف سُن کر خاموش ہوگیا۔ اگر وہ ناراض ہو جاتا تو میں یوسف کہدینے کے جرم میں سزا کے قابل تھا۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا نالہ کرتا تھا و لے طالب تاثیر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ غیر کو دیکھ کر میرا کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہو جائے اِس لئے کہ میں نالے کرتا تھا اور اپنے نالوں سے تاثیر کا طلبگار بھی تھا۔ یعنی مجھ پر میرے نالوں کا اثر کچھ ظاہر نہ ہوا تھا۔ اب غیر کو بُری حالت میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ میری ہی فریاد کا اثر ہے۔

پیشے میں عیب نہیں رکھتے نہ فرہاد کو نام ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ پیشہ کچھ عیب کی بات نہیں ہے۔ آپ فرہاد کو کیوں نام رکھتے ہیں۔ یعنی فرہاد بھی ایک عشق پیشہ گزرا ہے۔ ہم بھی عشق پیشہ ہیں اور میر بھی عشق پیشہ تھا۔ اگر فرہاد نے عشق کی سختیوں سے مجبور ہو کر کوہ کنی اختیار کی تو اس میں عیب کی کیا بات ہے۔ کوئی عاشق پہاڑ کاٹتا ہے۔ کوئی فریفتہ مصیبت کے دن کاٹتا ہے۔ کوئی شیفتہ ہجر کی راتیں کاٹتا ہے۔

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ ہم تو جان قربان کرنے کے لئے اُس کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔ اگر اُس نے ہمارے پاس آنا کسر شان سمجھا تھا تو دور ہی سے کوئی تیر کھینچ مارا ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم سے ناچیز عاشق کو بھی اپنے ادا و ناز کا شکار بنانا ضرور تھا۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ کراماً کاتبین کی تحریر پر کیوں ہمارے گناہوں کا شمار منحصر رکھا گیا ہے۔ وہ تو فرشتے ہیں اُن کو انسانی خواہشات کا کیا احساس ہے جس بات کو چاہا گناہ میں شامل کر لیا۔ لکھنے کے وقت دنیا کے دستور کے موافق ہمارا آدمی یعنی ہمارا کوئی وکیل ضرور ہونا چاہئے تھا۔ صرف فرشتوں کی تحریر پر ہمیں کیوں سزا دی جاتی ہے۔

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ریختہ اُردو میں شعر کہنے کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اُردو شاعری میں اے غالبؔ تمہیں اُستاد نہیں ہو کہتے ہیں۔ یعنی مشہور ہے کہ پہلے زمانے میں کوئی شاعر میرؔ بھی تھا۔ کس خوبی سے فنِ سخن میں اپنے کو میر صاحب کا ہم پلّہ ہونا ثابت کیا ہے۔

غزل

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا   زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

فرماتے ہیں۔ میں لبِ خشک اُن لوگوں کا ہوں جو آرزو اور شوق کی حالت میں بغیر کامیابی حاصل کئے دنیا سے گزر گئے ہیں۔ اِس واسطے دل شکستہ اور پریشان خاطر لوگوں کی زیارت گاہ بن گیا ہوں۔ دل آزردگان سے مراد گروہِ عُشاق ہے جو اکثر محرومی کی حالت میں مبتلا رہتے ہیں۔

ہمہ نا اُمیدی ہمہ بدگمانی   میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

فرماتے ہیں۔ سر سے پا تک نا اُمیدی اور بدگمانی کی تصویر بن گیا ہوں اِس لئے کہ میں اُن لوگوں کا دل ہوں جو وفائے شوق کا فریب کھا چکے ہیں یعنی جن عشاق نے معشوق کو وفادار سمجھ کر اس سے طرح طرح کے نقصان اُٹھائے ہیں اور آخر کار حصول ناکامی کے بعد نا اُمیدی حاصل کی ہے۔

غزل

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا   اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

اِس شعر کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ آج تک کسی کا بھی دوست تو نہیں بنا بلکہ اور تیرا جور ایک مجھ ہی پر نہیں بلکہ اوروں پر تو نے مجھ سے زیادہ زیادہ ظلم کئے ہیں۔ لیکن کسی قدر گہرا مطلب اِس شعر کا یہ ہے کہ جو ظلم مجھ پر کبھی نہ ہوا تھا وہ اب تو اوروں پر کر رہا ہے۔ اوروں سے یہاں خاص رقیب کی طرف اشارہ ہے یعنی رقیب پر تو نے مجھ سے زیادہ ستم کر کے میرے دل میں

رشک کی ایسی آگ لگادی ہے کہ جس کے مقابلہ میں جور و ستم کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ تیری اس ادا سے ثابت ہو گیا کہ میرے متعلق تیرا ترکِ جور دشمنی کا اظہار کر رہا ہے۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے　　خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

ماہِ نخشب وہ مصنوعی چاند جس کو حکیم ابن عطا مشہور ابن مقنا نے چاہِ نخشب سے نکالا تھا۔ یہ چاند دواؤں کے ذریعہ سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی دُور تک نہ پھیل سکی تھی اور اصلی چاند کے سامنے ناقص الخلقت قرار پایا تھا۔ دو مہینے تک چاہِ نخشب سے نکلتا رہا بعد میں شق ہو گیا۔ فرماتے ہیں۔ ماہِ نخشب کی طرح ناقص اور بیکار سمجھ کر دستِ قدرت نے چھوڑ دیا۔ حالانکہ خورشید ابھی روئے یار کے مقابلے میں تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی سمجھ کا قصور ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی کے موافق اُس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے اگر اس کی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا موتی بن جانے پر قانع ہو جاتی تو اُس کو جیسا کہ ظاہر ہے، یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا (انیادگار غالب)

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

قدِ یار کو ہمیشہ فتنۂ محشر یا سرو و شمشاد گلستاں سے تشبیہ دی جاتی ہے فرماتے ہیں کہ جب تک میں نے قدِ یار کا انداز اور اس کی حشر خرامی کا تماشا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا۔ فتنۂ قیامت کا دل سے معتقد نہ ہوا تھا۔

میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں　　یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

سادہ دل یا سادہ لوح بیوقوف آدمی کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں اپنی سادہ دلی سے آزردگی یار کو بھی موجب عیش و مسرت سمجھا ہوں اور دل میں خوش ہوں کہ حسیں سبقِ شوق کی

ایک مرتبہ لذت نصیب ہو چکی ہے دوبارہ بھی اس کا لطف حاصل ہوگا۔ یعنی یار سے جب صلح ہو جائے گی تو پھر سبقِ شوق کو دُہراؤں گا اور وہ باتیں جو ایک مرتبہ دل کو مزا دے چکی ہیں مگر یعنی دوسری بار بھی مزا دیں گی۔ یہ خبر ہی نہیں کہ اب اُس سے صلح ہونی ممکن نہیں۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں۔ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا کونہ تک بھی نہیں بھیگا (از یادگارِ غالب) گناہ کی تکمیل کے حوصلہ گناہ کا باقی رہنا اور شوقِ گناہ میں یہ کہنا کہ دریائے معاصی تنک آبی سے خشک ہو گیا بالکل اچھوتا خیال اور نئی جدت ہے۔ سُنا گیا ہے کہ اُستاد ذوق کو مرزا صاحب کا یہ شعر بہت پسند تھا۔

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل　　　آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

سمندر ایک جانور بیان کیا جاتا ہے جو نیولے کی قسم کا مگر نیولے سے کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے آگ میں پیدا ہوتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میں اُس وقت سے اپنے داغِ جگر سے فائدہ حاصل کر رہا تھا کہ جب آتشکدہ میں سمندر پیدا بھی نہ ہوا تھا یعنی جب سمندر کا وجود بھی نہ تھا۔

غزل

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا　　　رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

رشتۂ شمع سے وہ تاگا مراد ہے جو موم بتی کے درمیان میں ہوتا ہے اور موم کی وساطت سے روشن ہو کر جلتا رہتا ہے۔ ناموس۔ شرم و حیا۔ کسوت لباس۔ خار در پیراہن بودن۔ فارسی محاورہ ہے۔ مرزا صاحب نے اُردو شعر میں نظم کیا ہے۔ فانوس کا ڈھانچ اکثر لوہے کے تاروں کا بنا کر اُس پر باریک کپڑا چڑھا دیتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ رات کو حیا و شرم کی محفل خلوت میں معشوق بزم افروز تھا اس کے سامنے شمع خجالت سے پانی پانی ہو رہی تھی اور شمع کے حق میں رشتۂ شمع خارِ پیراہن بن گیا تھا۔

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا — کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ شہادت گاہِ عاشق میں کوسوں تک مہندی کے درخت پیدا ہوتے ہیں یہ اس خون کے اثر سے ہیں جو وقت قتل بہایا گیا تھا۔ اور حنا کا پیدا ہونا یہ بتا رہا ہے کہ شہید کس قدر حسرتِ پابوس کا خواہشمند تھا۔ زندگی میں تو یار کے قدموں تک اسکی رسائی نہ ہوئی مگر اِس آرزو میں خاک ہو جانے کے بعد اب اس نے حنا کے لباس میں ظاہر ہو کر قدمبوسی کی آرزو ظاہر کی ہے۔ اگر معشوق مہندی پاؤں میں لگالیگا تو یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔

حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو — دل بدل پیوستہ گویا اِک لبِ افسوس تھا

فرماتے ہیں۔ ہم نے عشق و محبت کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہ دیکھا کہ آخر کار حسرت و آرزو کا خون ہو گیا۔ عاشق و معشوق کا اگر دل سے دل مل بھی گیا تو وہ بھی گویا اک کفِ افسوس بن کر اخیر میں ہاتھ ملتا ہی نظر آئے گا۔

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں — جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

کیموس اصطلاح طب میں ہضم جگر کا نام ہے جس میں غذا ہضم ہو کر خون بن جاتی ہے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بیماریِ غم کی فارغ البالی کی کیا تعریف بیان کروں جو کچھ میں نے کھایا بے کیموس ہوئے وہ خونِ جگر ہو گیا بمطلب یہ ہے کہ بیماریِ غم میں میں نے ہمیشہ خون دل نوش فرمایا۔ اور خونِ دل کھانا غم و غصتہ کھانے کے مقام پر استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے معنی اِس شعر میں یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ بیماری غم میں مجھ کو اِس قدر فارغ البالی حاصل تھی کہ جو غذا میں کھاتا تھا یہی معلوم ہوتا تھا کہ خونِ دل کھا رہا ہوں۔

غزل

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرزا صاحب معشوق سے کہتے ہیں کہ تم تو میری عاشقی پر طعنہ زن تھے اور میرا مذاق اڑاتے تھے آئینہ دیکھ کر اپنی صورت پر خود بھی عاشق ہو گئے اب وہ دل نہ دینے کا غرور کہاں گیا۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے — اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عشق اجازت نہیں دیتا کہ معشوق اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل کرے اور عاشق دیکھے اِس مضمون کو مرزا صاحب نے اِس لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے اور قاصد کی خطا کو اپنی خطا ظاہر کرنے سے یہی مراد ہے کہ وہ ہم کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ اُس کے ہاتھ سے دوسرے شخص کا قتل ہونا دلِ محبت قبول کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔

غزل

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ جس دل کو نیازمندیِ عشق کے لئے پیش کیا جائے وہ دل اب میرے پاس نہیں رہا یعنی ہجر کے صدمے۔ بیوفائی کے رنج۔ بے اعتنائی کے قلق اتنے اُٹھائے ہیں کہ میں عشق کی خدمت بجا لانے کے قابل نہیں رہا۔ دوسرے مصرعہ میں فخریہ کہتے ہیں، میرا دل درحقیقت عشق کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل تھا اور پیش بھی کیا گیا تھا اور مجھ کو اس دل پر کسی زمانہ میں ناز بھی تھا مگر اب وہ دل صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے کسی قابل نہیں رہا۔

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے — ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ میں دنیا سے جاتا ہوں حسرتِ ہستی کا داغ لئے ہوئے یعنی قضا سے مجبور ہو کر میں نے جان دی ہے۔ میرا دل مرنے کو نہ چاہتا تھا۔ دوسرے مصرعہ میں دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ یعنی میں بجھی ہوئی شمع ہوں محفل کے قابل نہیں رہا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب شمع بجھتی ہے تو بتی بہت دیر تک چمکتی رہتی ہے اور وہ گویا داغ حسرت ہستی ہے۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

فرماتے ہیں عاشق کی حالت زار و نزار دیکھ کر قاتل کو رحم آگیا اور اُس نے قتل پر آمادہ ہو جانے کے بعد قتل کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اس مضمون کو اس طرح فرماتے ہیں کہ میں شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا۔ اب مجھ کو اپنے مرنے کی اور ہی کچھ تدبیر کرنی چاہیئے قاتل کا

نسہارا تو میری حالتِ زار نے مٹا ہی دیا اور حالتِ زار اس بات کی مقتضی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مر جانا چاہیئے۔

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے — یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

فرماتے ہیں آئینہ جس طرح عکس قبول کرتا ہے کچھ امتیاز نہیں کرتا بعینہٖ اسی طرح کی کیفیت دلِ عارف اور اہلِ دنیا کی ہے۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو لئے ہوئے ہے۔ اگر حقیقت کی طرف اس شعر کو لے جانا چاہو۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ دلِ عارف پر اچھی بُری دونوں کیفیتیں پرتو افگن ہوتی ہیں۔ اور اگر اس شعر کے معنی مجازی لئے جائیں گے تو یہ مطلب نکلے گا کہ اہلِ دنیا کو اچھے بُرے کلام کا فرق محسوس نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ ناقص و کامل کا فرق سمجھ نہیں سکتے۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

فرماتے ہیں، شوقِ خود نمائی نے نقابِ حُسن کے بند کھول دیئے ہیں یعنی ذرہ ذرہ۔ پتہ پتہ قطرہ قطرہ مظہرِ تجلیاتِ الٰہی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ناظر کی ظاہری آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی، اس لئے کہا گیا ہے کہ سوائے نظر کے کوئی حجاب درمیان میں باقی نہیں ہے۔ چشمِ باطن وا ہو جائے تو حجابِ ظاہری اُٹھ سکتے ہیں۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ میں رنج و آلامِ دنیا میں مبتلا رہا لیکن تیری یاد کسی وقت کسی حالت میں میرے دل سے نہیں ہٹی اور میں کبھی تیرے خیال سے غافل نہیں رہا یہ اور اس سے اوپر کا شعر خاص تصوّف کے رنگ میں ہیں۔

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں — حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ اب دل سے باغِ وفا کی آرزو بھی جاتی رہی۔ حوصلہ پست ہوگیا۔ ہمت نے جواب دے دیا اور اس کا سبب یہ ہے کہ وفا کے بعد وفا کا صلہ حسرت و افسوس کے سوائے کچھ نہیں پایا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ　　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

مطلع کے مدرعۂ ثانی پر دوبارہ مصرعہ لگایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ بیدادِ عشق سے میں نہیں ڈرتا اور یہ گریز خوف کے سبب سے نہیں ہے بلکہ لے اسدؔ ظلم اُٹھانے والا دل جو میرے پہلو میں تھا اور جس پر مجھ کو ناز تھا وہ دل باقی نہیں رہا۔ اب بیداد کون اُٹھائے۔

غزل

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

فرماتے ہیں۔ عشق نے تو میرے دل میں یہ وہم پیدا کر دیا ہے کہ ہائے غیر سے وہ محبت کے ساتھ ملتا ہے اور عقل ساری عمر کے تجربہ کے بعد یہ کہتی ہے کہ بھلا وہ بے مہر جس کی خلقت میں محبت رکھی ہی نہیں گئی کس کا آشنا ہو سکتا ہے۔

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے　　گردشِ مجنوں بچشمک ہائے لیلیٰ آشنا

فرماتے ہیں۔ دنیا کا ایک ایک ذرہ میخانۂ مکر و فریب کے ایک ایک ساغر کا حکم رکھتا ہے۔ اور یہ ساری نیرنگ سازی دنیا میں آسمان کے اشارے سے ہو رہی ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ مجنوں کو دیکھ لو جنون کی حالت میں اس کی باگ ڈور لیلیٰ ہی کے اشارے سے ہے۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز　　ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

فرماتے ہیں۔ اربابِ عجز یعنی انسان خاکی کا سرمایۂ نازِ عشق ہے جس کے سبب سے ایک ذرۂ ناچیز صحرا بن جاتا ہے اور قطرۂ بے حقیقت دریا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان خاکی جو ایک بے اعتبار ہستی رکھتا ہے عشق الٰہی تک ترقی بہم پہنچا کر جس طرح ذرہ صحرا میں اور قطرہ دریا میں مل کر عین صحرا اور عین دریا کہلانے کا سزاوار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان ذات باری تعالےٰ تک عشق کی بدولت رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے　　میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

فرماتے ہیں۔ رشک و بدگمانی دونوں بے لطف کر دینے والی باتیں ہیں۔ باہم ہم دونوں کو ان

دونوں بلاؤں سے قطع نظر کر لینی چاہیئے اِس لئے کہ زانو میرا رفیق ہے۔ میں ہمیشہ سر بزانو رہتا ہوں اور آئینہ تمہارا آشنا ہے، اس سے تم ہر وقت مشغول رہتے ہو۔ بہتر یہ ہے نہ تم شکایت کرو نہ میں بُرا مانوں۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے　　عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

مجھے اس وحشی دل سے پالا پڑا ہے جو ایک آفت کا ٹکڑا ہے اور عافیت کا دشمن ہے یعنی آرام سے مجھ کو اپنے گھر میں بیٹھنے ہی نہیں دیتا۔ عشق کے سودے میں آوارہ کر کے گلی گلی کوچہ کوچہ لئے پھرتا ہے۔

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ　　سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

فرماتے ہیں اے اسدؔ کوہکن نے جو کوہِ بے ستون کو تراشا اس سے اس کی یہ غرض تھی کہ ایک تصویر سایہ دار شیریں کی بنا لوں وہ نادان یہ نہ سمجھا کہ بھلا کہیں پتھر سے سر مار کر بھی معشوق پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا عشق کامل نہ تھا۔

غزل

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

فرماتے ہیں۔ میں نے جو معشوق کے حُسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرمِ راز اور ہمنشیں تھا وہ بھی سُن کر میرا رقیب بن گیا اس واسطے کہ اول تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان کی زبان سے پہلے مصرعہ کا دوسرا رکن یعنی اور پھر بیان اپنا یہ مرزا صاحب کی خصوصیات میں سے ہے۔ (از یادگارِ غالب)

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب　　آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

فرماتے ہیں۔ اگر اُن کو اپنی عالی ظرفی کا امتحان منظور نہ ہوتا تو وہ بزمِ غیر میں شراب مقدار سے زیادہ کیوں پیتے اس کے بعد حسرت سے یہ فرماتے ہیں کہ یارب اُن کو اپنی عالی ظرفی کا امتحان آج ہی منظور ہوا۔ کاش یہ امتحان میری بزم میں ہوا ہوتا تو میں اُن کی زیادہ بیخودی

سے لطف وصل زیادہ حاصل کر سکتا۔ دوسرا رشک کا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ میری موجودگی میں کیوں اُن کو اپنا امتحان منظور ہوا۔ بدقسمتی سے میرے واسطے یہ نظارہ نہایت دلخراش اور ضبط آزما تھا۔

عرش سے اِدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا　　منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

مطلب یہ ہے۔ ہم اپنی حقیقت و ماہیت سے بالکل بے خبر ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا مکان عرش اعلیٰ پر واقع ہوا ہے۔ کاش ہمارا مکان عرش سے اس طرف ہوتا کہ ہم عرش پر منظر بنا کر اپنے مقام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ مکان ایسی بلندی پر واقع ہوا ہے جس سے بلند تر اور کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔

بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا　　دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسبان ہمارا جان پہچان نکلا۔ اب ہمارے لئے اِس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے ہم اُس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے اور ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے (ازیادگارِ غالب)

انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا　　دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلاؤں

فرماتے ہیں۔ خط میں اپنا دردِ دل کب تک لکھتا رہوں۔ یہ کمبخت تو ختم ہی نہیں ہوتا اور اس طولانی تحریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلیاں زخمی ہو گئیں اور قلم سے خون ٹپکنے لگا۔ بہتر یہ ہے کہ میں خود ان کے پاس چلا جاؤں۔ اپنی انگلیاں اور اپنا خونچکاں خامہ اُن کو دکھلا دوں۔ اُمید تو یہ ہے کہ دونوں حالتیں دیکھ کر وہ خود اپنے دل میں میرے دردِ دل یعنی میری مصیبتوں کو سمجھ لیں گے۔

ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا　　گھستے گھستے مِٹ جاتا آپ نے عبث بدلا

فرماتے ہیں۔ آپ نے اپنا سنگِ آستاں اِس لئے بدلا ہے کہ میرے سجدوں نے اُسے خراب یا ناپاک کر دیا تھا، مگر آپ نے ایسا کیوں کیا وہ خود ہی کثرتِ سجود سے گھس جاتا اُس وقت نیا پتھر اس جگہ لگا دیا جاتا۔

تاکرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
فرماتے ہیں۔ ہم دشمن کی زبان سے دوست کی شکایت اگلوا لیتے ہیں اور پھر خود بھی اُسکی ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں۔ اور یہ اس غرض سے ہے کہ وہ کہیں ہماری چغلی یار سے جا کر نہ کھائے۔ گویا ہم نے شکایت یار میں اُس احمق کو اپنا ہمزباں بنا لیا ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا
یہ بات مشہور ہے کہ آسمان اہلِ کمال کا دشمن ہوا کرتا ہے۔ مرزا صاحب اپنی کسر نفسی سے فرماتے ہیں۔ ہم ایسے کہاں کے عقلمند اور فن سخن میں یکتائے روزگار تھے۔ اے غالبؔ ہمارا دشمن تو آسمان بے سبب ہو گیا ہے۔ اور یہ بات اوپر جتا دی ہے کہ بے سبب آسمان دشمن ہوا نہیں کرتا۔ آسمان کی دشمنی کے سبب دانائی اور یکتائی ہوا کرتے ہیں۔ لہذا اپنی دانائی اور ہنرمندی جس خوبی کے ساتھ ظاہر کی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

غزل

سُرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
مرزا صاحب نے یہ شعر اپنے حُسنِ کلام کی تعریف میں لکھا ہے۔ یعنی میرے کلام کا فیض عام ہے اور اس سے مفت نفع حاصل ہو سکتا ہے اور وہ صرف اس غرض سے ہے کہ خریدار کی آنکھ پر میرا احسان رہے۔ یعنی بصارتِ سخن فہمی اِس سُرمہ سے حاصل ہوتی ہے۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا
یعنی اگر نالہ کی اجازت نہ ہو گی تو ہم ضبطِ نالہ کریں گے اور اس کا اثر ضرور ہے کہ تجھ تک پہنچے گا۔ نالہ دل سے نکلتا ہے اور ضبط کی حالت میں وہ دل ہی میں دھوئیں کی طرح گھٹے گا مثل مشہور ہے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تیرے دل تک اس کا اثر پہنچے گا اور انجام کار تیرے چہرے سے وہ اثر ظاہر ہو گا۔

غزل

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

فرماتے ہیں۔ اہلِ دنیا رازِ حقیقت سے خبردار نہیں ہیں۔ ہر شخص کی طبیعت میں فخر و ناز کا ایک مادہ ہے جو سب کے دلوں میں یہ وہم پیدا کر دیتا ہے کہ ہم نے یہ کام اچھا کیا اور ہماری تدبیر سے یہ کام بن پڑا۔ حالانکہ جو کچھ ہے سب اُس کی طرف سے ہے۔ بغیر حکم الٰہی کے یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ لطفِ الٰہی کو بادِ صبا سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

بزمِ قدح سے عیشِ تمنّا نہ رکھ کہ رنگ صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

بزم قدح۔ بزمِ شراب۔ صید ز دام جستہ۔ وہ شکار جو جال میں پھنس کر نکل گیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بزمِ شراب نوشی سے عیش و عشرت کی تمنا رکھنی ایک ایسا شکار ہے جس پر قبضہ نہیں رہ سکتا عیش و عشرت کو دنیا میں ثبات حاصل نہیں ہے۔ نازک خیالی اِس شعر میں یہ ہے کہ شرابخواری سے تھوڑی دیر کے لئے جو رنگ چہرے پر آجاتا ہے وہ نشہ اُتر جانے کے بعد قائم نہیں رہتا۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

فرماتے ہیں۔ گناہ کا عذر کرنا ایک آسان بات ہے مگر ہم عذرِ گناہ بدتر از گناہ جانتے ہیں اس لئے عذرِ گناہ بھی نہیں کر سکتے۔ مگر ہماری ندامت اور شرمندگی اِس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اگر رحمت اس کو عذر گناہ کی جگہ قبول کرلے تو کیا بعید ہے۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

فرماتے ہیں۔ شوقِ شہادت میں قتل گاہ کو اس خوشی کے ساتھ جاتا ہوں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولہا سہرا باندھے ہوئے چلا جاتا ہے۔ میں نے گویا خیالی زخموں سے نگاہ کے دامن کو بھر لیا ہے۔

جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

فرماتے ہیں۔ اسدؔ تیری نگاہِ لطف کے شوق و آرزو میں اپنی جان دینی چاہتا ہے اور

پروانہ کو اپنا وکیل بنا کر تیری بزم میں داد چاہنے آیا ہے۔ جان دینے کا تماشہ پروانہ شمع پر جل کر تجھ کو دکھا دیگا۔ اِسی طرح تو ایک نگاہِ کرم سے اس کی یعنی اسد کی جان لے لے۔

غزل

جَور سے باز آئے پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا

فرماتے ہیں۔ وہ جَور سے باز آگئے ہیں مگر ایسے ظالم ہیں کہ جَور سے کیا باز آئیں گے، یعنی ہرگز ہرگز ستم نہ چھوڑیں گے اِس لئے کہ جَور سے باز آ کر یہ فرماتے ہیں کہ اب ہم شرمندگیِ ستم کی وجہ سے تجھ کو مُنہ نہیں دکھا سکتے۔ عاشق سے چھپنا اس کے سامنے نہ آنا بھی تو ایک طرح کا ظلم و ستم ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اِس شعر میں شانِ توکل دکھا کر فرماتے ہیں کہ سات آسمان دن رات ہمارے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے لئے جو کچھ حکم الٰہی ہے اس کے سامان خود بخود مہیا ہو جائیں گے ہم کیوں گھبرائیں اور پریشاں ہوں۔

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ۔ دشمنی۔ اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو، مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اِسلئے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اس کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو دوچند کر دیا ہے (از یادگار غالب)

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

خط کا جواب حاصل کرنے کا شوق اِس قدر بڑھا ہوا ہے کہ نامہ بر کے ساتھ ساتھ چلے جو... ںا اور اِس شوق میں ایسے محو ہیں کہ یہ بھی یاد نہیں رہا کیوں نامہ بر کے ساتھ ہولیے ہیں۔ دوسرے مصرع میں تعجب سے ارشاد ہوتا ہے یارب اپنے خط کو ہم خود کیا پہنچائیں یہ تو ایک شرمناک بات ہے۔ اِس بیان میں جو لطف ہے وہ محتاجِ شرح نہیں۔

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے　　آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

موجِ خوں سے یہاں ایذا و تکلیف مراد ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہمیں خواہ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے مگر اب آستانِ یار پر آچکے ہیں اور ڈھنی دیدی ہے تو یہاں سے اُٹھ کر کیا جائیں گے اب تو مر ہی کے اُٹھیں گے۔

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ　　مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہوگی۔ اب دیکھیے مرنے کے بعد کیا حالت دکھاتے ہیں جس کا تمام عمر منتظر رکھا ہے (از یادگار غالب)

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اِس مقطع میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں اور دونوں لطف سے خالی نہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ وہ دریافت کرتے ہیں غالب کون شخص ہے اور کیسا آدمی ہے۔ مشورہ طلب یہ بات ہے، کیا ہم صاف صاف یہ کہدیں کہ وہ تمہارا عاشق اور دلدادہ ہے۔ اس میں کچھ قباحت تو نہ ہوگی۔ دوسرے معنی یہ پیدا ہوتے ہیں کہ وہ غالب کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں یعنی تجاہلِ عارفانہ کرتے ہیں۔ اب ہم کو کوئی صلاح بتائے کہ ہم اس کا جواب اُن کو کیا دیں۔

غزل

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

فرماتے ہیں۔ لطافت میں جب تک کثافت شامل نہ ہو جائے جلوہ نمائی کی قابلیت پیدا نہیں کر سکتی۔ مصرعہ ثانی اس بات کا تمثیلی ثبوت ہے۔ یعنی بادِ بہاری کا جلوہ چمن کے ذریعہ سے نمود ہوا کرتا ہے۔ گویا چمن اپنی سبزی کے اعتبار سے آئینۂ بادِ بہاری کا زنگار ہوا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کثافتِ زنگارِ چمن لطافت جلوہ بادِ بہاری کے باعث ہے۔

حریفِ جوششِ دریا نہیں خود داری ساحل جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے کو بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے (از یادگارِ غالب)

غزل

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گزر جائے گا تو مر جائیں گے یعنی فنا ہو جائیں گے۔ گویا قطرہ دریا میں کھپ جائے گا اور یہی اس کا مقصود ہے۔ پس درد کا حد سے گزر جانا بھی اس کا دوا ہو جانا ہے (از یادگارِ غالب)

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

فرماتے ہیں میرا توشۂ قسمت قفل ابجد کی طرح واقع ہوا تھا۔ قفل ابجد اس کو کہتے ہیں جس کے حلقوں پر حروف ابجد کندہ ہوتے ہیں۔ قفل کا بنانے والا حروف مفردہ سے ایک فقرہ ترتیب دے لیتا ہے۔ کھولتے وقت جب وہ فقرہ مرتب ہو جاتا ہے تو قفل کھل جایا کرتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرا توشۂ قسمت یہی تھا کہ جب تجھ سے ربطِ دلی پیدا ہو جائے تو جدائی حاصل ہو۔

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ دل کی تکلیف رفع کرنے کے واسطے اس قدر تدبیروں کی کشمکش ہوئی کہ دل کا کام تمام ہو گیا۔ دوسرے مصرعہ میں اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح گھستے گھستے

نگرہ رہتی ہے نہ ڈورا باقی رہتا ہے۔ میرے دل کو اس کے علاج نے تمام کردیا۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اِس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

اس شعر کا لطف وجدانی ہے۔ بیان میں نہیں آسکتا۔ فرماتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم پر طرح طرح کے لطف اور قسم قسم کی عنایتیں ہوتی تھیں۔ اب ایک یہ وقت ہے کہ ہم پر جفا بھی نہیں کرتے۔ بیزاری خفگی۔ نفرت اِس حد کو پہنچ گئی ہے کہ ستم کرنا بھی ناگوار خاطر ہے۔ اللہ اللہ اس قدر اربابِ وفا کا دشمن ہو جانا۔

ضعف سے گریہ مبدّل بدمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

مسئلہ استحالہ عناصر کے اب تک ہم قائل نہ تھے مگر جب دیکھ لیا کہ ضعف اور ناتوانی کی وجہ سے ہمارا گریہ دمِ سرد سے بدل گیا تو امتحان کے بعد ہم کو یقین ہو گیا کہ پانی ٹھنڈی ہوا سے بدل جایا کرتا ہے۔

دل سے مِٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ بھلا کہیں گوشت سے ناخن بھی جُدا ہوا کرتا ہے ہم اپنے دل سے تیری فندقی بند انگلیوں کا خیال کیونکر مٹا سکتے ہیں مِٹ ہی نہیں سکتا۔ یعنی امر ناممکن الوقوع ہے۔

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھُلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے (از یادگار غالب)

گر نہیں نکہتِ گُل کو ترے کوچہ کی ہوس کیوں ہے گردِرہِ جولانِ صبا ہو جانا

فرماتے ہیں اگر پھولوں کی خوشبو کو تیرے کوچہ میں پہنچنے کی ہوس و آرزو نہیں ہے تو کس لئے یہ بادِ صبا کے ساتھ ساتھ چکر کاٹتی پھرتی ہے۔

تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

آئینہ فولادی پر برسات کی ہوا سے زنگ آجاتا ہے۔ مرزا صاحب مثال کے طور پر فرماتے

ہیں کہ صرف باغ اور صحرا ہی میں موسم بہار کا اثر ظاہر نہیں ہوتا بلکہ آئینہ فولاد تک اس سے متاثر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موسم بہار کی ہوا سے فرحت وانبساط حاصل کرنی چاہیئے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ　　چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ باغ میں رنگ برنگ کے پھولوں کو کھلا ہوا دیکھ کر یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ چشمِ حقیقت بیں کو ہر رنگ میں وا ہو جانا چاہیئے۔ یعنی ہر طرح کے سیر تماشے سے اچھا برا نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے۔

ردیف بائے موحدہ

غزل

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب　　دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

فرماتے ہیں وہ وقت آگیا ہے کہ موج شراب اڑنے کے لئے اپنے بازو کھولے اور بطِ مے کو تیراکی کا شوق رکھنے والا دل موجِ شراب عطا کرے۔ ایران میں قاعدہ ہے کہ جب انگور پک جاتا ہے تو سنگ مرمر کے حوضوں میں بھر دیا جاتا ہے۔ آفتاب کی تیزی سے دو چار دن کے بعد اس کا عرق نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت نو عمر لڑکے ان حوضوں میں اتر کر پاؤں سے روندتے ہیں۔ اس کے بعد مٹی کی منہ بند صراحیاں اس میں ڈال دی جاتی ہیں۔ بطِ مے اس صراحی کو کہتے ہیں۔ مسامات کے ذریعہ سے عرق انگور چھن کر صراحیوں میں بھر جاتا ہے۔ شراب ناب خاص اس شراب کو کہتے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ پھر بہار آگئی ہے اور شراب کی خوشبو ہوا پر پھر اڑنے لگی ہے پھر صراحیاں بطوں کی طرح سے حوضوں میں تیرتی پھرتی ہیں۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن　　سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

اربابِ چمن۔ درخشانِ چمن۔ فرماتے ہیں۔ تاک کے سایہ میں ہوا اس قدر نشاط انگیز ہے، گویا موجِ شراب بن گئی ہے۔ درختوں کا جھومنا ہوا کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ سیہ مستی نشہ کی

وجد سے ٹہنیاں جھوم رہی ہیں۔

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے   سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہُمامَوجِ شراب

فرماتے ہیں۔ اعتدال سے شراب پینے والوں کا ذکر نہیں ہے وہ تو تعریف سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ لوگ جو شراب بے انتہا پیتے ہیں اور دماغ ان کا کثرتِ نشاد سے معطل ہو جاتا ہے اس صورت میں بھی ان کو بادشاہی کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شراب کا نشہ بیہوش کر دینے کے بعد بھی بالِ ہُما کا حکم رکھتا ہے۔ مشہور ہے کہ جس شخص کے سر پہ ہُما کا سایہ پڑ جاتا ہے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر   موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

فرماتے ہیں کہ برسات کے زمانہ میں اُفتادہ زمینوں پر بھی سبزہ پیدا ہو جایا کرتا ہے کیا عجب ہے کہ بادِ بہاری موجِ ہستی کو موجِ شراب بنا دے۔ مطلب یہ ہے بہار کا موسم طبیعتوں میں جوشش و ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

چار موج اٹھتی ہیں طوفانِ طرب سے ہر سُو

فرماتے ہیں۔ جوشِ طرب ایک دریائے طوفاں خیز ہے جس میں یہ چار موجیں یعنی موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب بلند ہوا کرتی ہیں۔

جس قدر رُوح بناتی ہے جگرِ تشنۂ ناز   دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ بارش سے درختوں میں جس طرح قوتِ نمو پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح موجِ شراب سے شرابخواروں کے دلوں میں اُمنگ اور جوش پیدا ہو جایا کرتا ہے یعنی شراب ایک قسم کی قوتِ نامیہ ہے جو انسان کے دل میں نشو و نما کے ساتھ فخر و ناز کا مادہ پیدا کر دیتی ہے۔

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر   شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ انگور کی بیلوں میں مادہ شراب اسی طرح دوڑ رہا ہے جس طرح رگوں میں خون گردش کرتا ہے اور خون کے دوڑنے سے جیسے انسان کا چہرہ گلرنگ ہو جاتا ہے ویسے ہی انگور کی

بیلوں میں موجِ شراب سے سبزی و شادابی پیدا ہوگئی ہے۔ گویا سبزی و شادابی کا پیدا ہونا پر پرواز ہے۔

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ رنگ برنگ کے پھولوں نے کھِل کر خیالی رستوں پر چراغاں کی بہار پیدا کردی ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ تصور میں موجِ شراب جلوہ نما ہے۔

نشہ کے پردے میں محوِ تماشائے دماغ بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ موجِ شراب نشہ کے پردے میں محو تماشائے دماغ ہے اور یہ اس واسطے ہے کہ نشو و نمائی کا شوق رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خیال ترقی کرتے کرتے بہت بڑھ جاتا ہے اسی طرح شراب کا نشہ دماغ میں پہنچکر بڑھتا رہتا ہے۔

ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ کیفیتِ فصلِ بہاری اور کیفیتِ موجِ شراب نے زمانہ بھر میں طوفان اٹھا رکھا ہے یعنی فصلِ بہاری نے سبزہ و گل بے انتہا پیدا کردیئے ہیں اور نشۂ شراب نے نشاط و طرب بے حد مہیا کردی ہے گویا دنیا میں اِن دونوں چیزوں کا طوفان آگیا ہے۔

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل رہبرِ قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ موسمِ گل کا جوش بتا رہا ہے کہ ہنگامۂ ہستی کی گرم بازاری خاص میرے ہی دم سے دنیا میں قایم ہے۔ گویا میں ہنگامۂ ہستی کی شرح ہوں اور اسی طرح موجِ شراب دعویٰ کررہی ہے کہ میں قطرہ کو دریا تک پہنچانے کے لئے خضرِ راہ کا حکم رکھتی ہوں۔ یعنی جس طرح قطرہ فنا ہوکر دریا میں جا ملتا ہے۔ اسی طرح نشۂ شراب روح کو بیخودی کے عالم میں اس کے مرجع تک پہنچا دیتا ہے۔

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ جلوۂ گل دیکھ کر میرے ہوش اُڑنے شروع ہوگئے ہیں۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ بہار کے ساتھ ہی وہ وقت آنے والا ہے کہ جب موجِ شراب ہوا پر اُڑنے لگے یعنی جگہ جگہ شراب کی بھٹیاں بن جائیں۔

ردیف (ت)

غزل

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے　　جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

دیدان جمع دود بالکسر بمعنی کرم۔ فرماتے ہیں جن لوگوں کی اُنگلیاں موتیوں کے چھلوں کے قابل تھیں اُن کو آسمان نے مرنے کے بعد دیدان کا رزق بنا دیا ہے۔ یعنی افسوس ہے چھوٹے چھوٹے کیڑے اُن نازک اُنگلیوں کو قبر میں نوش فرما رہے ہیں جو موتیوں کے چھلوں میں رہتی تھیں۔

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا　　خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

قاعدہ ہے کہ بوقتِ سفر یاد تازہ رکھنے کے لئے نشانی کے طور پر اکثر چھلا دیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس نے مجھ کو بوقت سفر جلانے کے لئے بجائے چھلّے کے خالی انگلی دکھا دی اور یہ بات میرے لئے چھلّے کے داغ سے زیادہ ہو گئی۔ میں یہ نشانی اس کی یاد رکھوں گا کہ اُس نے مجھے نشانی کا چھلہ بھی نہ دیا۔

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم　　تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

سخنِ گرم۔ اشعار نغز۔ فرماتے ہیں۔ اے اسد میں ایسے لطیف اور پاکیزہ اشعار لکھتا ہوں کہ میرے کلام میں مخالف عیب نکال ہی نہیں سکتے۔ حرف پر انگلی رکھنی عیب جوئی کرنے کو کہتے ہیں۔

غزل

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت　　پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

مرنا ہے۔ یعنی موت لازمی اور ناگزیر ہے۔ فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص قیامت تک بھی زندہ رہا تو پھر کیا۔ مرنا لازمی ہے۔ قیامت کے دن مرے گا۔ قیامت کے دن مرنے میں یہ لطف پیدا ہو گیا ہے کہ روز قیامت زندہ ہونے کا دن ہے۔ اس دن کسی شخص کا مرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔

جگر کو مرے عشق خونابہ مشرب　　لکھے ہے خداوند نعمت سلامت

عشق خونابہ مشرب یعنی عشق کے مذہب میں خون کھانا جائز ہو۔ فرماتے ہیں۔ عشق کی خوراک خون ہے۔ میرے جگر کا خون پی کر عشق نے پرورش پائی ہے۔ اسی سے میرے جگر کو خونابہ مشرب خداوند نعمت تحریر کرتا ہے۔

علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں　　مبارک مبارک سلامت سلامت

فرماتے ہیں۔ برخلاف دشمن شہیدِ وفا ہوں۔ مبارک ہو اور شہیدِ وفا ہوں۔ یعنی شہادت پانے سے زندۂ جاوید ہو گیا ہوں اس لئے سلامت رہوں گا۔

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی　　تماشائے نیرنگ صورت سلامت

فرماتے ہیں۔ اگر مشاہدہ ذات باری تعالیٰ نہ ہوا اور کنہِ ذات کا ادراک حاصل نہ ہو سکا نہ سہی۔ وجود اشیاء کی رنگ برنگ صورتیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے ہونے کا کامل یقین تو حاصل ہو گیا۔ ہمارا یہ یقین ہی سلامت رہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا کوئی ہے۔

مُندھ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ　　یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

فرماتے ہیں۔ میرے احباب میری بالیں پر اس کو اس وقت لائے کہ جب میں نزع کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ جس طرح چراغ ٹمٹما کر گل ہو جاتا ہے اسی طرح آنکھیں کھولتے ہی کھولتے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ مطلب یہ ہے کہ یاروں نے بے وقت کوشش کی اور دوست نے بے موقع عنایت فرمائی۔

غزل

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست　　دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

فرماتے ہیں۔ رخساروں پر سبزۂ آغاز ہو جانے سے گرمیٔ حسن کی سرد بازاری ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطِ رخسارِ دوست بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا جس کے پیدا ہوتے ہی حسن کے بازار میں اندھیرا چھا گیا اور سارے خریدار چنپت ہو گئے۔

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر　　کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

فرماتے ہیں۔ اے انجامِ کار نہ سوچنے والے دل اپنے شوقِ دیدار کو ضبط کر لے۔ کیا تجھ کو یاد نہیں ہے کہ طور پر حضرتِ موسیٰؑ کا ذرا سی دیدار کی جھلک دیکھ کر کیا حال ہو گیا تھا۔ جلوۂ دیدارِ دوست کی تاب کون لا سکتا ہے۔

خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیے　　صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

فرماتے ہیں۔ حیرت کی خانہ ویرانی کو ملاحظہ کیجیے۔ یعنی ہم حیرت میں مبتلا ہو کر اپنے گھر کو بھول گئے ہیں اور وہ گھر بغیر ہمارے ویران ہو گیا ہے۔ ہم نے دوست کی رفتار کا تماشا دیکھا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ نقشِ قدم کی طرح بیخود و مدہوش ہو کر زمین پر گر پڑے ہیں اور یقین ہے تھوڑی دیر میں مٹ جائیں گے۔

عشق میں بیداد رشکِ غیر نے مارا مجھے　　کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

فرماتے ہیں۔ میں دوست پر مبتلا ہو کر مدت سے عشق کے آزار کا بیمار تھا۔ نیم جان تو پہلے ہی سے تھا۔ اب رشکِ دشمن کے ظلم نے رہا سہا بھی ہلاک کر دیا پہلے میں بیمارِ دوست تھا اب کشتۂ دشمن بن گیا افسوس کہ میرا انجام اچھا نہ ہوا۔

چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے　　دیدۂ پُر خوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

فرماتے ہیں۔ یاد رہے دیکھ ہم عشق میں خون کے آنسو رو رہے ہیں مگر صرف اس وجہ سے کہ اس بیدرد کا دل ہمیں خون کے آنسو سے روتا دیکھ کر شاد ہے۔ اس لئے ہم بھی کہتے ہیں چشمِ ما روشن۔ یعنی ہم بھی اپنے دیدۂ پُر خوں سے خوش ہیں۔ اسواسطے کہ ہمارا دیدۂ پُر خوں

ساغرِ سرشارِ دوست بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے جس طرح شراب پی کر سرور حاصل ہوتا ہے اسی طرح اس بیدرو کا دل ہم کو خون کے آنسو روتا ہوا دیکھ کر مسرور ہوتا ہے اور اس کے خوش ہونے سے ہم بھی شاد ہیں۔

قطعہ

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں ۔۔۔ بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

اس قطعہ میں کس خوبی کے ساتھ مرزا صاحب نے دشمن کے منافقانہ برتاؤ کی تصویر کھینچی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی جتایا ہے کہ دشمن کا اظہارِ التفات اس کی اپنی شیخی پر مبنی ہونے کے علاوہ کمال دلخراش بلکہ آتشِ رشک کا بھڑکانے والا ہے۔

تاکہ میں جانوں کہ ہے اُسکی رسائی واں تلک ۔۔۔ مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

فرماتے ہیں۔ مذکورۂ بالا التفات اس غرض سے بھی ہے کہ میں یہ بات سمجھ لوں کہ اسکی رسائی ان تک ہے اس لیئے مجھ کو پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست کا فریب بھی دیتا ہے۔

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ ۔۔۔ سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

فرماتے ہیں۔ اس کی ڈینگیں سُن کر جو میں اپنے ضعفِ دماغ کی شکایت کرتا ہوں یعنی یہ کہتا ہوں کہ تیری فضول بکواس سے میرا سر پھرا جاتا ہے تو وہ مکار زلفِ عنبر بارِ دوست کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔ اس سے اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خوشبوئے زلفِ یار دماغ کی کمزوری کا علاج ہے پھر تم کیوں میرے ساتھ باتیں کرنے سے ضعفِ دماغ کی شکایت کرتے ہو۔

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ۔۔۔ ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

فرماتے ہیں۔ میرے چپکے چپکے رونے کا علاج شوخیِ گفتارِ دوست کا بیان سمجھ کر اس کی اپنی دوست کی باتوں کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیئے ۔۔۔ یا بیاں کیجئے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

آپ فرماتے ہیں کہ دشمن کی ستم آمیز مہربانیوں کی شکایت کی جائے یا ظلم دوست کی

شکر گزاری بیان ہو۔

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ — ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرار دوست

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ یہ غزل اپنی مجھ کو دل سے پسند ہے اس واسطے کہ اس کی ردیف میں لفظ دوست بار بار آیا ہے جو لفظ ختم شعر پر قافیوں کے بعد بار بار آتا ہے اس کو ردیف کہتے ہیں۔

ردیف جیم

غزل

گلشن میں بند و بست برنگِ دگر ہے آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

حلقۂ بیرونِ در سے دروازہ کی محراب مراد ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ گلشن میں بہار آگئی ہے اس لئے دوسرا بند و بست کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حلقہ بیرونِ در یعنی محرابِ در قمری کا طوق بن گئی ہے۔ آج جو شخص چمن کی سیر کو باغ میں آئے گا وہ قمری کی طرح گرفتار چمن ہو جائے گا۔ قاعدہ ہے بہار کے موسم میں جوشِ جنوں ہوا کرتا ہے۔ آج کل باغ کی ہوا اور سیر چمن جنوں خیز ہے۔

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

فرماتے ہیں۔ آج میری ہر آہ کے ساتھ ایک میرے دل کا ٹکڑا باہر آجاتا ہے۔ تارِ نفس کی کمند نے اثر کو شکار کر لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج میری آہ میں تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور اس کا اثر خود میرے دل پر ہو رہا ہے اس لئے مجھ کو اپنی آہوں سے کامیابی کی اُمید پیدا ہو گئی ہے۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

فرماتے ہیں۔ اے عافیت یعنی آرام و راحت سے زندگی بسر کرنے کے زمانے میرے پاس سے دُور ہو جا اور اے انتظام تو بھی اس گھر سے رفو چکر ہو۔ میرا سیلاب گریہ یعنی میرے

اشکوں کا طوفان اب میرے گھر کو گرانے والا ہے۔ آج کے بعد میری زندگی کے دن مصائب و تکالیف میں گزریں گے۔ تم دونوں میرے ساتھ کیوں ایذا سہتے ہو۔

تو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں　　اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

فرماتے ہیں۔ معشوق مریضِ عشق پر یہ الزام لگاتا ہے کہ تیرا کوئی تیماردار نہیں ہے جو وقت پر دوا پلائے اور پرہیزی غذائیں کھلائے۔ بے تدبیری اور بد پرہیزی سے مرض بڑھتا جاتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم مریضِ عشق کے تیماردار بنتے ہیں اور اس کی دوا وغیرہ کی نگرانی ہمارے ذمہ ہے لیکن پہلے یہ بات طے ہو جانی چاہیئے کہ مریضِ عشق اگر اچھا نہ ہوا یعنی دوائے وصل سے بھی اس کا مرضِ عشق زائل نہ ہوا تو مسیحا یعنی معشوق کی کیا سزا تجویز کی جائے۔ مرزا صاحب کا دعوےٰ یہ ہے کہ مریضِ عشق کسی طرح صحت یاب ہو ہی نہیں سکتا۔

ردیف جیم فارسی

غزل

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ　　اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

فرماتے ہیں۔ انسان کو اُمید اور آرزو ناکامیابی کی حالت میں بھی ترک نہ کرنی چاہیئے اگر شراب نہیں ہے تو بھی ساغر کا انتظار کھینچنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کامیابی کی توقع کسی حالت میں نہ چھوڑنی چاہیئے۔ انتظار کھینچنا اور شراب کھینچنی دو محاورے ہیں۔

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ　　برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

فرماتے ہیں۔ میرے آئینۂ کمال کی گرمی و سعی کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ اہلِ نظر کی تلاش اور جستجو میں اتنی صعوبتیں اور تکلیفیں میں نے اُٹھائی ہیں کہ اب میرے آئینۂ کمال کا جوہر میری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ قدردانِ کمال کے نہ ملنے سے مایوس ہو کر صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص ایسا مجھ کو مل جائے جو جوہرِ کمال کو میرے آئینے

کمال سے کانٹے کی طرح کھینچ لے۔

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

فرماتے ہیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے معشوق کا انتظار کھینچنا یا نیند کا انتظار کھینچنا کھلی ہوئی راحت طلبی ہے۔ وعدۂ یار کا یہ اشارہ نہیں ہے کہ عاشق پلنگ پر لیٹا ہوا بستر کے ناز اٹھائے۔ اگر معشوق وعدہ پر نہیں آیا ہے تو نہ آنے کی وجہ دریافت کرنے میں کوشش کی جائے۔ بالکل نا امیدی کی صورت میں بادیہ گردی، صحرانوردی، جامہ دری، نالہ کشی بہت سے کام ایسے ہیں کہ جن میں مصروف ہو کر عاشق وقت گزار سکتا ہے۔ اور اگر صرف نیند کے انتظار میں آدمی پڑا کروٹیں بدل رہا ہے تو اس کے لئے بھی بہت سے شغل ممکن ہو سکتے ہیں مطلب یہ ہے ہر قسم کے آدمی کے واسطے راحت طلبی ممنوع سمجھی جاتی ہے۔

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

فرماتے ہیں۔ نرگس ٹکٹکی باندھے ہوئے بہ نگاہِ حسرت تیرا منہ تک رہی ہے اور میرے سامنے تجھ کو کسی کا دیکھنا اظہارِ رقابت ہے۔ لیکن یہ میری رقیب یعنی نرگس جیتے کی بھی اندھی ہے اور آنکھوں کی بھی اندھی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر تجھ کو شراب پینی چاہیئے۔

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

فرماتے ہیں۔ ادا و ناز جو تجھ کو اللہ تعالیٰ نے بخشے ہیں وہ گویا اس کی امانت ہے۔ اس امانت کا حق نیم غمزہ سے ادا کر دا اگر پورا غمزہ ہو جائے گا تو فوراً عاشق کی جان نکل جائیگی۔ اس لئے تجھ کو لازم ہے کہ نیم غمزہ سے کام لے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر زخمِ جگر میں وار کرنے کے بعد خنجر چھوڑ دیا جائے گا تو بسمل فوراً جان بحق ہو جائے گا اور اگر وار کرنے کے بعد خنجر زخم میں سے کھینچ لیا جائے گا تو مجروح کے مرنے میں ضرور دیر لگے گی اور شاید جانبر بھی ہو جائے۔ اس لئے نیم غمزہ سے کام لینا بہتر ہے۔ دوسری صنعتِ الفاظ اس شعر میں یہ بھی رکھی گئی ہے کہ نیام کا الف نکال ڈالنے کے بعد نیم رہ جاتا ہے۔ اور نیم غمزہ

ہی ہے کام لینے کو عاشق کہتا بھی ہے۔

میرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

فرماتے ہیں۔میرے پیالہ میں صہبائے عشق چھپی ہوئی ہے جس میں آتش سیال سے زیادہ گرمی ہے۔اس کی مناسبت سے کباب بھی دلِ سمندر کا ہونا چاہیئے (سمندر ایک جانور ہوتا ہے جو آتشکدہ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ سے باہر آکر فوراً مر جاتا ہے) کہتے ہیں سمندر کے سینے میں ہے کبابِ دلِ سمندر کھینچ۔

ردیف دال

غزل

حُسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

فرماتے ہیں۔حُسن کو ناز و انداز کی کشمکش سے میرے مرجانے کے بعد رہائی ہوگئی۔بارے اہل جفا و اہل ستم۔یعنی تمام معشوق آرام سے ہوگئے۔جب تک میں زندہ تھا تو ہر حسین مجھ کو اپنا فریفتہ بنانے کے واسطے اظہار غمزہ و ناز میں پھنسا رہتا تھا۔

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

فرماتے ہیں۔اب کوئی آدمی منصب عشق کے قابل نہ رہا۔یہ عہدہ خالی ہوگیا اور اسی کے ساتھ نازو ادائے معشوقاں بیکار و معطّل ہوگئے۔

شمع بُجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

فرماتے ہیں۔شمع کے بُجھتے وقت جو شعلہ آتش دھواں بن کر ظاہر ہوتا ہے وہ درحقیقت دھواں نہیں ہوتا بلکہ شمع کشتہ کے سوگ میں شعلہ سیہ پوش ہوجاتا ہے۔اسی طرح عشق کا شعلہ میرے مرجانے کے بعد غم میں سیہ پوش ہوگیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ میں سوز و گدازِ عشق کا مرتبہ رکھتا تھا۔

خون ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی — اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ خاکِ قبر میں ہمارا دل خون ہو گیا ہے اس غم میں کہ معشوقوں کے ناخن ہمارے مرجانے کے بعد حنا کے محتاج ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عام حسین ہمارے خون کی مہندی ہاتھوں میں لگاتے تھے اِس لئے کہ حنا میں ہمارے خون کا سا شوخ رنگ ہو جاتا تھا۔ ہمارے مرجانے کے بعد انہیں مہندی لگانی پڑی۔

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا — نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ جوہرِ ظلم بیداد کے ظاہر کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔ یعنی میں مر گیا اِس لئے نگہِ ناز میرے بعد سُرمے سے خفا رہنے لگی۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ سے قدردانِ حسن کے مرجانے کے بعد حسینوں کو بناؤ سنگھار سے نفرت ہو گئی۔

ہے جنوں اہلِ جنوں کیلئے آغوشِ وداع — چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ ان دیوانوں کے گریبانوں سے جو ہمیشہ گریبانوں کو چاک رکھتے ہیں۔ چاک گریباں جُدا ہوتا ہے۔ یعنی میرے مرجانے کے بعد چاک کسی گریباں کے پاس آ کے بھی نہ پھٹکے گا۔ اس لئے چاک گلے مِل کر گریبانوں سے جُدا ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کاملوں سے زمانہ خالی ہو جائیگا پھر کوئی میرا سا عاشقِ کامل پیدا نہ ہوگا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق — ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اِس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں، مے مرد افگنِ عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اِس مصرعہ کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے

حریفِ مے مرد افگن عشق؟ یعنی کوئی ہے جو مے مرد افگنِ عشق کا حریف ہو۔ پھر جب اِس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اِس مصرعہ کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق! یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اِس میں لہجہ اور طرزِ آواز کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اِس طرح مصرعہ مذکورہ کی تکرار کروگے فوراً یہ معنی ذہن نشیں ہو جائیں گے (از یادگارِ غالب)

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ میں اِس غم سے مرتا ہوں کہ میرے مر جانے کے ساتھ ہی مہر و وفا کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اور پھر اتنا بھی کوئی نہیں ہے کہ مہر و وفا کی تعزیت میرے بعد کرے گا۔

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ مجھ کو عشق کی تنہائی اور بیکسی پر رونا آتا ہے۔ میرے مر جانے کے بعد کون اس کا میزبان بنے گا اور یہ سیلابِ بلا یعنی عشق کس کے گھر جائے گا۔

ردیف ر

غزل

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار — نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

فرماتے ہیں۔ یہ در و دیوار جو حائلِ نظر ہیں اور نگاہ کو معشوق تک پہنچنے نہیں دیتے ہیں ان کے حاجب بن جانے سے ہمارا کچھ حرج نہیں ہے۔ ہماری نگاہِ شوق تصور میں یار تک پہنچنے لگی ہے اور مشق تصور کا سبب بھی در و دیوار کا حجاب ہے گویا یہ حائل ہو کر نگاہِ شوق کے بال و پر بن گئے ہیں یعنی ان ہی کی وجہ سے چشمِ تصور میں یہ قوت پیدا ہو گئی ہے۔

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ — کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

فرماتے ہیں۔ میرے جوشِ گریہ نے ترقی کر کے گھر کا یہ حال کر دیا ہے کہ دیوار گر کر دروازہ

بن گئی ہے اور دروازہ ملبہ پڑکر دیوار بن گیا ہے۔

نہیں ہے سایہ کہ سُنکر نویدِ مقدمِ یار　　　گئے ہیں چند قدم پیشتر درو دیوار

فرماتے ہیں۔ یہ سایہ درو دیوار نہیں ہے جو درو دیوار سے تھوڑے فاصلہ پر نظر آرہا ہے بلکہ یار کے قدم رنجہ کرنے کی خوشخبری سن کر خود درو دیوار مہمان کے استقبال کے واسطے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ　　　کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر درو دیوار

فرماتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ شرابِ جلوہ کو تو نے اس قدر سستا کر دیا ہے کہ تیرے کوچہ کے درو دیوار بھی تیری شراب دیدار سے مست ہو گئے ہیں۔

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ　　　کہ ہیں دُکانِ متاعِ نظر درو دیوار

فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو انتظار کا سودا سلف خریدنا منظور ہے تو آ اور تماشا دیکھ کہ عالمِ انتظار میں میری نگاہیں درو دیوار پر اس طرح جمی ہوئی ہیں جیسے دُکانداروں کے ہاں بیچنے کا سامان دُکانوں میں سجا ہوا ہوتا ہے۔ متاعِ نظر کی خریداری اگر تجھ کو منظور ہو تو چلا آ۔

وہ آرہا مرے ہمسایہ میں تو سائے سے　　　ہوئے فدا درو دیوار پہ درو دیوار

فرماتے ہیں۔ وہ میرے ہمسایہ میں آکر آباد ہو گیا تو میرے درو دیوار کا سایہ اس کے درو دیوار پر قربان ہونے لگا۔

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی　　　ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر درو دیوار

فرماتے ہیں۔ تیرے فراق میں ہمارے گھر کی آبادی ہماری آنکھوں میں کھٹکتی ہے (آنکھ میں کسی چیز کے کھٹکنے کا لازمی نتیجہ آنسو کا جاری ہو جانا ہے) ہم اپنے درو دیوار کو دیکھ کر ہمیشہ تیری یاد میں رویا کرتے ہیں۔

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے　　　کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر درو دیوار

فرماتے ہیں۔ میں نے جب کبھی دل کھول کر رونے کا ارادہ کیا ہے تو فوراً درو دیوار میرے

قدموں پر گر پڑے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرے رونے میں ایسا اثر ہے کہ تکمیل ارادہ سے پہلے تاثیر ظاہر ہو جاتی ہے۔

نہ پوچھ بیخودیِ عیش مقدمِ سیلاب — کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

فرماتے ہیں۔ سیلاب آنے کے وقت بیخودیِ عشق کی کیفیت مجھ سے نہ پوچھ گویا در و دیوار کو حال آجاتا ہے۔ اور وہ مصروفِ رقص ہو جاتے ہیں۔

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں — حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

افشاءِ راز کی نسبت فارسی کا مقولہ مشہور ہے کہ "دیوار ہم گوش دارد" مرزا صاحب اِس مقولہ کی مخالفت میں فرماتے ہیں کہ اپنا رازِ محبت اے غالبؔ زمانہ میں کسی سے نہ کہہ سوائے در و دیوار کے یعنی اگر تو اپنا رازِ محبت چھپا نہیں سکتا اور کسی کے سامنے کہنا ضروری سمجھتا ہے تو بجائے انسان کے در و دیوار سے کہہ مطلب شعر کا یہ ہے کہ رازِ محبت کبھی منہ سے نکالنا نہ چاہیئے۔

غزل

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر — جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

مرزا صاحب نے اس مطلع میں نئی قسم کی شوخی برتی ہے۔ فرماتے ہیں میں نے جب کبھی معشوق سے یہ شکایت کی ہے کہ تو کبھی میرے گھر نہیں آتا تو اس نے جواب میں شوخی سے یہ کہدیا ہے کہ میں تمہارا گھر نہیں جانتا ورنہ ضرور آتا۔ اب مرزا اپنا قدیمی گھر چھوڑ کر معشوق کے دروازہ پر آپڑے ہیں اور اس سے یہ کہتے ہیں کہ میں نے ترے دروازے پر بغیر تجھ سے اجازت لئے گھر بنا لیا ہے لیکن اب بھی تو میرے گھر کو بغیر میرے کہے ہوئے نہیں جان سکتا۔

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کہتے ہیں کا اشارہ معشوق کی طرف ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں اور اس وقت کہتے ہیں کہ جب مجھے ایسی طاقتِ گویائی نہ رہی کہ میں اپنا حالِ دل مفصل اور مشرح بیان کر سکوں۔ میں کسی کا مدعا

دلی بیان کئے بغیر کیونکر سمجھ سکتا ہوں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جب مجھ میں حال بیان کرنے کی طاقت نہ رہی تو وہ ستم ظریف شوخی سے مجھ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ تو اپنے دل کی بات بیان کرتا ہی نہیں، میں بغیر کہے تیرا مدعاء دلی کس طرح سمجھ سکوں۔

کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

فرماتے ہیں۔ میں ایسے معشوق ستم شعار پر عاشق ہوا ہوں جس کے نام کے ساتھ ہر شخص ستمگر کا لفظ ضرور استعمال کرتا ہے ایسے ظالم سے کس طرح مدعا براری ہوسکے گی۔ "لیوے" کا لفظ بہت قدیمی زبان کا ہے۔ مرزا صاحب کو یہ اُردو دیوان لکھتے ہوئے تقریباً ایک سو بارہ برس گزرے۔ اب یہ اور اس کے ساتھ اور بہت سے الفاظ متروک ہو گئے۔ آخر عمر میں مرزا صاحب نے بھی ایسے صدہا لفظ ترک کر دیئے تھے۔

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

فرماتے ہیں۔ میرے دل میں کسی کی طرف سے بغض و عداوت نہیں ہے۔ میں ایک صاف باطن آدمی ہوں۔ سب سے صاف ملتا ہوں۔ اگر کسی کی طرف سے میرے دل میں کچھ بُرائی ہوتی تو فوراً اس کو ظاہر کر دیتا۔ اگر اس کے اظہار میں میری جان پہ ہی بن جاتی تو میں ہرگز کچھ پرواہ نہ کرتا۔ سچ یہ ہے کہ مرزا صاحب اپنی زندگی میں حُسنِ اخلاق کا ایک نمونہ تھے شعر کی خوبی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پُوجنا چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

چھوڑے کا لفظ دونوں مصرعوں میں اِس بے تکلفی کے ساتھ باندھنا حُسنِ بیان پر دال ہے۔ معنی شعر کے بالکل صاف ہیں۔ جو شخص کسی بُتِ کافر کو پوجے گا خلقِ خدا ضرور اُس کو کافر کہے گی۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

فرماتے ہیں۔ دشنہ و خنجر سے میری مراد ناز و غمزہ ہے۔ یعنی محسوسات سے تشبیہ دیئے بغیر ہر کس و ناکس مطلب سمجھ نہیں سکتا۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اِس شعر میں بھی مسطورۂ بالا شعر کا مضمون دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مصرعۂ ثانی میں بات کا لفظ محذوف کر کے حُسنِ بیان کو دوبالا کر دیا ہے۔ یعنی بادہ و ساغر کہے بغیر بات نہیں بنتی۔

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات سُنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

یہ شعر مرزا صاحب کے حسبِ حال ہے (آخر میں ثقلِ سماعت بہت بڑھ گیا تھا) اسی قسم کی شوخی برتی ہے۔ فرماتے ہیں آپ کو معلوم ہے میں بہرا ہوں۔ جب تک بلند آواز سے دو تین مرتبہ کوئی بات نہ کہی جائے میں سُن نہیں سکتا۔ اِس موقع پر آپ مجھ سے ناراض کیوں ہوتے ہیں یہ موقع تو دوگنا التفات فرمانے کا ہے نہ کہ آزردہ ہونے کا ہے۔

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

صنعتِ معنوی کے علاوہ اِس مقطع میں بہت بڑی خوبی یہ رکھی گئی ہے کہ سب کچھ عرض حال کر لینے کے بعد بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ گویا کچھ بھی نہیں کہا۔

غزل

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کمالِ رشک کا اظہار اس خوبی سے کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں۔ رُخِ یار کی چمک دمک دیکھ کر مجھ کو جل جانا چاہیئے تھا، کیوں نہ جل گیا۔ اب اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر جلا جاتا ہوں۔ یعنی رشک و حسد نے میرے دل میں آگ لگا دی ہے۔

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے سرگرمِ نالہائے شرر بار دیکھ کر

فرماتے ہیں۔ جس ارادت سے آتش پرست آگ کی پُوجا کرتے ہیں اُسی ذوق و شوق میں آہِ شرر بار کرنے میں سرگرم رہتا ہوں۔ میری یہ حالت دیکھ کر اہلِ جہاں مجھ کو آتش پرست کہتے ہیں۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

فرماتے ہیں۔ تم نے جفا کو عام کر دیا۔ کسی قسم کا امتیاز باقی نہ رہا۔ اور تمہارے اِس فعل نے عِشق کی آبرو پر بٹا لگا دیا یعنی موردِ جفا ہمیشہ عاشق کی ذات ہوا کرتی ہے۔ تم رقیب پر بھی جفا کرتے ہو۔ رقیب کے دل میں تمہارا عشق نہیں ہے اُس پر تمہاری جفائیں دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ تم بے سبب آزار ہو اور یہی بات میرے کھنچ جانے کا سبب ہے۔

آتا ہے میرے قتل کو پُرجوشِ رشک سے — مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ میرے قتل پر آمادہ ہو کر سامنے سے آرہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ قریب آکر ضرور مجھ کو قتل کرے گا۔ لیکن اس کے دستِ ناز میں تلوار کو دیکھ کر میں جوشِ رشک سے مرتا ہوں (پہلی ندرت تو اس شعر میں یہ ہے کہ ہنگامِ قتل عاشق کے دل میں بجائے خوشی یا خوف کے رشک پیدا ہو گیا ہے) ہنوز قاتل کے قریب آنے اور تلوار کے وار کرنے کی نوبت بھی نہیں آئی ہے۔ یہاں پہلے ہی آثارِ موت شروع ہو گئے ہیں (دوسری خوبی لفظِ رشک نے یہ پیدا کر دی ہے کہ وہ ہاتھ جس میں معشوق نے قتل کرنے کو چھوٹی سی تلوار لے رکھی ہے کیا اِس قابل نہ تھا کہ عاشق کی گردن میں حمائل ہوتا۔ دل پر تسکین رکھنے کی غرض سے رکھا جاتا۔ ان دونوں باتوں کو چھوڑ دیئے۔ کم از کم وہ نازک ہاتھ دستِ عاشق میں تو ہوتا) یہاں رشک کی دلیل یہ بھی پیدا ہو گئی ہے کہ تلوار اس کے دستِ نازک میں پہنچ کر پری بن گئی ہے۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

فرماتے ہیں۔ شیشہ کی گردن پر خلقِ خدا کا خون ثابت ہو گیا ہے اِس لئے خوف سے موجِ مے تیری رفتار کو دیکھ کر کانپ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نشہ کے عالم میں تیری رفتار زیادہ مستانہ ہو گئی ہے اور اس کو دیکھ کر ایک زمانہ قتل ہو رہا ہے اگر تو شراب نہ پیتا تو بہت سے آدمیوں کا خون نہ ہوتا۔ شراب کا نشہ لوگوں کے قتل کا سبب ہوا ہے پس گردنِ مینا پر خون ثابت ہو گیا نہ تو شراب پیتا نہ لوگ تیری مستانہ چال پر جان قربان کرتے۔

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

فرماتے ہیں۔ ہائے افسوس کہ ہم کو ظلم کا خواہشمند دیکھ کر اس ستمگار نے جفا ترک کر دی مطلب یہ ہے۔ عاشق کی بُری خواہش بھی معشوق پُوری نہیں کرتا۔

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

فرماتے ہیں۔ ہم اپنی جنسِ سخن کے ساتھ خریدار کے ہاتھ خود بھی بِک جاتے ہیں لیکن طبع خریدار کی کسوٹی کو پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کسوٹی کھوٹا کھرا شعر پرکھنے والی ہے بھی یا نہیں مطلب یہ ہے۔ ہم اپنے قدردانِ سخن کو بھی پہلے آزما لیتے ہیں اور دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کس حد تک ہمارا شعر سمجھ سکتا ہے اس کے بعد ہم خود اس کے قدردان بن جاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ مرزا کا کلام سمجھنے کو ایک غیر معمولی دماغ کی ضرورت ہے۔ ان کے معمولی سے شعر کی تہہ میں بھی ایک ایسی بات چھپی ہوئی ہوتی ہے کہ بہت ہی دشواری سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

زُنّار باندھ سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

فرماتے ہیں۔ زنّار اور تسبیح میں ایک ہی ڈورا ہے۔ یعنی نگاہ عارف میں دونوں رستے ہیں۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے رشتۂ زنّار کو بہ سبب صاف ہونے کے راہِ ہموار سے تعبیر کیا ہے۔ اور تسبیح کو اس کے دانوں کے اُتار چڑھاؤ کے خیال سے نشیب و فراز کا رستہ قرار دیا ہے جس میں منزل تک پہنچنے کے لئے سئو ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

فرماتے ہیں ان آبلوں سے بہت گھبرا گیا تھا مگر جنگل کو کانٹوں سے بھرا ہوا دیکھ کر دل کو خوشی پیدا ہو گئی۔ مطلب یہ ہے جب انسان کے دل کو عشق کی چٹک لگی ہوئی ہوتی ہے تو کیسی ہی تکلیفوں کا سامنا ہو ہمت نہیں ہارتا۔

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

معشوق کی صفات میں سے ایک صفت خوش گلوئی اور خوش بیانی بھی ہے۔ خوش بیانی کی

صفت طوطی میں بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ طوطی کی خوشنوائی مشہور ہے۔ رشک کا مادہ جتنا عاشق میں ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ معشوق میں بھی ہوا کرتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ مجھ سے ایسا بدگمان ہے کہ میں اگر آئینہ بھی دیکھتا ہوں تو اس میں زنگار کی سبزی کو دیکھ کر میرا معشوق عکس طوطی کی خوشنوائی سے اپنا دل بہلاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کو میلِ عشق جاتا رہے گا اس لئے وہ اپنی بدگمانی سے زنگار آئینہ پر رشک کرتا ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر ۔۔۔ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اُٹھا لیا۔ مرزا فرماتے ہیں۔ برقِ تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہِ طور، اس لئے کہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اُس کے موافق اس کو شراب دی جاتی ہے۔ پس کوہِ طور جو منجملہ جمادات کے ہے وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال معہ اس تمثیل کے جو اس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال ہے (از یادگار غالب) یہ شعر مرزا صاحب کے نشتروں میں سے ایک نشتر ہے۔

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا ۔۔۔ یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مرزا صاحب نے مصرعہ اولیٰ میں "وہ" کے لفظ سے واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ سر پھوڑنے کا سماں آنکھوں کے سامنے۔ سر پھوڑنے کا وقت اور موقع گزر گیا مگر اس کی دیوار کو دیکھ کر اب تک وہ تماشہ آنکھوں کے روبرو پھر جاتا ہے اور در و دیوار دیکھنے والوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

غزل

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر ۔۔۔ میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

فرماتے ہیں۔ آفتاب ایک قطرۂ ناچیز کے جذب کرنے میں وہ سرگرمیاں دکھا رہا ہے کہ

اس کے دیکھنے سے میرا دل کا نپا جاتا ہے۔ قطرہ اور قطرہ بھی وہ قطرہ جو نوک خار پر ٹھہر گیا ہے بہت ہی ناپائیدار ہستی کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے لئے جب ایسی سرگرمی کی ضرورت ہے تو دنیا کے بڑے کام تو بہت ہی دشواری اور محنت سے سرانجام پاتے ہوں گے۔

نہ چھوڑی حضرت یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہی زنداں پر

فرماتے ہیں۔ زنداں میں حسن یوسف کے لئے آرائش کا سامان پیدا ہو گیا۔ یعنی حضرت یعقوبؑ کی سفیدیِ چشم قید خانہ کے در و دیوار پر پھر رہی ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت یوسفؑ کے تصور میں روتے روتے حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کے کور ہو جانے کی طرف۔

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اُس زمانہ سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فرماتے ہیں۔ میں نے اُس زمانے میں فنا کی تعلیم پائی ہے۔ جب مجنوں طفلِ مکتب تھا اور مکتب کی دیواروں پر حرف مفرد بچوں کی طرح لکیریں کھینچ کر لکھا کرتا تھا۔ لام الف مل کر لفظ لا ہو جاتا ہے اور لا الٰہ الا اللہ سے حضرات صوفیہ کے ہاں نفی و اثبات کی ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں درس فنا میں قیس عامری پر سبقت رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھ کو فنا کی تعلیم روزِ ازل میں ملی تھی۔

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

فرماتے ہیں۔ مجھ کو مرہم کے نسخے ڈھونڈنے، تلاش کرنے۔ سیانے، لوگوں سے مانگنے سے فارغ البالی حاصل ہو جاتی۔ اگر دل کے زخم آپس میں نمکداں پر صلح کر لیتے۔ مطلب یہ ہے کہ قناعت اور صبر انسان کو تلاش اور جستجو کی تکلیفوں سے چھڑا دیا کرتا ہے۔

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مُہر عنواں پر

مرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں بہت بڑے مضمون کو بیان فرمایا ہے جس کی وسعت کے سامنے بڑے سے بڑا دفتر بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ فرماتے ہیں۔ اقلیم عشق میں کوئی دفتر کی کتاب اغماض و ناز اور انداز معشوقانہ سے خالی نہیں ہے اور ناز معشوقانہ ہمیشہ عاشق

کے برخلاف حکم جاری فرماتا رہا ہے۔ فرہاد سر پھوڑ کر شیریں کے عشق میں مر گیا اور وصل نصیب نہ ہوا۔ قیس دیوانہ ہو کر جنگل میں جا پڑا، مگر لیلیٰ نے وصل سے انکار ہی کیا۔ ایسے ہزاروں واقعات دنیا میں گزرے ہیں۔ مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ عاشق صادق ہمیشہ ناکام اور نامراد ہی ہوا کرتا ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی عاشق پیدا نہیں ہوا کہ جس سے معشوق نے اغماض و انکار نہ برتا ہو اور پشت چشم سے انکار پر مُہر نہ کی ہو۔

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا   کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

مرزا صاحب معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ مجھ کو اب تیرے سامنے ابرِ شفق آلودہ دیکھ کر یاد آگیا ہے کہ تیری جدائی میں اسی طرح گلستاں پر آگ برستی تھی۔ یعنی جب کبھی فرقت کے زمانے میں باغ کی سیر کو جانے کا اتفاق ہوا ہے اور غنچہ و گل پر نظر پڑی ہے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ آگ برس رہی ہے۔ سُرخی رنگ کی مناسبت سے گل کو آگ سے تشبیہ دینی اور ہجر میں باغ کی سیر کا ناگوار گزرنا جس خوبی سے بیان کیا ہے اُسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا   قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

فرماتے ہیں تیرے شہیدانِ ناز کے ڈھیر پر سو بار قیامت آچکی ہے۔ یعنی جب تیز ہوا چلی ہے ان کی خاک اُڑ کر پریشان ہو گئی ہے۔ اگر وقتِ معین پر قیامت آئی بھی تو تیرے شہیدانِ ناز کو کیونکر اُٹھا سکے گی۔ ان کی خاک اب باقی کہاں ہے وہ تو پہلے ہی برباد ہو چکی ہے۔

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدت کی   ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مجبوری، مظلومی اور بیکسی کی تصویر لفظوں میں اس سے بہتر نہیں کھنچ سکتی۔ فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ ناصح کی سخت زبانی اور بے رحمی کی کیوں شکایت کرتا ہے، اور کس لئے اس سے لڑتا ہے، خاموش ہو رہ۔ صبر کر۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا بھی تو زور گریباں پر چلتا ہے جب زیادہ مایوس اور مجبور ہو جاتے ہیں تو ہم اس اندوہ و غم کی حالت میں اپنا گریباں

پھاڑ لیتے ہیں۔ ناصح کی زبان چلتی ہے وہ ہمیں بُرا بھلا کہتا ہے۔ ہمارے ہاتھ چلتے ہیں ہم مظلوم اپنا گریبان پھاڑ لیتے ہیں۔ بے مثل مقطع لکھا ہے۔

غزل

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

فرماتے ہیں۔ اُن کی کوئی بات بناوٹ اور فریب سے خالی نہیں ہوتی۔ محبت کے پردہ میں بھی دشمنی کا اظہار ہوا کرتا ہے اِس لئے میں ہمیشہ اُن سے ہوشیار اور بدگمان رہتا ہوں۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اِس شعر کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ سوال وصل پر میری زبان نہیں اُٹھتی اور صاف لفظوں میں اپنی وضع کے خلاف مدعائے دلی بیان نہیں کر سکتا۔ اور وہ یا تو اپنے بھولے پن کے سبب سے میرے مطلب کو سمجھ نہیں سکتے۔ یا جان بوجھ کر نادان بن جاتے ہیں، اِس لئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی جاتی ہے کہ اُن کو ہی دوسرا دل عطا فرمائے۔ اگر مجھ کو اور زبان نہیں ملتی۔ دوسرے معنی بقول استاذی حضرت مولانا حالی مرحوم و مغفور یہ ہیں کہ مرزا صاحب در پردہ ان لوگوں کی طرف اشارہ فرما کر کہتے ہیں، جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہا کرتے تھے۔

ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اُس کی ہے کماں اور

مرزا صاحب نے تیر و کماں کی پرانی تشبیہوں کو پیش پا افتادہ سمجھ کر نیا پہلو اختیار کر لیا ہے فرماتے ہیں کہ ان ابرو سے اس کی نگہِ ناز کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی نگہ ناز تیر تو ضرور ہے مگر اس کی کمان ابرو نہیں ہے۔ یہ نگہِ ناز کا تیر دلی ارادہ کی کمان سے نشانہ پر لگا کرتا ہے اِسی واسطے اس کے زخم مختلف صورتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کہیں وہ خوشی کے پہلو اختیار کر کے عاشق کو تڑپاتا ہے۔ کہیں غصہ کے پیکان سے قتل کرتا ہے۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

فرماتے ہیں ہمارے عشق میں ہر شخص جان و دل سے تنگ آگیا ہے۔ بازاروں میں کم قیمت پر سودا بن جاتا ہے۔ ہم جان و دل اور خرید لائیں گے

ہر چند سبکدست ہوئے بُت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اس وقت تک معرفت الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِ راہ ہے پس اگر ہمنے بُت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ۔ یہ بڑا بھاری بُت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے (از یادگارِ غالبؔ)

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور

فرماتے ہیں۔ خونِ جگر جوش کی حالت میں ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ مجھ کو دیدۂ خوننابہ فشاں بہت سے مل گئے ہوتے تو ممکن تھا کہ میں دل کھول کر یعنی دل کی خواہش کے موافق روتا، اور خونِ جگر کے دریا بہا دیتا۔ جوشِ خونِ جگر عالم میں صرف دو آنکھوں سے کیا خاک رو سکتا ہوں۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

فرماتے ہیں معشوق کا یہ کہنا کہ ہاں اور وار کر۔ ہاں ایک اور ہاتھ چھوڑ۔ ہاں ایک اور زخم لگا۔ مجھ کو اس قدر پسند ہے کہ اپنی جان جانے کا مطلق غم نہیں۔

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

فرماتے ہیں۔ میرے دل و جگر میں پوشیدہ ہزاروں داغ ہیں۔ میں ان داغوں میں سے ہر روز صبح کے وقت ایک نیا داغ لوگوں کو دکھاتا ہوں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خورشید جہانتاب معمولی طور پر اُفقِ مشرق سے طلوع ہو رہا ہے۔

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا۔ کوئی دم چین کرتا۔ جو نہ مرتا کوئی دن۔ آہ و فغاں اور

مرزا صاحب سے معشوق نے یہ سوال کیا ہے، تو کوئی دم چین سے نہیں رہتا اور ایسا بھی نہیں ہوتا کہ تو ہمیشہ فریاد ہی کرتا رہے اس کے جواب میں مرزا کہتے ہیں کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرجاتا تو کوئی دن آہ و فغاں اور کرتا رہتا۔ باوجود تاکید لفظی کے

(جس کو فارسی والوں نے جائز قرار دیا ہے) دونوں مصرعے عجب پُرلطف اور معنی خیز واقع ہوئے ہیں۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

نالے۔ یعنی ندی نالے۔ نہ آہ و نالہ۔ مثال کس قدر مثل لہٗ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رُکتی ہے اسی قدر راہ دیتی ہے۔ خصوصًا جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت مؤثر اور درد انگیز ہوتا ہے (از یادگار غالب)

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

فرماتے ہیں۔ دنیا میں اور شاعر بھی بہت اچھے اچھے ہیں۔ لیکن یہ بات مسلّمہ ہے۔ سب لوگ اتفاق کے ساتھ کہتے ہیں کہ مرزا غالب کا اندازِ بیان سب سے جُداگانہ ہے (یہ بات مرزا صاحب کی خصوصیات سے ہے)

غزل

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر — تغیّر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

فرماتے ہیں جس طرح آئینہ بیکار اور معطل پڑے رہنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم کر اس کو بدرنگ اور میلا کر دیتی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے جو آدمی زیادہ مشہور اور کام کے سمجھے جاتے ہیں وہ ہی زیادہ موردِ آفات و بلا رہتے ہیں۔

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی — ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

فرماتے ہیں۔ میری وحشت مزاجی سامانِ عیش و جاہ سے بھی نہ مٹ سکی اور اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ زمردی پیالہ بھی میری نگاہ میں چیتے کا داغ بن گیا۔ مطلب یہ ہے دنیا میں خوش و خُرم رہنا دولتمندی کے سبب سے نہیں ہوا کرتا ہے۔ یہ خدا کی دین ہے جس کو وہ چاہتا ہے غریبی اور مفلسی میں بھی دل شاد رکھتا ہے۔

غزل

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

فرماتے ہیں۔ میں اپنی عریانی کا منت پذیر ہوں کہ اس نے میرے جنون کی مدد کی ہے اس لئے چاک گریباں کا حق یعنی احسان میری گردن پر ہو گیا ہے۔ اگر گریبان چاک نہ ہوتا تو میرا جنون کی کچھ مدد نہ کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ آثار جنون بغیر چاک گریبان کے ثابت نہیں ہوا کرتے۔

بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی ہزار آئینہ دل باندھے ہے یک بالِ تپیدن پر

فرماتے ہیں۔ جس طرح جلے ہوئے کاغذ میں ستارے سے چمکنے لگتے ہیں، اسی طرح شعبدہ بازِ بیتابی نے ہزاروں آئینے میرے دل کے بازوؤں پہ باندھ دیئے ہیں۔ ایک تڑپ کے ساتھ ہزاروں نقطہ ہائے روشن نمودار ہو جاتے ہیں۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضہ ہے متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاعِ بُردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع۔ یہ مضمون بھی بالکل واقعیات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں۔ اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا (از یادگارِ غالب)

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فرماتے ہیں۔ ہم کو اس بے سبب رنج آشنا دشمن سے کام پڑا ہے جو آفتاب کی شعاع کو دیکھ کر نظر کی تہمت چشمِ روزن پر رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے شعاعِ مہر جو روزنِ دیوار سے آتی ہے اسکو دیکھ کر میرا معشوق مجھ سے لڑتا ہے کہ تو نے روزن دیوار سے مجھ کو جھانکا تھا۔ یہ شعاعِ مہر نہ تھی بلکہ تیری نظر تھی۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہو اپنی حقیقت کا فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

فرماتے ہیں۔ فنا فی اللہ ہو کر فروغِ معرفت حاصل کرنا چاہیئے اور اس کی مثال یہ پیش کرتے

ہیں کہ جس طرح گھاس وغیرہ بھاڑ میں جھونکنے کے بعد شعلہ بن کر روشن ہو جاتی ہے اسی طرح فنا فی اللہ ہو کر حقیقت عرفاں ظاہر ہو جاتی ہے۔

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے   کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

فرماتے ہیں۔ اسدؔ کے حال پر تعجب آتا ہے کہ وہ ایسے انداز کا بسمل ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ خود قاتل سے کہتا ہے کہ تو مشقِ ناز اسی طرح جاری رکھ اور لوگوں کو قتل کرتا رہ، خونِ دو عالم میری گردن پر ہو گا۔ تجھ سے اس کی باز پرس نہ ہو گی۔

غزل

تمکش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں   تکلف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر

فرماتے ہیں۔ میں جو تیرے ستم اٹھا رہا ہوں ایک مصلحت سے اُٹھا رہا ہوں اور وہ مصلحت یہ ہے کہ تجھ پر حسین عاشق ہیں۔ اگر تو مجھے نہیں ملتا تو ان میں سے یعنی حسینوں میں سے کوئی نہ کوئی تجھ جیسا رقیب ضرور مل جائے گا۔

غزل

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور   تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

یہ ساری غزل زین العابدین خاں المتخلص بہ عارف کے نوحہ میں ہے۔ عارف سے مرزا صاحب کو غایت درجہ کا تعلق تھا کچھ تو قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے۔ باوجود کم گوئی کے نہایت خوش گو تھے۔ ان کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے تو مرزا صاحب نے اُن کے مرنے پر یہ غزل بطور نوحہ کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور درد ناک ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ ہی تم کو مرنا تھا اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے اور تم نے راہِ عدم تنہا طے کی تو اب اور کچھ دن تنہا رہو۔

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا   ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ اگر تیرا سنگِ مزار نہ گھسے گا تو میرا سر ضرور مٹ جائیگا۔ تیرے مزار پر میری ناصیہ فرسائی ہمیشہ کے لئے نہیں ہے بلکہ چند دن کے لئے ہے تھوڑے دنوں کے بعد اِن دونوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو جائے گی۔

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ تمہیں دنیا میں آئے ہوئے زمانہ ہی کیا گزرا ہے۔ گویا کل ہی تو آئے تھے۔ اور آج ہی یہ کہہ رہے ہو کہ جاؤں۔ میں نے مانا کہ ہمیشہ یہاں نہ رہو گے لیکن کوئی دن اور ٹھہرو مرنے میں ایسی جلدی کیوں کرتے ہو۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ تمہاری رخصت کا وقت ہمارے لئے قیامت کا سامنا ہے۔ تم یہ کیا کہتے ہو کہ اب ہم قیامت کے دن ملیں گے۔ کیا قیامت کا کوئی دوسرا دن بھی ہے۔ بہت ہی بلیغ شعر کہا ہے۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مرزا صاحب نے مسطورہ بالا اشعار میں عارف مرحوم کو مخاطب کیا ہے۔ اس شعر میں ہاں کا لفظ فلک کو مخاطب کرنے سے پہلے بطور یاد دہانی استعمال ہوا ہے اِس ہاں کو اقرار سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی ہاں نہیں کی ضد نہیں ہے۔ آسمان سے یہ شکایت کرنی منظور تھی کہ مرنے والا ابھی تو جوان تھا، عمرِ طبعی کو نہ پہنچا تھا۔ اگر وہ اور کچھ دن زندہ رہتا تو تیرا کیا نقصان تھا۔

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ تم تو میرے گھر کے لئے چودھویں رات کے چاند کا حکم رکھتے تھے۔ تم سے میرے گھر میں اُجالا رہتا تھا، اگر میری یہ بات غلط ہے تو پھر وہ نقشہ گھر کا تمہارے بعد کیوں نہ رہا۔ چاروں طرف اندھیرا کیوں چھا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بدرِ کامل رفتہ رفتہ کم ہو کر چھپا کرتا ہے

تم دفعتاً میری آنکھوں سے غائب ہو گئے یہ کیا ستم ہوا۔

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے　　کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ تم لین دین کے اتنے تو کھرے نہ تھے کہ ملک الموت کے تقاضے پر فوراً ہی تم نے اپنی جان دیدی۔ اُسے اور کچھ دن تقاضا کرنے دیتے۔

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی　　بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

نیّر سے مراد یہاں نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر المتخلص بہ نیّر درخشاں رئیس لوہارو ہیں جو عارف مرحوم کو مرزا صاحب سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ باقی شعر صاف ہے۔

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش　　کرنا تھا جوانمرگ گزارا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ جس طرح اب تک تم نے عمر کا حصہ زمانہ کی خوشی اور رنج میں گزارا تھا، اسی طرح اور کچھ دن دنیا میں بسر کرنے تھے، جوانی کے عالم میں کیوں مر گئے۔

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ　　قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ تم لوگ نادان ہو جو یہ کہتے ہو کہ عارف سے جوانمرگ کا داغ اُٹھا کر اے غالبؔ تم کیوں زندہ ہو، مر کیوں نہیں جاتے۔ میں اِس لئے نہیں مرتا کہ میری قسمت میں ابھی کچھ دن مرنے کی آرزو میں جاں بلب رہنا لکھا ہوا ہے۔

ردیف ز

غزل

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبحِ مہر　　ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

اس شعر میں چاکِ کفن کو صبح سے اور داغِ عشق کو آفتابِ صبح سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں مر جانے کے بعد بھی مصائبِ عشق سے فارغ البال نہیں ہوں۔

ہے نازِ مفلسانِ زرِ از دست رفتہ پر　　ہوں گلفروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز

فرماتے ہیں۔ جس طرح مفلس لوگ دولت اپنی برباد کر کے فخریہ اپنے اسراف کا بیان کیا کرتے ہیں، اسی طرح میں اپنے داغ عشق کو کھو کر اس کا ذکر کیا کرتا ہوں۔

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں　　خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز

فرماتے ہیں۔ میخانۂ جگر میں یہاں اب شراب عشق کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں خاک اڑ رہی ہے۔ یعنی سب خون صرف ہو چکا۔ مگر میرے خون کا پیاسا معشوق ابھی تک انگڑائیاں لئے جاتا ہے کہ نشہ نہیں ہوا اور پلا۔

غزل

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز　　دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

میرزا صاحب نے اس مطلع میں بالکل نئی شوخی برتی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔ فرماتے ہیں۔ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا۔ ناچار اب یہی دعائیں مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو (اقتباس از یادگار غالب)

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود　　ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

فرماتے ہیں۔ وجود ماسوائے اللہ میں بیکار ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ معلوم ہوا ابھی تک تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ابھی تک تیرا تصور ناتمام اور ناقص ہے۔

وصال جلوہ تماشا ہے پہ دماغ کہاں　　کہ دیجئے آئینۂ انتظار کو پرواز

فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وصال یار جلوۂ حسن کے نئے نئے تماشے دکھایا کرتا ہے لیکن ہم یہ دماغ کہاں سے لائیں کہ بیٹھے ہوئے آئینۂ انتظار کو صیقل کیا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ تماشائے جلوۂ حسن کی تمنا کرنی تو آسان ہے مگر انتظار کی سختیاں کھینچنی بہت کٹھن بات ہے۔

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست　　گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

فرماتے ہیں۔ عاشق کی خاک کا ایک ایک ذرہ آفتاب پرست ہے۔ خاک ہو جانے کے بعد بھی

جلوۂ ناز کی آرزو نہ مٹی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خاک کے ذرے آفتاب کی شعاعوں کے مقابل ہو کر چمکنے لگتے ہیں اسی طرح خاک عاشق کے ذرات آفتابِ حسنِ یار سے کسبِ ضیا کرتے ہیں۔

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ　　جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ میخانۂ جنوں کی وسعت کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ مختصر بتائے دیتا ہوں کہ یہ آسمان کا پیالہ وہاں ایسا ہے جیسے کوڑا پھینکنے کا برتن ہوتا ہے۔

قطعہ

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک　　گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

میرزا صاحب نے اس شعر میں اہلِ کرم کی شان کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کریموں کو بذل ایثار سے کسی حالت میں دست بردار نہ ہونا چاہیئے بلکہ کرم و بخشش کا شیوا ابرِ گہربار سے سیکھنا چاہیئے۔ باوجودیکہ ابر گہربار آبلہ پا ہوتا ہے (پانی کے قطروں کی رعایت سے جو بادل میں ہوتے ہیں، ابر کو آبلہ پا کہا گیا ہے) پھر بھی فیض رسانی کے لئے جنگل جنگل اور شہر شہر مینھ برساتا ہے۔

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت　　نقش پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

فرماتے ہیں۔ میری گرمیِ رفتار کا اثر ابھی تک میرے نقش پا میں اس قدر باقی ہے کہ صفحۂ دشت آتش زدہ بن گیا ہے۔

قطعہ

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں۔ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا اسلئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنی تو عین ایمان ہے پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے (از یادگار غالبؔ)

ہے ترے تیر کا پیکان عزیز دل سے نکلا یہ نہ نکلا دل سے

فرماتے ہیں۔ یترے تیر کا پیکاں بظاہر تو میرے دل سے نکل گیا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ ابھی دل سے نہیں نکلا یعنی اس کی جگہ اس کی محبت دل میں اسی پیکان کی طرح کھٹک رہی ہے جو ٹوٹ کر دل میں رہ گیا تھا اور تونے اُسے نکال لیا ہے۔

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز تاب لائے ہی بنے گی غالب

مرزا صاحب کا یہ مقطع بھی عارف مرحوم کی موت کے افسوس میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے غالب اس سختی کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ واقعہ تو سخت ہے اور جان عزیز ہے۔ یعنی واقعہ کی سختی تو یہ کہتی ہے کہ جان دیدینی چاہیئے اور جان ایک ایسی عزیز شے ہے کہ انسان کسی حال میں اس کا دینا گوارا نہیں کرتا۔

غزل

میں ہوں اپنی شکست کی آواز نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

فرماتے ہیں۔ میری پُر درد نے گلِ نغمہ اور پردۂ ساز سے تعلق نہیں رکھتی ہے۔ میں تو ایک سراپا درد ہوں۔ میری آواز تو گویا میرے دل کے ٹوٹنے کی صدا ہے۔

میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز تو اور آرائشِ خمِ کاکل

فرماتے ہیں۔ تجھے تو صرف آرائش کی غرض سے کاکلوں میں پیچ و خم ڈالنے سے کام ہے۔ اور مجھ کو اس آرائش سے طرح طرح کے خوف اور اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔ یعنی میں سمجھتا ہوں کہ اب دیکھئے کتنے نئے نئے عاشق پیدا ہوتے ہیں اور کس قدر رقیبوں کا ہجوم مجھ پر ہوتا ہے۔

ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز لاف تمکیں فریب سادہ دلی

فرماتے ہیں۔ ہمارے یہ تمکین کے دعوے ہماری سادہ دلی کے فریب ہیں اس لئے کہ ہمارے سینہ میں تو ہزاروں رازِ دل گداز بھرے ہوئے ہیں۔ ہم سے کب تک اس کا ضبط ہوگا۔ اور ہم کیونکر ان رازوں کو چھپا سکیں گے۔ یہ تو ایک نہ ایک دن طشت از بام ہو ہی جائیں گے۔

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد   ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

فرماتے ہیں۔ دنیا کی محبت نے مجھ کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ اگر میں چاہوں تو ان تعلقات سے آزادی حاصل کر سکتا ہوں۔

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے   ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

فرماتے ہیں۔ خدا ایسا کرے کہ وہ بھی دن مجھے نصیب ہو جائے کہ بجائے حسرتِ ناز کھینچنے کے اس ستمگر سے میں بھی ناز کروں۔

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں   جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

فرماتے ہیں۔ ایک خون کا قطرہ بھی میرے دل میں ایسا نہیں ہے جس سے پنجہ مژگاں نے گلبازی نہ کی ہو۔ گلبازی ایک قسم کا کھیل ہے جو گلاب یا گیندے کے پھولوں سے کھیلا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی کا شعر ہے۔ ؎

رتبہ گل بازی کا دل کاش تو پاتا   ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اٹھاتا

مطلب یہ ہے کہ خونِ دل تمام و کمال پلکوں سے ٹپک گیا۔

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز   اے ترا ظلم سر بسر انداز

فرماتے ہیں۔ تیرا غمزہ سراسر ناز کا کام دیتا ہے اور تیرا ظلم سر بسر انداز۔

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو   ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

فرماتے ہیں۔ تو آ گیا اور میں تجھے دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا۔ میرا سجدہ کرنا تجھ کو مبارک ہو۔

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا   میں غریب اور تو غریب نواز

اِس شعر میں کچھ غضب نہ ہوا کے جملے نے عجیب پُر لطف معنی پیدا کر دیے ہیں۔ اہلِ زبان مہربانی کے موقع پر طنزاً اس کا استعمال کرتے ہیں۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا   اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

فرماتے ہیں۔ اسد اللہ خاں تمام ہوا یعنی مر گیا۔ ہائے افسوس وہ رند شاہد باز کیا بے مثل آدمی تھا

ردیف (س)

غزل

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے　　دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

پرند جانور پکڑنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ جال لگا کر اس کے قریب قفس میں اسی قسم کے ایک طائر کو بند کر کے رکھ دیتے ہیں۔ طائر گرفتار کی آواز پر اس کے ہم جنس طائر آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ جال پر دانہ بچھا ہوا دیکھ کر کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں، صیاد جال کھینچ لیتا ہے۔

جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا!　　جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم نے لہو کی ندی ایک ایک کانٹے کے پاس لطف خلش اُٹھانے کے لئے اپنے تلوؤں سے بہا دی لیکن جگرِ تشنۂ آزار کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی اور تکلیف اُٹھانے سے اس کا جی نہ بھرا۔ ملک الشعراء میر تقی میر فرماتے ہیں:-

نہ تسلی ہوا دلِ بے تاب　　نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے　　خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

تے کی ردیف میں بھی اسی مضمون کا ایک شعر لکھا جا چکا ہے۔ اور وہ یہ ہے:-

مُنہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ　　یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

اس شعر میں مرزا صاحب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ضعف و نقاہت کے سبب سے حالتِ انتظار میں جب آنکھیں کھلے رہنے سے معذور ہو گئیں اُس وقت تم اپنے عاشقِ بیمار کے پاس آئے۔ اب ہم جی بھر کے تم کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے　　دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

فرماتے ہیں۔ غمخوار کے طعنوں اور ملامت و فہمایش نے کند خنجر سے مجھ کو قتل کر ڈالا۔ میں کیوں سسک سسک کر جان دیتا اگر اس کے پاس اس زبان کے بدلے ایک تیز چھری ہوتی۔

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل	نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

فرماتے ہیں۔ اے دل شیر کے منہ کا لقمہ بن جانا اس سے بہت بہتر ہے کہ کسی معشوق دل آزار سے دل لگایا جائے۔

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے	خود بخود پہنچے ہے گُل گوشۂ دستار کے پاس

فرماتے ہیں۔ تجھے دیکھ کر چمن کی قوت نامیہ اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ پھول خود بخود بڑھ کر تیری دستار تک پہنچ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے دیدار سے سب کے دلوں میں ولولۂ شوق پیدا ہو جاتا ہے۔

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے	بیٹھنا اُسکا وہ آکر تری دیوار کے پاس

فرماتے ہیں۔ ہائے افسوس اپنا سر پھوڑ کر غالبِ وحشی مر گیا۔ مگر ہم کو اب تک وہ اس کا تیری دیوار کے پاس شوقِ دیدار میں آکر بیٹھنا یاد آتا ہے۔ کیا بے نظیر مقطع لکھا ہے۔

ردیف (ش)

غزل

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے	لگادے خانۂ آئینہ میں رُوئے نگار آتش

فرماتے ہیں۔ آئینۂ فولادی اگر تیرے سبزۂ خلا سے تر و تازگی نہ حاصل کرتا رہے اور اس میں طراوت نہ پہنچتی رہے تو تیرے شعلۂ رخسار کا عکس خانۂ آئینہ میں ضرور آگ لگا دے۔

فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق	نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

فرماتے ہیں۔ فروغِ حُسن سے عاشق کی مشکل حل ہو جاتی ہے اور مثال یہ دیتے ہیں کہ پائے شمع سے کانٹا کبھی نہ نکلے۔ اگر آگ اُس کو نہ نکالے۔ شمع کے ڈورے کو خارِ شمع کہتے ہیں اور اس خار کا نکلنے والا شعلۂ شمع کو بتایا ہے۔ بالکل نیا خیال ہے اور بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

ردیف (ف)

غزل

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش   مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

فرماتے ہیں۔ رقیب کے خوف سے میں بیہوش بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ بیہوش ہو جانے کی حالت میں رازِ عشق سے خبردار ہو جائے گا۔ افسوس ہے کہ مجھ کو اپنے ہوش پر بھی اختیار نہیں۔ انتہا کی مجبوری یہ ہے کہ میری خوشی پر یار ادہٴ رقیب کا ڈر غالب آگیا۔ مطلب یہ ہے کہ جی تو یہی چاہتا ہے اور موقع بھی ایسا ہی ہے کہ بیہوش ہونا ضروری سمجھا گیا ہے مگر افشائے راز کے خیال سے ایسا نہیں کر سکتا۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے   اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

فرماتے ہیں۔ اس بات کے تصور سے دل جلتا ہے کہ ہم باوجود آہِ شعلہ بار رکھنے کے اکبار جل نہیں جاتے۔ جو آگ سینہ میں مشتعل ہے اس کا تو یہی تقاضا تھا کہ ایک ہی دفعہ جل کر خاکستر ہو جائیں لیکن ناتمامی اور نامرادی ایک بار جل جانے سے روکتی ہے۔

ردیف (ک)

غزل

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک   کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

فرماتے ہیں۔ لڑکے مجھے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے ہیں اور ان پتھروں سے زخم بدن پر ہو جاتے ہیں۔ لڑکے اتنے بے پروا ہیں کہ زخموں پر نمک نہیں چھڑکتے۔ اگر پتھر میں نمک ہوتا یا یہ پتھر نمک سنگ کے ٹکڑے ہوتے تو بڑا لطف آتا۔ یعنی جسم پر زخم بھی پڑتا اور نمک بھی چھڑک دیا جاتا۔

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل — ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

فرماتے ہیں۔ زخمِ دل کے لئے باعثِ نازش گردِ راہِ یار ہے۔ ورنہ نمک تو دنیا میں بہت کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور بہت ارزاں بکتا ہے لیکن زخمِ دل پر نمک سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو یار کے رستے کی خاک زخموں میں بھر کر مزا دیتی ہے۔

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہوجیو — نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

اِس شعر میں لف و نشر مرتب ہے یعنی مجھ کو ارزانی رہے نالۂ بلبل کا درد اور تجھ کو مبارک ہوجیو خندۂ گل کا نمک۔

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج — گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

فرماتے ہیں۔ کس گوہرِ دریائے لطافت نے دریا کی ریتی میں گھوڑے کو کاوے ایڑن پھیرا تھا کہ جس کے ٹاپوں کی گرد موجۂ دریا کے زخموں میں نمک کا کام دے رہی تھی مطلب یہ ہے کہ میرے معشوق کا گھوڑا موجِ دریا سے بھی تیز رفتار اور سبک عناں تھا جس کے رشک نے موجۂ دریا کے زخموں میں نمک چھڑک دیا۔

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ — یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

فرماتے ہیں۔ میرا معشوق جہاں کہیں نمک کو دیکھتا ہے مجھے یاد کر لیتا ہے، یعنی بے اختیار اُس کو میں اور میرا زخمِ جگر یاد آجاتا ہے جس میں وہ نمک بھرا کرتا ہے اور جب میں یاد آتا ہوں تو میرے زخمِ جگر کی تعریف بھی کرتا ہے۔

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے — دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

فرماتے ہیں۔ ایسے وقت میں تنِ مجروحِ عاشق کو چھوڑ کر تیرا جانا افسوس کے قابل ہے۔ کہ جب دل تو زخم کا طلب گار ہے اور اعضائے جسم نمک کے خواستگار یعنی نہ ابھی زخموں میں نمک بھرا ہے اور نہ دل میں کوئی زخم لگایا ہے۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد — زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

فرماتے ہیں. غیر کا منت پذیر ہونا میں پسند نہیں کرتا اور وہ بھی درد کی رعایت سے میرا زخم خندۂ قاتل کی طرح سرتاپا نمک ہے۔

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں　　زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

فرماتے ہیں اے غالبؔ تو میرا قدیمی دوست و غمخوار ہے ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ تجھے وہ دن بھی یاد ہیں کہ جب میرے زخموں میں سے نمک کے ذرّے گر پڑتے تھے تو میں پلکوں سے چنا کرتا تھا۔ اس بیان میں دو خوبیاں پیدا ہو گئیں۔ ایک یہ کہ میں اتنا ایذا دوست تھا کہ میرے زخم سے جو حصّہ نمک کا کم ہو جاتا تھا میں اُس کو شوق کے ساتھ چن کر پھر زخم میں بھر لیتا تھا۔ دوسری یہ خوبی ہے کہ نمک زمین پر گرے تو پلکوں سے اُٹھانا چاہیئے اس مشہور بات کی طرف اشارہ ہے۔

غزل

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

فرماتے ہیں۔ آہ کو ایک عمر چاہیے کہ اثر پیدا کرے اور جب تک آہ میں اثر پیدا نہ ہوگا اور تیری زلف ہمارے حالِ پریشاں سے خبردار نہ ہو گی ہم اُس وقت تک کب زندہ رہ سکتے ہیں۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (از یادگارِ غالبؔ)

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب　　دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

فرماتے ہیں۔ عاشقی صبر طلب کام ہے اور تمنّا جلدی کر رہی ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو کامیاب ہونا چاہیئے میں دل کو کیونکر صبر دوں اور ٹھہراؤں جگر۔ مطلب یہ ہے کہ جب جگر خون ہو جائیگا اُس وقت آہ میں اثر آئے گا اور کامیابی کی صورت نظر آئے گی۔ عشق ایسی شے نہیں ہے کہ آج ہی آدمی عاشق ہوا اور آج ہی معشوق پر اس کا اثر ہو جائے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن　　خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

اِس زمین میں ایسا صاف اور بے مثل شعر نکالنا مرزا ہی جیسے کامل فن کا کام تھا، فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم نے مانا کہ تم تغافل کو کام میں نہ لاؤ گے اور جلد چلے آؤ گے مگر تم تک خبر پہنچتے پہنچتے تو ہم خاک ہو جائیں گے اس کا کیا علاج ہے۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

فرماتے ہیں۔ جس طرح آفتاب کی گرمی سے شبنم بھاپ بن کر اُڑ جاتی ہے میں بھی اسی طرح تیری ایک نظرِ عنایت میں فنا ہو جاؤں گا۔ مطلب یہ ہے میری ہستی شبنم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی نہ مجھے اس سے زیادہ قیام و ثبات رہ سکتا ہے۔

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل　　گرمیِ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہونے تک

فرماتے ہیں۔ اے غافل فردِ انسان۔ ایک نظر سے زیادہ ہستی کا وقفہ نہیں ہے اور اسکی مثال پیش کرتے ہیں کہ گرمیِ بزم یعنی بزم ہستی کی گرماگرمی اِک رقصِ شرر ہونے تک ہے جسطرح شررِ آتش چمک کر بُجھ جاتا ہے اِسی طرح انسان دم بھر میں فنا ہو جانیوالی ہستی رکھتا ہے۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اِس شعر میں مرزا صاحب نے انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اس کو غم سے نجات نہیں ہوتی، شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جبتک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے، ایسی بدیع و نادر تشبیہات مرزا صاحب کے سوا دوسرے شخص کو سوجھتی ہی نہیں۔

ردیف (گ)

غزل

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ　　یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو دعا قبول ہونے کا یقین ہے تو پھر دعائیں مانگ کر کیوں تضیعِ اوقات

کرتا ہے۔ بغیر کے معنی یہاں سوا کے ہیں یعنی ایک دلِ بے مدعا کے سوا اور کچھ نہ مانگ جب دلِ بے مدعا عطا ہو گیا پھر کسی چیز کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ اس دعا سے بڑھ کر اور کوئی دعا ہو ہی نہیں سکتی۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اِس شعر میں نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور در پردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیئے ہیں اور شمار میں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں ان کی گنتی یاد آتی ہے گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں (از یادگار غالب)

ردیف (ل)

غزل

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

فرماتے ہیں۔ بلبل اس فریب اور دھوکے میں اپنی جان دے دیتی ہے کہ گل میں وفاداری کی صفت کو ثبات و قیام ہے۔ پھولوں کو دیکھو کہ وہ بلبل کی اس غلط فہمی پر خندہ زن ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہر عاشق کی نگاہ میں ہر معشوق ایک غیر فانی ہستی ہے۔

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

ہوائے گل۔ شوقِ گل۔ فرماتے ہیں۔ آزادیِ نسیم۔ نسیم سے یہاں بوئے گل مراد ہے یعنی

بوئے گُل کو آزادی مبارک ہو۔ حلقہ ہائے دامِ گل ٹوٹے پڑے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے۔ کہ غنچہ دل کھل گیا اور بوئے گل قید سے آزاد ہو گئی۔

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا　　اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

ہر شخص موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا، یعنی فریفتہ ہو گیا۔ افسوس ہے نالۂ لبِ خونی نوائے گل پر۔ مطلب یہ ہے کہ رنگِ گل درحقیقت گُل کا نالہ خونچکاں اور فریاد دلخراش ہے، جس کو لوگوں نے غلطی سے موجِ رنگ سمجھ لیا ہے اور اس پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔

خوشحال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو　　رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گُل

فرماتے ہیں۔ بڑا خوش نصیب ہے اس کا کیا کہنا ہے جو شراب خوار معشوق کے قدموں پر سر رکھے ہوئے عرض تمنا کر رہا ہو۔ اس شعر میں عاشق بدمست کو شاخ گل سے اور معشوق کو گل سے تشبیہ دی ہے۔

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار　　میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل،

فرماتے ہیں۔ بہار نے پھولوں کو چمن میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ یہ تیرے گلے کا ہار ہوں۔ اور تیرے بستر پر تیرے ساتھ رات بھر سوتے رہیں اور میں دیکھ کر جلوں۔ معلوم ہوا کہ نفس عطر سائے گُل میرا رقیب ہے۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے　　مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

فرماتے ہیں۔ اگر میرا شیشہ شراب سے خالی ہوتا ہے اور دل میں کبھی سیر شوق گل نہیں ہوتا تو یہ دونوں باتیں مجھ کو بادِ بہاری سے شرمندہ کر دیتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ موسمِ بہار میں شراب شیشہ میں ہونی لازمی ہے اور دل میں سیر باغ کا شوق ہونا ضروری ہے

سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غرور کی　　خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل

فرماتے ہیں۔ تیرے رعب حُسن غیور کے جلوہ سے میری نگاہ میں ادائے گل کا رنگ خون بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے چونکہ تیری غیرت یہ نہیں چاہتی کہ میرا عاشق کسی دوسرے معشوق پر فریفتہ

ہو۔ اس لئے پھول کی رنگت میری آنکھوں میں خون کا حکم رکھتی ہے۔

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکہ کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

فرماتے ہیں۔ جب کوئی پھول کھلتا ہے تو اور کلیاں یہ سمجھ کر کہ تو پھول کے پردہ میں جلوہ گر ہوا ہے۔ پھول بن کر سلسلہ وار کھلنی شروع ہو جاتی ہیں اور اس سلسلے کو دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک پھول کے پیچھے دوسرا پھول بھاگتا آرہا ہے۔

غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

فرماتے ہیں۔ اے غالب مجھ کو اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو پھول نے اپنا زیب گریباں بنایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شاہد حقیقی کے خیال میں پھول اپنی زیب و زینت کرتے ہیں میں اس سے ہم آغوشی کی تمنا رکھتا ہوں یعنی اس سے وصال کا خواہشمند ہوں۔

ردیف (م)

غزل

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

فرماتے ہیں۔ ہم آزاد لوگ ہیں۔ ہم کو غمِ دنیا دم بھر سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ماتم خانہ میں بجائے شمع کے بجلی کام دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح بجلی ایک آنِ واحد میں چھپ جاتی ہے اسی طرح ہمیں غم کا خیال آکر فوراً مٹ جاتا ہے یعنی اس کا اثر تھوڑی دیر بھی باقی نہیں رہتا۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

فرماتے ہیں۔ اب تک جو محفلیں برہم ہو چکی ہیں ان کو گنجفہ بازِ خیال یاد دلاتا ہے۔ ہم گویا نیرنگ بت خانہ کی ورق گردانی میں۔ مطلب یہ ہے کہ حسینوں کی محفلیں جو برہم ہو چکی ہیں اب تک ہمارے خیال میں ہیں اور ہر وقت خیال میں رہا کرتی ہیں۔ گنجفہ کی ورق گردانی سے مطلب

یہ ہے کہ جس طرح گنجفہ کھیلنے والے پتّوں کو بار بار انگلیوں میں پھیلا کر دیکھتے رہتے ہیں اور تمام بازیوں کے ورق شمار کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح گزری ہوئی محافل نشاط کی تصویریں جن کو ہم نیرنگِ بُت خانہ سمجھتے ہیں ہمارے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ یہ تشبیہ بالکل نئی تشبیہ ہے جو آج تک کسی کے کلام میں نہیں دیکھی گئی۔

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

فرماتے ہیں کہ دلِ پروانہ میں جس شمع کے شوق نے روشن ہو کر اس قدر ہنگامہ آرائی کی ہے وہ ایسا مستور اور پوشیدہ ہے کہ اس کے لئے پیدائی اور ظہور کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا ہی حال ہماری ہستی کا ہے کہ ہنگامہ بہت کچھ ہے مگر ہستی کا کہیں نشان بھی نہیں ہے یعنی حقیقت میں ہستی اگر ہے وہ ایک ہے۔

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

فرماتے ہیں۔ ہم نے جو جستجو کو ترک کر دیا ہے قناعت کے سبب سے نہیں کیا ہے بلکہ جستجو کی طاقت ہم میں باقی نہیں رہی ہے اِس واسطے ہم ہمت مردانہ کی تکیہ گاہ کے لئے وبال بن گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مَردوں کا یہی کام ہے کہ ہمت کو اپنا تکیہ گاہ بنائیں لیکن یہاں برعکس معاملہ پیش آیا ہے۔

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

فرماتے ہیں۔ ہم اپنے سینۂ پرخوں کو جیل خانہ سمجھتے ہیں اس لئے کہ ہمارے سینے میں لاکھوں تمنائیں عمر بھر کے لئے قید ہو گئیں ہیں نہ اب تک کبھی نکلیں نہ آئندہ زندگی بھر ان کے نکلنے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سی آرزوئیں ہمارے دل میں ایسی ہیں جن کا نکلنا صرف خدا کے فضل پر منحصر ہے۔

غزل

بنالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

مرزا صاحب تعلقات دنیا کی مذمت ان لفظوں میں فرماتے ہیں کہ اگر تجھے دنیا سے دل بستگی ہے تو نالہ کشی اختیار کر اِس لئے کہ خانۂ زنجیر میں جو کچھ مال و دولت ہے وہ فقط صدائے شیون و فریاد ہے اور کچھ بھی نہیں۔ تعلق خاطر کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے۔

قطعہ

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور　　رکھ لی مِرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس پر خدا کا شکر اس لئے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں، اِس واسطے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کس رتبے کا آدمی تھا لیکن وطن میں جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو مگر خریدار و غمخوار ایک بھی نہ ہو وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی پس خدا کا شکر ہے کہ اُس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے، جس کو ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے (از یادگار غالب)

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اَے خدا　　رکھ لیجیو مرے دعوئے وارستگی کی شرم

فرماتے ہیں۔ اس کی گھونگر والی زلفیں میری گھات میں ہیں۔ اے خدا اب میرے دعوے وارستگی کی شرم تیرے ہاتھ میں ہیں۔ تو میری شرم رکھ لینا مطلب یہ ہے اگر زلفوں میں اسیر ہو گیا تو دعوئے میرا آزادگی و وارستگی باطل ہو جائے گا۔

ردیف (ن)

غزل

لوں دام بخت خفتہ سے یک خوابِ خوش وَلے　　غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

فرماتے ہیں بختِ خفتہ سے ایک رات کی نیند قرض لے تو لوں لیکن اے غالبؔ یہ خوف

ہے کہ اِس قرضہ کو ادا کہاں سے کروں گا۔ مطلب یہ ہے کہ قسمت تو سو رہی ہے اور میری آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ اگر اپنے مقدر سے ایک گھڑی نیند قرض لے لوں تو لے سکتا ہوں لیکن یہ قرضہ ادا کیونکر ہو گا یعنی میں تو دولتِ خواب سے محروم ہی ہوں۔

غزل

وہ فراق اور وہ وصال کہاں　　وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرماتے ہیں۔ وہ زمانہ ہمارا باقی نہ رہا اور وہ فراق کی راتیں بھی کٹ گئیں جن کا کاٹنا پہاڑ کاٹنے سے زیادہ دشوار تھا اور وہ وصل کے لطف بھی مِٹ گئے جو اب یاد آتے ہیں۔ وہ راتیں، وہ دن، وہ مہینے، وہ سال کہاں چلے گئے جس میں فراق و وصال کے رنج و عیش اٹھائے تھے اور وہ شوق بھی باقی نہیں رہا۔ یہ ساری غزل مسلسل اسی مضمون میں نظم کی گئی ہے۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے　　ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟

فرماتے ہیں۔ وہ شوق کی مشغولی اب کس کو ہے اور وہ نظارۂ جمال کا ذوق و شوق اب کہاں ہے۔

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا　　شورِ سودائے خط و خال کہاں

فرماتے ہیں۔ وہ دل جس میں عشق سما گیا تھا وہ اگر مِٹ گیا تو مٹ جائے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ دماغ بھی باقی نہ رہا جس میں سودائے خط و خال تھا۔

تھی وہ اِک شخص کے تصور سے　　اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

فرماتے ہیں۔ یہ ساری باتیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ایک شخص کے تصور سے تھیں۔ اب وہ خیال کی بلند پروازیاں اور رنگینیاں کہاں باقی ہیں۔

ایسا آساں نہیں لہو رونا　　دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

فرماتے ہیں۔ اب لہو رونا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ یعنی عشق کے مصائب کی انتہا ہو چکی اور خونِ دل و جگر تمام و کمال صرف ہو جانے سے نہ دل میں طاقت باقی رہی نہ جگر میں حالت۔

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق　　واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

فرماتے ہیں ہم سے قمار خانۂ عشق ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ اب وہاں جاکر کیا کریں جب گرہ میں مال ہی نہ رہا یعنی نقدِ دل سکۂ داغ دولتِ صبر کچھ بھی پاس نہ رہا۔ اب داؤں کس مال پر لگائیں اور جُوا کس برتے پر کھیلیں۔

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں   میں کہاں اور یہ وبال کہاں

فرماتے ہیں۔ میں تو عشق کا بندہ تھا۔ غمِ عشق سے کام پڑتا تھا۔ ہجر کے مصائب اٹھاتا تھا وصل کی لذتیں لوٹتا تھا۔ مجھ کو غمِ دنیا سے کیا سروکار۔ میں اس وبال کو کیا سمجھتا تھا۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ   وہ عناصر میں اعتدال کہاں

فرماتے ہیں۔ جوانی کا زمانہ گزر گیا۔ اعتدال کا وقت اب کہاں رہا۔ شباب کی مدت اب ختم ہوگئی۔ قویٰ میں اضمحلال شروع ہوگیا۔

غزل

کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہیں   ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

فرماتے ہیں معشوق نے جو ہم سے وفاداری کا برتاؤ برتا ہے تو رقیب اس کو جفا کہتے ہیں۔ یہ تو قدیم دستور چلا آتا ہے کہ اچھے لوگوں کو دشمن یا حاسد بُرا کہا کرتے ہیں۔

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے   کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

فرماتے ہیں۔ آج ہم اپنے دل کی پریشانی کا حال اُن سے کہنے کے ارادے سے اُن کے پاس جاتے ہیں۔ مگر دیکھنا چاہئے کہ وہاں جاکر کیا کہتے ہیں۔ اس شعر میں دو معنی پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے سامنے پہنچکر ہم کچھ کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ یعنی رُعبِ حُسن سے ہم میں طاقتِ گویائی باقی رہتی ہے یا نہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارا حال سُن کر دیکھئے اس کے جواب میں کیا فرماتے ہیں۔ مگر زیادہ لطف پہلے ہی معنی میں ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو   جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

فرماتے ہیں۔ وہ لوگ جو شراب و رنگ کو غم غلط کرنے والے سامان میں شمار کرتے ہیں وہ

پرانے زمانے کے بھولے بھالے آدمی ہیں۔ مے و نغمہ اندوہ رُبا نہیں ہے بلکہ اندوہ افزا ہے اس لئے کہ جب کوئی سامانِ نشاط آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو یادِ یار تازہ ہو جاتی ہے بجائے غم غلط ہونے کے رنج جاں گُسِل کا سامنا ہو جاتا ہے۔

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے ۔۔۔ اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟

فرماتے ہیں۔ جب مجھے غش سے افاقت حاصل ہوتی ہے تو میرا معشوق میرے دل میں آجاتا ہے اور یہ میرے نالہ کے اثر سے ہوتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اور کون سے نالہ کو رسا کہتے ہیں، اِس سے زیادہ رسائی نالہ کو کیا ہو گی کہ فوراً ہی معشوق کو کھینچ کر دل میں لے آتا ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود ۔۔۔ قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قبلہ پر قبلہ نما کا اطلاق کرنا میرزا صاحب کے حصہ کا مضمون ہے۔ میرزا صاحب سے پہلے کسی نے نہیں کہا۔ یہ شعر ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بھی دیوارِ کعبہ کے پتھروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ہمارا مسجود مطلق ادراک کی سرحد سے بہت اُدھر ہے یعنی کعبہ کو دیکھ کر یا بغیر دیکھے بہ سمت کعبہ سجدہ کرنا اس غرض سے نہیں ہے کہ ہم کعبہ کے پتھروں کو سجدہ کرتے ہیں بلکہ ہم اُس کو سجدہ کرتے ہیں جو جہات سے منزہ ہے۔ البتہ سجدہ کے لئے جہت لازمی ہے اِس لئے جہت کعبہ کو معین کر لیا اور وہ جہت مثل قبلہ نما کے ہے۔

پائے اُفگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے ۔۔۔ خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہمارے پاؤں جو رستے کے کانٹوں سے زخمی ہو گئے ہیں اُن پر تجھ کو رحم آگیا ہے اِس لئے ہم تیری راہ کے کانٹوں کو کانٹے نہیں کہتے بلکہ مہر گیا کہتے ہیں۔ مہر گیا ایک بوٹی کا نام ہے۔ اِس بوٹی کی جڑ انسان کی شکل کی ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ جو آدمی اپنے پاس اس جڑ کو رکھتا ہے اُس پر لوگ مہربان ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ حُب کا اثر رکھتی ہے اس لئے اس کے راہ کے کانٹوں کو مہر گیا سے تعبیر کرتے ہیں۔

اِک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا ۔۔۔ آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

فلسفۂ جدید کے موافق (مسئلہ دورانِ خون جواب ثابت ہوا ہے) اِس شعر میں نظم کیا گیا ہے
سے حضرت مصنّف کی فلسفیانہ قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ شرر سے مراد روح حیوانی ہے جو
انسان ... ہے۔ فرماتے ہیں روح کی حرارت سے انسان کو سانس لینے کی ضرورت واقع
نہیں ہوتی بلکہ ہر سانس کی ہوا سے روح کو مشتعل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

دیکھئے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

فرماتے ہیں ہم اس کی ہر بات پر نامِ خدا یا ماشاءاللہ چشم بد دور کہا کرتے ہیں۔ گویا اسکی نخوت
کو ترقی ہمارے اسی قسم کے جملوں سے ہوتی رہتی ہے۔ انجام کار دیکھئے اِن باتوں اور اس کی
نخوت کا کیا ہوتا ہے یعنی معلوم نہیں یہ اُونٹ کس کل بیٹھے۔

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

شیفتہ سے مراد نواب مصطفےٰ خاں بہادر شیفتہ رئیس جہانگیرآباد ہیں۔ اور وحشت سے مراد غالبا
غلام علی خاں صاحب وحشت ہیں اور یہ دونوں مرزا صاحب کے شاگرد نہ تھے مگر شاگردوں
سے زیادہ میرزا صاحب کے ماننے والے تھے۔ مومن خاں صاحب کے انتقال کے بعد یہ
دونوں صاحب مشورہ سخن میرزا صاحب ہی سے کرتے تھے۔

غزل

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ اس پھُول کی آبرو کچھ نہیں ہے جو گلشن سے باہر نکل گیا۔ گویا پھول کا بازار میں
جاکر بکنا غلام بن کر آبرو کھو دینا۔ مگر یہاں یہ مضمون دوسرے معنی پر استعمال ہوا ہے۔ گریباں
ننگ پیراہن ہے جو دامن میں نہیں ہے۔ یعنی جب گریباں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دامن میں
آجائے گا تو پھُول بن جائے گا۔

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ اے گریہ تیرا انجام یہ ہوا کہ میرے جسم میں کوئی حالت باقی نہیں رہی، تو نے خون کو

آنسوؤں کے رستے بہا کر میرے جسم میں ایک قطرہ بھی لہو کا باقی نہ رکھا اور جس قدر رہ گیا تھا وہ اتنا کم تھا کہ ہماری آنکھ سے ٹپکنے سے چہرہ کا رنگ بن کر اُڑ گیا اور جو لہو چہرہ کا رنگ بنکر اُڑا ہے وہ دامن کے حصّہ کا تھا۔ اب دامن بے لہو کے رہ گیا۔

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب　　ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ اس کے شوقِ دیدار میں نگاہ آفتاب کے اجزاء جمع ہو کر ذرات کی شکل میں ظاہر ہو گئے ہیں۔ روزنِ دیوارِ یار میں خاک کے ذرّے نہیں ہیں۔

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے　　پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ زندانِ غم کی تاریکی کا حال کیا بیان کروں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، (قاعدہ ہے کہ جس جگہ تاریکی زیادہ ہوتی ہے وہاں تھوڑی سی روشنی بھی بہت معلوم ہوتی) ہے اور ایسا اندھیرا ہے۔ روزنِ دیوار میں جو روئی کی گولی بنا کر رکھی ہے وہ سپیدہ سحری کی طرح سے چمک رہی ہے۔

رونق ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے　　انجمن بے شمع ہے گر برقِ خرمن میں نہیں

یعنی دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند کی محبت ہو خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملّت کی خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں (از یادگارِ غالب) بے مثل شعر لکھا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن　　غیر سمجھا ہے کہ لذّتِ زخمِ سوزن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ زخم میں ٹانکے دلوانے سے غیر مجھ کو علاج کرنے کا طعنہ دیتا ہے۔ وہ نادان یہ نہیں سمجھتا کہ سوئی کے زخم میں بھی وہی تکلیف ہے جو زخم ڈالتے وقت تلوار یا تیر یا کسی اور دھار دار آلہ سے ہوتی ہے۔ لذّت کا لفظ تکلیف کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ شعر کی عمدگی میں کیا کلام ہے۔

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے   جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم ایک بہارِ ناز کے کُشتۂ حُسن ہیں۔ مدفن میں بھی اِسی بہارِ ناز کے تصور سے جلوۂ گل کا سماں ہمارے پیشِ نظر ہے۔

قطرہ قطرہ اِک ہیولیٰ ہے نئے ناسُور کا   خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ میرے خون کا ایک ایک قطرہ ناسُور کی صورت پیدا کرنے والا ہے، جس طرح ہیولیٰ پر سے ایک صورت معدوم ہوتی ہے اور دوسری صورت طاری ہوتی ہے اسی طرح خون کی ہر بوند سے لہو کے قطرہ کی صورت فنا ہوکر ناسور کی شکل پیدا ہو جائے گی اور جسم میں جس جس مقام پر لہو کی بوندیں ہیں وہاں ناسور پڑ جائیں گے۔

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری   موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ ساقی کو شراب پلانے پر بہت غرور تھا لیکن میری قلزم آشامی نے آج اس کے غرور کو ڈھا دیا۔ میں نے اس کثرت سے شراب پی کہ کسی شیشہ میں موجِ مے باقی نہ رہی۔

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود   قد کے جھکنے کی بھی آسائش مرے تن میں نہیں

فرماتے ہیں ضعف مجھ کو ایسا نچوڑ رہا ہے کہ اظہارِ ناتوانی کا موقع بھی نہیں ملتا، یعنی قد کا جھکنا ضعف کی علامت ہے، مگر ضعف نے مجھ کو چاروں طرف سے بھینچ رکھا ہے۔ اب کسی طرف میرے قد کے جھکنے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہی۔

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر   بے تکلف ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

اپنے تئیں پھوس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح پھوس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

غزل

تمہارے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا   گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

فرماتے ہیں۔ اس کے ناز و انداز کی تعریف جیسی ہونی چاہیئے تھی مجھ سے نہ ہو سکی اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر صرف ایک ہی ادا ہو تو میں اس کو قصداً کہہ کر عہدہ مداحی سے سبکدوش ہو سکتا تھا۔ وہ تو سراپا ادا ہے کس کس ادا کی تعریف کروں۔

حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

فرماتے ہیں۔ تیری زلفوں کے گھونگر یہ چشمہائے کشادہ بن کر دل کی تاک میں مصروف ہیں، اس لئے مجھے مناسب ہے کہ ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا سے تعبیر کروں۔

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

فرماتے ہیں۔ میں ہوں اور ہزاروں لاکھوں جگر خراش نالے ہیں۔ تو ہے اور ایک سنی ان سنی کہ جس کا میں بیان نہیں کر سکتا۔

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

فرماتے ہیں۔ اے ظالم میرے گمان سے مجھ کو منفعل ہونا پڑے ایسا نہ کرنا۔ خدا نہ کرے کہ میں تجھ کو بے وفا کہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میرا گمان تو تجھ کو بے وفا کہتا ہے اور میں وفادار کہہ رہا ہوں۔ ایسا نہ کرنا کہ مجھ کو اپنے گمان سے شرمندہ ہونا پڑے یعنی بے وفائی نہ کرنا کہ خدانخواستہ مجھ کو بھی بے وفا کہنے کی ضرورت واقع ہو۔

قطعہ

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

فرماتے ہیں۔ تھوڑی سی رنجش کے بعد تم یہ نہ سمجھنا کہ میں ہمیشہ کے لئے تم سے روٹھ بیٹھا ہوں۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تم مہربان ہو کر جس وقت چاہو مجھ کو بلا لو میں گزرا ہوا وقت نہیں ہوں کہ پھر دوبارہ نہ آسکوں۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

فرماتے ہیں۔ ضعف کی حالت میں طعنۂ اغیار کا شکوہ دیتے ہوئے تم کیوں ڈرتے ہو بات کی

برداشت مجھ کو ضعف کی حالت میں بھی ہے۔ تمہاری بات کچھ میرا سر نہیں ہے کہ جس کو میں ضعف کی وجہ سے نہیں اُٹھا سکتا۔

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے، کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اس لئے نہیں کھا سکتا۔ (از یادگار غالب)

غزل

ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایکدن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

فرماتے ہیں۔ شرابخواری کے وقت کسی دن ہم سے بے تکلف ہو جاؤ، اگر ایسا نہ کروگے تو ہم تمہیں کسی دن چھیڑیں گے۔

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو اِن بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

فرماتے ہیں۔ اس دنیا کی ترقی کے اس قدر فریفتہ نہ ہو۔ اِس بلندی کی قسمت میں پستی لکھی ہوئی ہے یعنی ایک دن قیامت آنی ہے۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا صاحب کے اس شعر کی نسبت یہ روایت مشہور ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے مرزا صاحب پر کسی دوکاندار نے قیمت شراب کی بابت نالش دائر کر دی تھی۔ مقدمہ مفتی صدرالدین خاں صاحب صدر الصدور کی عدالت میں پیش ہوا۔ جواب دعویٰ میں میرزا صاحب نے یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر پڑھ دیا۔ مفتی صاحب نے مدعی کو روپے اپنے پاس سے دیدیئے اور مرزا صاحب کو عدالت سے رخصت کر دیا۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

فرماتے ہیں۔ نغمۂ شادی اور نغمۂ غم دنیا میں توام ہیں۔ کبھی غم ہے تو کبھی شادی اور سازِ ہستی کی یہ دونوں صدائیں ہیں۔ سازِ ہستی کے مٹ جانے سے پہلے دونوں کو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ غم کے بعد شادی لازمی ہے۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایکدن

فرماتے ہیں۔ اس بے تکلفی کے مذاق میں پہل ہماری طرف سے ہوئی تھی۔

غزل

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں اِک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم پر ان کو یہ گماں نہیں ہے کہ جفا سے ڈر کر وفا ترک کر دیں گے، ان کی جفائیں صرف ہمیں چھیڑنے کی غرض سے ہیں۔ ان سے امتحانِ وفا مراد نہیں ہے۔

کِس مُنہ سے شکر کیجئے اِس لطفِ خاص کا پرسِش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

فرماتے ہیں۔ اس کی نگاہِ لطف کا کس مُنہ سے شکر کیجئے۔ یعنی نگاہِ لطف پرسشِ حال تو کرتی ہے مگر زبان سے میرا حال نہیں پوچھا جاتا۔

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم کو ستمگر اِس لئے عزیز ہے کہ اس کا ستم قوتِ برداشت کے موافق ہوتا ہے، ایسا ظلم وہ نہیں کرتا کہ جس سے ہم جاں بلب ہو جائیں یا اپنی جان سے گزر جائیں۔ اس واسطے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی اس ستمگر کو عزیز نہ ہوتے تو ستم سے وہ ہماری جان لے لیتا۔ اِس بیان سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ یعنی وہ ستمگر اگر ہم پر مہربان نہیں ہے تو نامہربان بھی نہیں ہے۔

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر بوسۂ دہن دینے میں تم کو یہ عذر ہے کہ میرا دہن معدوم ہے میں بوسہ کیونکر دوں۔ تو نہ دو۔ میں تمہارے اس عذر کو تسلیم کرتا ہوں لیکن گالی تو مجھے دو، اس لئے کہ زبان

توتم رکھتے ہو۔ گالی دینے میں کیوں عذر کرتے ہو ہے یہ مثل کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی۔

قطعہ

ہر چند جانگدازیِ قہر و عتاب ہے ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

باوجودیکہ اس کا قہر و عتاب میری جان کو گھلا رہا ہے اور باوجود اس کے کہ تاب و طاقت نے مجھ کو جواب دے دیا ہے۔

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

فرماتے ہیں۔ اس پر بھی میری جانِ زار یہی تقاضے کر رہی ہے کہ اور کوئی ظلم و ستم باقی رہ گیا ہو تو اس کو بھی کام میں لے آنا چاہئے۔ میں تو اب بھی یعنی اس صورت میں بھی اماں کا خواہشمند نہیں ہوں۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر دل دو نیم نہ ہو تو خنجر سے دل کے دو ٹکڑے کر دے اور اگر مژگان خونچکان نہ ہو تو عشق کی چھری سے دل کو زخمی کر دے تاکہ مژگان خونچکاں ہو جائے اور یہ دونوں مزے عاشق کو حاصل ہو جائیں۔

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

فرماتے ہیں۔ وہ سینہ ہی کیا ہے جس سینہ میں دلِ سوزاں نہ ہو اور وہ دل ہی کیا ہے جس کا نفس آتش فشاں نہ ہو۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

فرماتے ہیں۔ جنون نقصان دینے والی چیز نہیں ہے اگر گھر سے نکل جانے کے بعد گھر خراب ہو جائے گا تو بلا سے ہو جائے۔ گھر میں زیادہ سے زیادہ سو گز زمین کے بدلے اتنا بڑا جنگل ہاتھ آتا ہے یہ کیا مہنگا ہے۔ عالمِ وحشت میں سر بصحرا نکل جانا چاہیئے۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

فرماتے ہیں۔ یہ کیا سوال کرتے ہو کہ تیرا نوشتۂ تقدیر کیا ہے۔ اس سوال سے تو یہ پایا گیا، گویا میری جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے ماتھے پہ سجدۂ بُت کا گٹّا نظر آرہا ہے اور یہی میرا نوشتۂ قسمت ہے۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

یہاں ہمزباں کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتہ کی زبان ایک نہیں ہو سکتی اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں (از یادگار غالبؔ)

جاں ہی بہائے بوسہ وہ لے کیوں کہے ابھی غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیمجاں نہیں

فرماتے ہیں۔ یہ بات تو مسلمہ ہے کہ بوسہ کی قیمت جان ہے۔ لیکن وہ ابھی اس بات کو کیوں ظاہر کرے گا وہ تو ابھی تک غالبؔ کو یہی جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ یہ سمجھ لے گا کہ غالبؔ نیمجاں ہو گیا اُس وقت بوسہ کی قیمت میں جان طلب کرے گا تاکہ غالبؔ جان دے کر بوسہ نہ خرید سکے۔

غزل

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اِسی مطلب کو جو پہلے مصرعہ میں بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے مصرعے میں نئے رنگ سے کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دشت نوردی کے مانع کوئی تدبیر نہ ہوتی۔ اِس کو اس طرح ادا کرنا کہ پاؤں میں چکّر ہے مگر زنجیر نہیں، کمال بلاغت ہے۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں جادہ غیر از نگہہ دیدۂ تصویر نہیں

فرماتے ہیں۔ شوق عرفاں مجھ کو اس ویرانہ کی طرف کھینچ کر لیے چلا ہے جہاں جادہ یعنی بٹیا نگاہ دیدہ تصویر کی طرح معدوم ہے۔ گویا اِس رستہ پر قدم رکھ کر ہر شخص کو حیرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عرفان الٰہی کی منزل ایسی کٹھن ہے کہ جہاں انسان سراپا حیرت بن جاتا ہے۔

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے جادۂ راہِ وفا جُز دمِ شمشیر نہیں

جادہ۔ یعنی بیٹا کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور تکلیف میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اِس لذت سے دل کھول کر متمتع ہوں۔ مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اِس لئے پہلے ہی قدم پر موت آتی ہے پس افسوس ہے کہ لذت آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے (از یادگار غالب)

رنجِ نو میدیِ جاوید گوارا رہیو! خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

فرماتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناامیدی کا رنج مجھ کو گوارا ہے۔ یعنی میں اِس بات سے بہت خوش ہوں۔ اگر میرا نالہ تاثیر کا منت پذیر نہیں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرزا صاحب بمقابلہ یاس و ناامیدی کے فریاد کی مدد سے کامیابی حاصل ہونے میں ذلت اور ہتک سمجھتے ہیں۔ اور ایسی کامیابی کے مقابلہ میں اپنے غم دوست ہونے پر فخر ظاہر کرتے ہیں۔

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے لذّتِ سنگ بانداز ۂ تقریر نہیں

فرماتے ہیں۔ یہ زخم سر جس وقت اچھا ہو جاتا ہے پھر سر میں کھجلی ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ پتھر کھانے کا مزا احاطۂ تقریر سے باہر ہے۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ ہمیشہ اندمال زخم کے بعد زخم میں کھجلی ہوتی ہے۔ اس کو میرزا صاحب نے دوبارہ زخم کھانے کے شوق سے تعبیر کیا ہے۔

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

فرماتے ہیں۔ جب دوست کی عنایت گستاخی و بے باکی کی اجازت دے تو اس وقت ارتکاب گناہ میں جھجکنے سے زیادہ کوئی گناہ نہیں۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

اس مقطع کا مصرعۂ ثانی ناسخ کی تصنیف ہے۔ میرزا صاحب نے اُس پر مصرعہ لگا کر اتفاقِ رائے ظاہر کیا ہے۔

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

فرماتے ہیں۔ آنکھ کی پتلی میں یہ نگاہیں نہ سمجھو۔ یعنی یہ نگاہیں نہیں ہیں۔ بلکہ نگاہوں کی جگہ (دلِ چشم میں) یعنی آنکھ کے بیچ میں آ رہیں جمع ہو گئی ہیں۔ سویدا اس سیاہ نقطہ کا نام ہے جو دل پر ایک خال کی صورت میں ہوتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میری آنکھ کے تِل میں یہ نگاہیں نہیں ہیں بلکہ دلِ چشم میں آ رہی ہیں۔ یعنی میری آنکھیں اور نگاہیں دونوں حسرت آلود ہیں۔

غزل

برشگالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے کھل گئی مانندِ گُل سو جا سے دیوارِ چمن

فرماتے ہیں۔ دیدۂ عاشق کی برسات دیکھنے کے قابل ہے۔ پھول کی طرح سے دیوارِ چمن کھل گئی (شق ہو گئی) جب دیوارِ چمن پھولوں کی طرح سے کھلی ہے تو کثرتِ غنچہ و گل گریۂ عاشق کے اثر سے دیکھنا چاہیئے کہ کس حد تک پہنچتی ہے۔

اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعوئی وارستگی! سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

فرماتے ہیں۔ کیسا ہی کوئی آزاد و وارستہ مزاج ہو، دنیا میں اگر عشق و محبت کے پھندے سے نہیں نکل سکتا اور اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ سرو آزاد باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن ہے (ایک قسم کا سرو ہوتا ہے جس کو سروِ آزاد کہتے ہیں۔

غزل

عشق تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجرِ بید نہیں

فرماتے ہیں۔ عاشقی تاثیر سے نا اُمید نہیں ہے۔ جانبازی بید کا درخت نہیں جو ثمر سے محروم رہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق اگر صادق ہے تو اثر سے محروم رہ نہیں سکتا۔

سلطنت دست بدست آئی ہے جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

فرماتے ہیں۔ سلطنت ڈھلتی پھرتی چھاؤں کا حکم رکھتی ہے۔ ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جمشید سے ہاتھوں ہاتھ رندوں تک پہنچ گئی ہے۔ گویا جامِ مے کی طرح ایک سے دوسرے کو پہنچتی ہے۔ خاتمِ جمشید نہیں کہ جو دوسرے کے پاس آ ہی نہیں سکتی۔

مطلب یہ ہے کہ جمشید کے پاس جامِ جم تھا جس میں شراب پی جاتی تھی۔ اس کے مستحق لوگوں کے سوا اور لوگ نہیں قرار پا سکتے۔

ہے تجلی تری سامانِ وجود　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

اِس شعر میں مرزا صاحب اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر عرض کرتے ہیں کہ تیری تجلی وجودِ عالم کا سبب ہے جس طرح آفتاب کا طلوع باعثِ ظہورِ ذرات ہے۔

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے　　ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں۔ خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔ (از یادگارِ غالب)

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے　　غمِ محرومیِ جاوید نہیں

فرماتے ہیں۔ رنگِ طرب کے منقلب ہو جانے کا خوف ہے ورنہ محرومیِ جاوید کا غم نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ جب انسان زمانۂ اقبالمندی کے بعد کسی سبب سے مفلس و بے زر ہو جاتا ہے تو اس کو بہ نسبت محتاج آدمیوں کے زیادہ صدمہ اور رنج پہنچتا ہے اگر انسان اول ہی سے محتاج ہوتا ہے تو اس کو بے زری کا اتنا صدمہ نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ　　ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

یہ شعر سہلِ ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے (از یادگارِ غالب)

مطلب یہ ہے کہ اُمید شرطِ زندگی ہے اور جب کوئی اُمید نہیں ہے تو زندگی سے نا اُمید ہونا بھی لازمی ہے۔

غزل

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں　　خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ جس جگہ زمین پر ہم تیرے نقشِ قدم کو دیکھ لیتے ہیں۔ ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

گویا بہشتوں کا سامنا ہو گیا۔

دل آشفتگان خال کنجِ دہن کے سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

شعرا دہن دکمر معشوق کو عدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں جو لوگ دہن بے نشان پر عاشق ہو گئے ہیں وہ اپنے سویدائے دل میں عدم کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ سرو قامت سے فتنۂ قیامت کم ہے اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے اِس لئے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے (از یادگارِ غالب)

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اے محوِ آئینہ داری تو ذرا یہ تماشا تو دیکھ کہ ہم تجھ کو کس آرزو کے ساتھ دیکھ رہے ہیں یہ خطاب معشوق کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو آئینہ دیکھنے میں ایسا محو ہو گیا ہے کہ ہماری تمنا سے دیکھنے کا بھی تماشا نہیں دیکھتا۔

سراغ تفِ نالہ داغِ دل ہے کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

اِس شعر میں میرزا صاحب نالہ کشی کے وقت کو رات کا وقت قرار دیتے ہیں۔ اِسی وجہ سے نالے کو شب رو کہا ہے۔ فرماتے ہیں جس طرح رات کے آنے جانے والوں کا نقشِ قدم صبح کو دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں سمت سے کوئی شخص آیا اور فلاں سمت کو چلا گیا۔ اسی طرح داغِ دل سے نالۂ شب کی گرمی و سوز کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ ہم فقیروں کا بھیس بدل کر اہلِ کرم کی خلوصِ نیت کا امتحان لیتے ہیں۔ کچھ خدانخواستہ ہم کو احتیاجِ سوال نہیں ہے۔

غزل

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

فرماتے ہیں۔ آگ اپنی گرمی کی وجہ سے یار کی عادت سے ملنے لگی ہے، یعنی بات بات پر جلانا، غصہ سے آگ بھبوکا بن جانا یہ خاص میرے معشوق کی عادت ہے اور آگ میں بھی یہ خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اِس لئے عذابِ نار میرے واسطے لذت دہ ثابت ہوا ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

فرماتے ہیں۔ میں اپنی عمر کا ٹھیک اندازہ نہیں بتا سکتا۔ بہت سی ہجر کی راتیں ایسی بسر کر چکا ہوں جن میں کی ایک ایک رات ہزار ہزار برس کے برابر تھی۔ اگر ان سب راتوں کو شمار میں لاؤں اور ان کا حساب لگاؤں تو اتنے برس سے جی رہا ہوں کہ وہ گنتی ہی میں نہیں آسکتے۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

فرماتے ہیں۔ حالتِ انتظار میں یہ سمجھ کر کہ اب وہ نہ آئیں گے۔ بدقسمتی سے ہماری آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ خواب میں تشریف لائے اور اپنے وعدہ پر آنے کا وعدہ کر گئے، یعنی یہ کہہ گئے کہ تو ہمارا منتظر رہ ہم ضرور آئیں گے اور یہ وعدہ اس واسطے انھوں نے کیا کہ ہم کو زندگی بھر پھر دوبارہ نیند نہ آجائے۔

قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

دوسرے مصرعہ میں بطور طنز کے کہا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے یعنی وہ کچھ نہیں لکھیں گے اس لئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں (از یادگارِ غالب)

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اِس شعر میں پہلے مصرعہ کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے (پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے) اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہیں محسناتِ شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔ (از یادگارِ غالب)

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

فرماتے ہیں۔ جو شخص وفا کے وجود ہی سے منکر ہو اس پر فریبِ وفا کیونکر چل سکتا ہے۔ پس کیوں دوست سے بدگمان ہوں دشمن کے باب میں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرا دوست منکرِ وفا ہے اس پر غیر کا فریب وفا نہیں چل سکتا۔ میں دشمن کے باب میں دوست سے کیوں بدگمان ہوں کہ یہ فریب وفائے دشمن میں مبتلا ہو گیا ہے۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

فرماتے ہیں۔ میں تو وصل میں اس وجہ سے مضطرب ہوں کہ کہیں تمہارا دوسرا طلنے والا یعنی میرا رقیب نہ آ جائے۔ تم کو شاید اس وہم کی وجہ سے پیچ و تاب ہے کہ اس کا کوئی دوسرا معشوق میرے علاوہ ہے اور یہ اس سے چھپ کر میرے پاس آیا ہے اس لئے گھبرایا ہوا ہے۔

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

خطِ وصل وہ خط جس میں وصل کا وعدہ تحریر ہو۔ فرماتے ہیں۔ میری یہ قسمت کہ وہ مجھے خط میں وصل کا وعدہ لکھ کر بھیجے۔ معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے میری بات بنا دی۔ اس خط پر مجھے جان قربان کر دینی چاہیئے۔ یہ بات میں جوشِ خوشی میں بھول گیا۔

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

فرماتے ہیں۔ نقاب کے اندر بھی غصہ سے اسکی تیوری چڑھی ہوئی ہے اور اس کا غصہ اس غضب کا ہے کہ اس غصہ کا اثر نقاب پر بھی ہو گیا ہے یعنی تیوری کے مقام پر نقاب میں شکن واقع ہو گئی ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اُس کا التفات اور میلانِ طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگھار ایک طرف اور

ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے جس میں حُسن ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اگر معنی پر نظر کیجئے تو ہر ایک مصرعہ میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے اور اسکا آنکھ چُرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب اور دل آویز ہوتا ہے اِسی طرح بناؤ سنگھار سے معشوق کا حُسن بیشک دو بالا ہو جاتا ہے، مگر اس کا غصہ میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اِس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اُوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں۔ اسکی اصل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحبِ ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا۔ چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے اِس لئے میرزا کا کلام سُن کر اکثر اُلجھتے تھے اور ان کی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے۔ مگر اس روز اس شعر کو سُن کر وجد کرنے لگے اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے۔ کہا گیا کہ مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے اور اس روز لاعلمی میں بیساختہ اُن کے مُنہ سے تعریف نکل گئی تھی۔ غالب کا نام سُن کر بطور مزاح کے جیسی کہ ان کی عادت تھی فرمایا اس میں میرزا کی کیا تعریف ہے۔ یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ اسلوب بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔ (از یادگار غالب)

وہ نالہ دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے　　جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

فرماتے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ وہ نالہ دل معشوق میں ایک پھانس کے برابر بھی جگہ نہیں پاتا جس نالہ سے آفتاب میں دراز آجاتی ہے۔

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے   جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

فرماتے ہیں۔ وہ جادو مدعا طلبی میں معشوق کے دل میں خاک کام نہیں دیتا، جس جادو سے کشتی سراب میں رواں ہو جاتی ہے (سراب) یعنی چمکنے والا ریت کا دریا، جس پر دُور سے پانی کا دھوکا ہوتا ہے۔

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی   پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

سُنا جاتا ہے کہ شراب ابر و باراں کے دن یا شبِ ماہتاب میں زیادہ لطف دیتی ہے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ شراب چھوڑ دینے کے بعد بھی ان دونوں موقعوں پر یعنی ابر کے دن۔ اور چاندنی رات میں بے پئے مجھ سے رہا نہیں جاتا۔

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں   یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

فرماتے ہیں۔ کل یعنی فردائے قیامت کے لئے آج شراب دینے میں خسّت نہ کر (مشہور ہے کہ جو دنیا میں شراب پئے گا وہ آخرت میں شرابِ طہورا سے محروم رہے گا) یہ سمجھنا کہ ساقیِ کوثر شرابِ طہورا نہ دیں گے، یہ بات ساقیِ کوثر کی فیاضی پر سوئے ظن ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا یعنی وہاں بھی ضرور ملے گی۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند   گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اسکو گوارہ نہ ہوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدمؑ اور فرشتوں کے اس قصّہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کرنیکا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اُس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے ہو جو کچھ میں جانتا ہوں اور پھر آدم سے ان کو زک دلوائی اور حکم ہوا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں، کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں، کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی (از یادگار غالبؔ)

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع　　گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

فرماتے ہیں۔ گانا سن کر جان کیوں جسم سے نکلنے لگتی ہے یعنی ایسی حالت کیوں طاری ہو جاتی ہے کہ جو تڑپا دیتی ہے۔ اگر وہ صدا یعنی شاہدِ حق کی آواز چنگ و رباب میں سمائی ہوئی ہے تو اس سے جان بخشی کا فعل کیوں نہیں سرزد ہوتا۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُس کے اختیار سے باہر ہونا چابک سواروں کی زبان میں اِس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینی حُسنِ تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے (ازیادگارِ غالب)

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے　　جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

غیر سے یہاں ماسوائے اللہ مراد ہے جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے اس لئے کہ وجودِ احد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجودِ ماسوا کے وہم سے رات دن پیچ و تاب رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجودِ واجب سے بُعد ہے (ازیادگارِ غالب)

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں۔ شاہد کے معنی ہیں دیکھنے والے کے اور مشہود اس کو کہتے ہیں جس کو دیکھا جائے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں، شہود و شاہد و مشہود کی اصل ایک ہی ہے۔ مجھ کو حیرت ہے کہ جب یہ تینوں چیزیں ایک ہیں تو مشاہدہ کس حساب میں داخل ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدتِ وجود اور کثرتِ موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورہ میں اس طرح ادا کرنا کہ یہاں کیا دھرا ہے منتہائے بلاغت ہے (ازیادگارِ غالب)

شرم اِک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

فرماتے ہیں۔ شرم ایک ادائے نازِ معشوقانہ ہے۔ اگر اپنی ذات سے بھی ہے تو بھی اس کو ادائے معشوقانہ ہی کہا جائے گا۔ لیکن اس کا استعمال ہمیشہ بے حجابی کے موقع پر ہوگا۔ یعنی حجاب کی حالت میں ادائے ناز برتی نہیں جاسکتی اور جس حالت میں اس کا استعمال روا رکھا گیا ہے۔ تو وہ حجاب عین بے حجابی ہے۔ یہ شعر بھی تصوّف میں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ یہ حجاب جو نظر آتے ہیں ایسے ہیں کہ جلوۂ یار نظر آرہا ہے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

نقاب استعارہ ہے حجابِ قدس کا اور آئینہ اس میں علم مایکون وماکان کا حکم رکھتا ہے، اور آرائش جمال سے فارغ ہونا تفسیر ہے کل یوم ھو فی شان کی۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیتِ ذات ہے جو عقل و ادراک و بصیرت سے وراء الوراء ہے۔ کہتا ہے جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھتے ہیں، ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لئے مثال نہیں ہوسکتی۔ (از یادگار غالب)

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست   مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

فرماتے ہیں۔ اے غالب ندیم دوست سے دوست کی بُو آیا کرتی ہے اس لئے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی محبت کو عبادت تصور کرتا ہوں۔

غزل

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں   مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

فرماتے ہیں۔ دو عزیز مرنے والوں کا ماتم دار اگر ایک شخص ہو تو مرنے والوں کی کسرِ شان ہے ان کے

اعزاز میں فرق آتا ہے۔ اس لئے اگر مجھ کو مقدور ہو تو ایک نوحہ گر اپنے ساتھ رکھوں۔ یعنی ہائے دل کہہ کر میں روتا ہوں اور ہائے جگر کہہ کر وہ پیٹتا رہے یا ایک کا مرثیہ میں پڑھوں اور ایک کا نوحہ وہ۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں　　ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

فرماتے ہیں۔ رشک نے مجھ کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ کسی غیر سے تیرے مکان کا پتہ دریافت کروں اور پتہ نہ ملنے سے اس قدر اضطراب و قلق بڑھ گیا ہے کہ بغیر دریافت کئے رہ نہیں سکتا۔ اس لئے ہر راہ گیر سے دریافت کرتا جا رہا ہوں کہ میں کدھر جاؤں۔ ممکن ہے کہ کوئی مجھ جیسا تیرا طالب مجھ کو مل جائے اور وہ تیرے مکان سے بھی واقف ہو اور میرا ہمسفر بھی بن جائے۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار　　اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

فرماتے ہیں۔ تیرا رستہ رقیب کے گھر کے آگے سے ہو کر ہے اس لئے مجھ کو ہزار ہزار مرتبہ رقیب کے دروازے پر ہو کر تیری تلاش میں گزرنا پڑتا ہے۔ کاش میں تیرے گھر کے رستہ سے واقف نہ ہوتا

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے　　کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

فرماتے ہیں۔ تم نے جو میرے ارادۂ قتل پر کمر کسی ہے اور یہ کہہ کر ڈرا رہے ہو کہ اب میں تجھ کو قتل کرتا ہوں۔ اس دھمکی سے میری بلا ڈرتی ہے۔ کیا میں تمہاری کمر کو جانتا نہیں کہ اس سے بارِ خنجر نہ اٹھ سکے گا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے　　یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

فرماتے ہیں۔ لو اور سنو۔ میں نے جن کو خوش کرنے کی غرض سے اپنا تمام مال و زر لٹا دیا۔ اب وہ بھی یہ فرماتے ہیں کہ تو بے ننگ و نام ہے ہم تجھ سے نہیں ملتے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالبِ راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اُس کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اوّل اوّل جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اُسی کے ہاتھ پر

بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے (ھَلُمَّ جرّاً۔ اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا (یادگار غالب)

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

اِس شعر میں خیال نہایت نازک واقع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ بے وقوف لوگوں نے میری خواہش یعنی طلبِ معشوق کو پرستش قرار دے لیا ہے۔ اِسی خیال کے عالم میں دریافت فرماتے ہیں کہ کیا میں اُس کو پوجتا ہوں۔ خود بدولت کو یہ خبر نہیں ہے کہ اِس بیداد گر کے سامنے جا کر اظہارِ نیاز پرستش کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

فرماتے ہیں۔ بیخودیِ عشق میں گم ہو کر میں اپنے کو بھول گیا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوچۂ یار میں پہنچ کر میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے یعنی میں اپنے آپے سے گزر گیا ہوں اور چونکہ اپنے آپے میں نہیں ہوں اِس لئے کوچۂ یار کے رستہ کو بھی بھول گیا ہوں اب اپنی خبر کو بھی وہاں نہیں جا سکتا۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

فرماتے ہیں۔ میں سارے زمانے کو اپنی طرح کا ہُنر دوست سمجھ رہا ہوں اور اسی غلطی کی وجہ سے متاعِ ہُنر کو دلپذیر سمجھتا ہوں حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی موجودہ زمانہ میں ہُنر کو لوگوں نے متاع کا ضِد سمجھ رکھا ہے۔

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز دیکھوں علی بہادرِ عالی گُہر کو میں

سمندِ ناز وہ گھوڑا جو ناز و ادا سے زمین پر قدم رکھے۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

غزل

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

فرماتے ہیں۔ اُس کو میرے نام سے ایسی نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اُس کے سامنے

مجھے بُرا کہنے کی غرض سے بھی میرا نام لیتا ہے تو وہ اس سے خفا ہو جاتا ہے۔ غیر اِس بات کا عادی ہے کہ ہمیشہ اس سے میری بد گوئی کرتا رہتا ہے۔ تعجب نہیں کہ اِس وجہ سے دشمن میں اور اس میں بگاڑ کی صورت پیدا ہو جائے۔

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق　　مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

فرماتے ہیں۔ باغ میں سیر کے واسطے میرے ساتھ چلنے کا اس نے وعدہ کیا ہے۔ اِس وعدہ سے میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ کو قتل کرے گا۔ میرے یہ نصیب کہاں کہ میں اس کے ہمراہ جا کر تماشائے لالہ و گل دیکھوں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ وہ پھولوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھے گا اور ان کو رقیب سمجھ کر رشک سے قتل ہو جاؤں گا۔

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

فرماتے ہیں۔ ہستی کے ساتھ عالم کو اِسی طرح کا تعلق ہے جیسا کہ کمر کو معشوق کے ساتھ گویا ہے اور نہیں ہے۔ ہم کو یہ بات بھی منظور نہیں کہ عالم ہستی کے ساتھ کمرِ یار کی طرح بھی منسوب کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ عالم کی ہستی برائے نام بھی نہیں ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو تقلیدِ تُنک ظرفیٔ منصور نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم بھی وہی قطرہ ہیں جو دریا میں مِل کر دریا بن جاتا ہے۔ یعنی فنا فی الذات ہو جانیکا مرتبہ ہم کو بھی حاصل ہے مگر زبان سے ایسا کہنا منصور کی تقلید سمجھا جائے گا اور ہمیں تنک ظرفیٔ منصور کی تقلید کرنی منظور نہیں۔

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی　　عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

فرماتے ہیں۔ ہنگامۂ عشق و محبت کی سوزشوں کے لئے زیادہ طاقت کی ضرورت ہے اور ہمارے تنِ رنجور میں تاب و تواں باقی نہیں رہی ہے۔ اِس لئے ہم حسرت کو مخاطب کر کے اظہارِ حسرت و یاس کرتے ہیں۔

ہم جو کہتے ہیں کہ ہم لے گئے قیامت میں نہیں　　کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

معشوق کی حاضر جوابی نے اِس شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے جو اس سے یہ کہا کہ تم یہاں تو ہم سے نفرت کرتے ہو اور دُور دُور رہتے ہو، ہم قیامت کے دن اللہ سے تم کو مانگ لیں گے۔ یہ سُن کر نہایت غرور کے ساتھ اُس شوخ نے ہم سے یہ کہدیا کہ ہم حور نہیں ہیں جو تم کو مل جائیں گے۔

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہے تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر تو مجھ کو لطف کے قابل نہیں سمجھتا تو میں تاکید سے کہتا ہوں کہ مجھ پر ظلم کر ظلم۔ تغافل تو اُس حالت میں زیبا تھا کہ جب تو ظلم کرنے سے معذور ہوتا۔

صاف دُردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ وائے وہ بادہ جو افشردۂ انگور نہیں

فرماتے ہیں۔ یہ بات تقلیدِ جم کے خلاف ہے کہ ادنیٰ درجہ کی شراب پی جائے، وہ شراب بد نصیب ہے جو انگوری نہ ہو، یعنی شراب ناب ہو۔ ہم لوگ ایسی کم رتبہ شراب کو مُنہ بھی نہیں لگاتے۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

فرماتے ہیں۔ میں ظہوری کے مدمقابل ہوں۔ اور میرا یہ دعویٰ اِس دلیل سے ہے کہ وہ ظہوری تھا اور میں خفائی ہوں۔ یعنی وہ مشہور تھا اور میں مشہور نہیں ہوں۔ اور اِس تقابل کا ہونا میرے دعوے پر دلیل ہے۔

غزل

نالہ جز حُسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

فرماتے ہیں۔ میرے نالہ کو شکوۂ بیداد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی میں ظلم و ستم کی شکایت میں نالہ کشی نہیں کرتا ہوں بلکہ یہ حُسن طلب ہے تقاضائے جفا کا۔ مطلب یہ ہے کہ تم یوں تو ہم پر ظلم و ستم نہیں کرتے مگر ہمارے نالوں سے تنگ آکر تو ہم پر جفا کرو گے۔

عشق و مزدورئِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

فرماتے ہیں۔ مرتبۂ عشق سے یہ بات بعید ہے کہ وہ مزدوری کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھے یعنی

فرہاد نے جو کوہِ بے ستون کا مادہ اِس غرض سے کاٹا کہ عشرت گاہِ خسرواں پتھروں سے تعمیر کیا جائے گا۔ یہ ایک مزدور پیشہ کا کام تھا۔ عشق کی شان اِس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے، اِس لئے ہم کو فرہاد کی نیک نامی میں کلام ہے۔ ہم اس کو دفترِ عشاق میں نامزد نہیں کر سکتے۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم　　دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

فرماتے ہیں۔ ویران ہونے میں میرا گھر بھی صحرا سے کم نہیں تھا مگر اس میں یہ وسعت کہاں تھی جو جنگل میں ہے۔

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں

فرماتے ہیں۔ اہل نظر کے لئے طوفانِ حوادث مکتب کا حکم رکھتا ہے۔ موجِ حوادث کے طمانچے سیلیِ اُستاد سے عبرت کا سبق حاصل کرنے کے لئے کم نہیں۔

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا　　جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم اپنی عادتِ تسلیم و وفا کے سبب سے نالہ و فریاد کرنے سے حذر کرتے ہیں لیکن ہمارا معشوق یہ جانتا ہے کہ ہم کو طاقتِ فریاد نہیں ہے۔ اس سبب سے ہم نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ضبط کی داد بھی ہم کو نہیں ملتی۔

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے　　گر چراغانِ سرِ رہگزرِ باد نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر گل و لالہ چراغانِ رہگزرِ باد نہیں ہیں تو ان کا رنگِ تمکین اس قدر بے ثبات کیوں ہے۔ مطلب یہ ہے اگر ہوا کے مقام پر چراغ جلا کر رکھ دیا جاتا ہے تو وہ جلد بجھ جاتا ہے اور گل و لالہ بھی ناپائدار ہوتے ہیں۔ یعنی پھول ایک دو دن سے زیادہ قیام پذیر نہیں ہوتے۔

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں　　مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

سبدِ گل وہ ٹوکری جس میں گلچیں پھول توڑ کر یا چن کر جمع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں گل کی ٹوکری کے نیچے گلچیں نے بند کیا ہے۔ اے مرغِ گرفتار تجھ کو مبارک ہو کہ گلزار میں صیاد نہیں۔ اگر وہ ظالم ہوتا تو مرغِ چمن کو گل سے اتنا قرب حاصل نہ ہوتا۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

فرماتے ہیں۔ نہیں سے گویا ہاں تراوش کرتی ہے (نفی سے مراد یہاں لفظ نہیں ہے اور اثبات سے مراد لفظ ہاں ہے۔ ہاں تانیث ہے۔ اس لئے میرزا صاحب نے اثبات کو بھی تانیث لکھا ہے تراوش کے معنی یہاں ظاہر ہونے کے لئے ہے، دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں مطلب یہ ہے، دہن کو شعرا معدوم لکھتے ہیں۔ اور معشوق کو روزِ ازل میں بجائے دہن کے نہیں کا لفظ عطا ہوا ہے۔ یعنی ہر بات پر معشوق نہیں کہد تیا ہے اور نہیں کہد دینے سے دہن کا ثبوت ملتا ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

فرماتے ہیں۔ جلوہ گری میں تیرا کوچہ اور بہشت دونوں کا رتبہ مساوی ہے۔ اس کا بھی یہی نقشہ ہے۔ یعنی وہاں خدا کا دیدار ہوگا تو یہاں ترا دیدار ہوتا ہے لیکن دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ ترے کوچہ کے مقابلہ میں آباد کم ہے

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ کس مُنہ سے تم غربت کی شکایت کرتے ہو۔ کیا تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں ہے۔ یعنی مسافرت میں اگر کوئی شخص تمہارا پرسانِ حال نہیں تو وطن میں کون تمہاری بات پوچھتا تھا۔

غزل

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!

اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار ہے یعنی میں جو دونوں جہان لے کر خاموش ہو رہا۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہو گیا۔ بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اس لئے خاموشی اختیار کی (از یادگارِ غالبؔ)

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں!

مقام سے منازل سلوک و معرفت مراد ہیں۔ فرماتے ہیں حوصلہ طلب کے موافق ہر منزل پر دو چار طلبگار تھک تھک کر ٹھہر ٹھہر گئے، تیرا پتہ تو کہیں ملتا ہی نہیں۔ ناچار ہو کر ٹھہر نہ جائیں تو کیا کریں۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم　　　ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

فرماتے ہیں۔ اہلِ بزم شمع کے ہوا خواہ ہیں۔ یہ اس کا جلتے جلتے فنا ہو جانا کب چاہتے ہیں۔ اس بیان سے اپنے حال کی تمثیل مراد ہے۔ دوسرے مصرعہ کا یہ مطلب ہے کہ غمِ عشق ہی جانگداز ہو تو ہمارے غمخوار ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں۔

غزل

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر　　　عشق کا اسکو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

فرماتے ہیں۔ غیر کی لاف زنی سے وہ یہ سمجھ گیا ہے کہ یہ شخص مجھ پر عاشق ہے اور اس کے سارے دعوے سچے اور درست ہیں۔ ہم بے زبان یعنی کم سخن ہیں ہماری محنت کا اس کو یقین نہیں ہے۔

قیامت ہے، کہ سُن لیلا کا دشتِ قیس میں آنا　　　تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

فرماتے ہیں۔ کیا قیامت ہے کہ دشتِ قیس میں لیلا کا بیباکانہ چلا آنا سُن کر تعجب سے وہ کہتا ہے کہ بھلا ایسا غضب بھی کہیں زمانے میں ہوتا ہے کہ معشوق شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر عاشق کی پرسشِ حال کے لئے اس کے مسکن پر پہنچ جائے۔

دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ　　　نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

فرماتے ہیں۔ وہ دل کا نازک یعنی بودے دل کا آدمی ہے۔ اے غالبؔ مجھ کو اُس پر رحم آتا ہے اگر تو امتحانِ اُلفت لینے کے لئے آمادہ کرے گا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے جان قربان کر دینے کے بعد اس کا دل اِس صدمہ سے تکلیف اُٹھائے۔

غزل

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا　　　بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

فرماتے ہیں۔ کسی پر عاشق ہو کر وہ بھی تنہائی پسند ہو گئے۔ ہم نے اپنی بیکسی اور تنہائی کی داد

- دنیا ہی میں پالی۔ یعنی ہماری بیکسی کا صبر ان پر پڑ گیا۔ جو حالت ہماری ان کے عشق میں تھی وہ حالت ان کی غیر کی محبت میں ہو گئی۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام مہرِ گردوں ہے چراغ رہگزار باد یاں

سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال دفنا ہیں۔ رہگزر باد سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے (از یادگار غالب)

غزل

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہجر میں ہم کو قاصد کا انتظار ہے۔ شاید اس کی طرف سے کوئی حسب دلخواہ پیام یا ہمارے پیام کا جواب آ جائے۔ دیوار کو دیکھنے سے یہ مدعا ہے کہ شاید صبا پیغام لے کر آئے۔ تو وہ دیوار پر سے آئے گی۔ اور دروازہ کے دیکھنے سے یہ مطلب ہے کہ اگر نامہ بر جواب لیکر آیا تو وہ دروازہ سے آئے گا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوتی ہے دوسرے مصرع میں اس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا (از یادگار غالب)

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

زخمِ جگر کی گہرائی اس سے بہتر لفظوں میں ادا ہو ہی نہیں سکتی۔ فرماتے ہیں۔ لوگ حیرت سے میرے زخمِ جگر کی گہرائی دیکھ رہے ہیں اور مجھ کو یہ خوف ہے کہیں اس کے دست و بازو کو نظر نہ ہو جائے۔ بے مثل شعر کہا ہے۔

ترے جواہر طرفِ کلاہ کو کیا دیکھیں ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہم اُن جواہرات کو کیا دیکھیں جو تیری ٹوپی پر ٹنکے ہوئے ہیں۔ ہم تو لعل و گوہر کے

نصیبے کی بلندی کو دیکھتے ہیں کہ ان سنگریزوں اور پانی کے قطروں کو خوش نصیبی سے یہ اوج حاصل ہو گیا ہے۔

غزل

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں   شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

فرماتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ مجھ کو قیامت کا یا اس کے آنے کا اعتقاد نہیں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی مصیبتیں شبِ فراق کی تکلیفوں سے زیادہ نہ ہوں گی۔

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے   بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

چاندنی راتیں اور برسات کی گھٹائیں شراب خوار کے واسطے لطف افزا باتیں ہیں۔ فرماتے ہیں، اگر آج دن کو اودی گھٹائیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں نہیں ہیں تو نہ ہوں شبِ ماہ تو ہے ہم رات کو چاندنی میں بیٹھ کر شراب پئیں گے۔

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں   جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

مرزا صاحب اس شعر میں معشوق کی بے التفاتی اور کم توجہی کی شکایت فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ملاقات کو جاتا ہوں تو وہ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے اور رخصت ہوتا ہوں تو خیر باد نہیں کہتے۔ دونوں موقعوں پر بے پروائی برتتے ہیں۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں   کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر کبھی کسی وقت میرا خیال ان کو آ جاتا ہے تو اہلِ بزم سے مخاطب ہو کر یہ کہتے ہیں کہ آج ہماری محفل میں کچھ فتنہ و فساد نہیں ہے۔ یعنی حضرت غالب تشریف نہیں لائے جو بات بات پر رشک کی بدولت اہلِ بزم سے الجھتے اور الجھتے تھے۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب   گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

عید کے دن محتاج و مساکین کو خیرات زیادہ دی جاتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ دی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ میخانہ میں عید کے دن کی کچھ قید نہیں ہے، پیرِ مغاں کا فیض روز جاری رہتا ہے۔

جہاں میں ہے غم و شادی بہم ہمیں کیا کام دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

پہلے دنیا کا قاعدہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں غم و شادی توام ہوا کرتے ہیں۔ یعنی کبھی غم ہے تو کبھی شادی ہے اور پھر اس بیان پر حسرت ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو خدا نے وہ دل دیا ہے جو کبھی شاد ہی نہیں ہوتا یعنی ہمارے لیئے دنیا میں غم ہی غم ہے۔

تم اُن کے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

اِس شعر کا لطف وجدانی ہے۔ بیان میں نہیں آسکتا موقع یہ چاہتا تھا کہ معشوق کی وعدہ خلافی کی شکایت کا پہلو لیئے ہوئے ہوتا۔ اور میرزا صاحب نے واعظانہ طریقہ سے بیان کیا ہے، اور وہ اس لیئے ہے کہ مصرعہ ثانی یہ بتا رہا ہے کہ تم ان سے یہ کہو گے کہ تم نے ہم سے وعدہ خلافی کی تھی اور وہ کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے ہمیں وعدہ یاد نہیں۔ باہم دگر تکرار ہو گی تکرار سے رنج نکلے گا، رنج سے جانِ عاشق پر مصیبت نازل ہو جائے گی۔ اِس سے بہتر یہ ہے کہ تم ان کے بھولے ہوئے وعدہ کا تو ذکر ہی نہ کرو۔

غزل

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ تیرے توسن کی صبا سے تشبیہ دے کر اپنی مضمون نگاری کی ہوا باندھتے ہیں ورنہ تیرا توسن صبا سے زیادہ چالاک ہے۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اثر کی اُمید پر ہم آہ نہیں کرتے، نہ ہمیں یہ یقین ہے کہ آہ میں تاثیر ہوتی ہے ہم تو صرف اس کے دل پر اپنا رعب بٹھاتے ہیں۔

تیری فرصت کے مقابل اے عمر برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اے عمر تیری تیز رفتاری کے مقابلہ میں بجلی کو پا بہ حنا باندھتے ہیں، پا بہ حنا چلنے سے معذور ہونے کا استعارہ ہے۔

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم   اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ انسان کو دنیا کی اور ساری قیدوں سے رہائی اور آزادی مل سکتی ہے لیکن قیدِ ہستی سے نہیں مل سکتی۔ قطرۂ اشک کو باوجود بے سروپائی کے باندھتے ہیں اور وہ بندھ جاتا ہے اور انسان بھی اشک کی طرح بے سروپا ہے اس لئے ہستی کی قید میں ہم ضرور رہیں گے اور مرتبۂ فنا جو عین آزادی ہے حاصل نہیں ہوگا۔

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل   مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ نشۂ رنگ کی وجہ سے پھول کھلا کرتے ہیں۔ اور جب وہ کھل جاتے ہیں تو وہ نشۂ رنگ اور بھی زور پکڑ جاتا ہے اور مست کبھی بندِ قبا باندھا نہیں کرتے اسی لئے گل کے بھی بندِ قبا کھلے ہوئے ہیں۔

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ   لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ لوگ یعنی شعراء نالہ کو رسا باندھتے ہیں اور اس کی رسائی کے قائل بھی ہیں۔ یہ اُن کے مضامین کی غلطی ہے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ نالہ کو رسائی کبھی حاصل نہیں ہوتی، مگر نالہ رسا ہوتا تو قیامت تک باندھا نہ جا سکتا۔ اس کا بندھ جانا نارسائی کی دلیل ہے

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں   آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اہلِ تدبیر یعنی عقلمند آدمیوں کی باتیں تو دیکھو کہ آبلہ پا پر مہندی باندھ کر پاؤں کو عضوِ معطل بنا دیتے ہیں۔ یعنی ایک تو انسان آبلہ پا کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے اس پر علاج کی غرض سے حنا کا باندھنا بالکل ہی پاؤں کو بیکار کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہلِ جنون کو دیکھو کہ وہ آبلہ پائی میں بھی دشتِ پُرخار طے کرتے ہیں۔

سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ   ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

ہم کے لفظ کو زور دے کر پڑھنا چاہیئے یعنی ہم کو فریب دیتے ہیں اور بھی کسی کو نہیں فرماتے ہیں، یہ ان کی بیوقوفی ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہم ان کے فریب میں آجائیں گے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ　　وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ زمانہ جس قدر ہم کو آزار پہنچاتا ہے یہ بہت ہی کم ہے۔ اسدؔ کی جان کی قسم کھاکر کہتے ہیں کہ ہم تو اس سے زیادہ ستم سہنے کی آرزو رکھتے ہیں۔

غزل

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں　　خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ ہمیشہ تیرے در پر تیرے سنگِ در کی طرح سے پڑا نہیں رہ سکتا۔ ایسی زندگی کو خاک میں ملا دوں کہ میں پتھر یعنی تیرا سنگِ در بھی نہیں ہوں۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ پیالہ و ساغر کی طرح مجھ کو دن رات گردش نصیب ہے وہ ایک بے جان شے ہیں۔ اگر ان کو شراب مدام کی وجہ سے شب و روز گردش رہتی ہے تو ان کو اس سے کیا تکلیف پہنچتی ہے وہ ایک بے حس چیز ہیں۔ میں انسان ہو کر کب تک ایسی گردش میں مبتلا رہ سکتا ہوں، دل کیوں نہ گھبرا جائے۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے　　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ مجھ کو کس وجہ سے زمانہ مٹاتا ہے باوجودیکہ حرفِ مکرر نہیں اور تو کوئی وجہ میرے مٹانے کی ثابت نہیں ہوتی۔ حرفِ مکرر کا مٹانا لازمی سمجھا جاتا ہے، وہ میں ہوں نہیں۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے　　آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ کافروں کے لئے عذابِ دوزخ ہمیشہ جاری رہے گا اور مسلمان گنہگاروں کے لئے میعاد سزا مقرر ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ میں ہمیشہ سے عذاب میں مبتلا چلا آتا ہوں رہائی نہیں پاتا۔

قطعہ نعتیہ

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے　　لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

یہ شعر نعت میں ہے۔ بارگاہِ نبوت میں مرزا صاحب عرض کرتے ہیں کہ حضور کس واسطے مجھ کو عزیز نہیں رکھتے ہو کچھ لعل و گوہر زمرد تو نہیں ہوں، یعنی مال دنیا میں نہیں ہوں کہ جس کو آپ عزیز نہ رکھتے تھے۔

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ — رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

یعنی آپ میری آنکھوں پر قدم کیوں نہیں رکھتے۔ میں رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں۔ شب معراج میں تو آپ نے مہر و ماہ کو قدمبوسی کا موقع عطا فرمایا تھا۔

کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لئے — کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

مجھ کو قدمبوس ہونے سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔ آسمان پر تو حضور کے قدم گئے تھے، کیا میرا مرتبہ آسمان سے بھی کم ہے۔

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ادائے شکر کا نیا پہلو ہے۔ وظیفہ اس تنخواہ کو کہتے ہیں جو بلا معاوضہ خدمت کے ملا کرتی ہے باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

غزل

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اس شعر میں اہل ہنود کے عقیدۂ تناسخ کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں سب نہیں بلکہ تھوڑی سی حسین والوں کی صورتیں لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ہیں ورنہ بڑے بڑے حسین خاک کا رزق ہو گئے ہیں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

اس شعر میں بھی ابتدائے روزگار کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں ہم کو بھی تم لوگوں کی طرح سے رنگ برنگ جلسے کرنے کا شوق تھا لیکن شباب کا زمانہ گزر جانے سے اب ہمارا حال عبرتناک ہو گیا ہے وہ شوق اور وہ صحبتیں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں، ہم کو دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

شمال کی جانب آسمان پر سات ستارے ہیں۔ ان میں چار ستارے جنازہ ہیں اور تین جنازہ کے اٹھانے والے عرب ان کو لڑکیاں سمجھتے ہیں اور ہندوستان کی عورتیں سات سہیلیوں کا جھمکا کہتی ہیں۔ نام ان کا بنات النعش ہے۔ فرماتے ہیں۔ دن کو تو وہ آسمان کے پردے میں چھپی رہتی ہیں اور رات کو پردہ سے نکل آتی ہیں یعنی عریاں ہو جاتی ہیں۔

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

یعقوبؑ کی آنکھوں کو روزنِ دیوارِ زنداں قرار دیا ہے کس واسطے کہ جس طرح روزنِ زنداں ہر وقت یوسفؑ پر کشادہ رہتا تھا۔ اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں شب و روز یوسفؑ کی طرف نگراں رہتی تھیں۔ (از یادگار غالب)

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ سب عاشق تو رقیبوں سے ناخوش ہوا کرتے ہیں لیکن مصر کی عورتوں سے زلیخا خوش ہے کہ یہ عورتیں حضرت یوسفؑ پر عاشق ہو گئیں۔ یہ اشارہ ہے اس روایت کی طرف کہ جب زلیخا کا عشق حضرت یوسفؑ سے ظاہر ہو گیا تو زنانِ مصر زلیخا کو عاشق ہونے کے طعنے دیتی تھیں زلیخا نے اُن عورتوں میں سے بہت سی عورتوں کو منتخب کر کے ایک ایک لیموں اور ایک ایک چھری ہاتھوں میں دیدی اور کہا کہ جب تم حضرت یوسفؑ کو دیکھنا ان چھریوں سے یہ لیموں تراش لینا۔ جب حضرت یوسفؑ سامنے بلائے گئے تو ان عورتوں نے بجائے لیموں تراشنے کے اپنی اپنی اُنگلیاں کاٹ لیں۔ زلیخا نے خوش ہو کر عورتوں سے کہا کہ دیکھا تم تو مجھ پر طعنہ زن تھیں۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ شبِ تارِ فراق میں جو خون آنکھوں سے بہے گا میں اس کو یہ سمجھوں گا کہ دو موم بتیاں اندھیرے میں روشن ہو گئیں ہیں اور یہ تسکین خاطر کا سبب ہو جائے گا۔

اِن پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام　　قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ یہ معشوق جو دنیا میں ہم کو جلاتے ہیں۔ خلد میں ہم اپنا بدلہ ان سے لیں گے اگر خدا کی قدرت سے یہ عورتیں ہم کو حور بن کر مل جائیں گی۔

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں　　تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

یہ شعر مرزا صاحب کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے اس کی شرح اور تعریف بیان سے مستغنی ہے۔ اہلِ ذوق اپنے اپنے خیال کے موافق اس سے لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا　　بلبلیں سُنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ میرے باغ میں جانے سے بلبلیں غزلخوانی کر اُٹھیں جس طرح مکتب میں طالب علم سبق پڑھتے ہیں۔ قاعدہ ہے بلبل آوازِ خوش سُن کر زمزمہ سرائی کیا کرتی ہے۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار　　جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم کے سبب اُوپر نہیں اُٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔ (از یادگارِ غالب)

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے　　میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ میں نے آہوں کو بار بار ضبط کیا اور وہ بار بار اُبھرتی رہیں۔ اس لئے میری آہیں چاکِ گریباں کا بخیہ ہو گئیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آہوں کے ضبط کر لینے سے باوجود گریباں چاک ہونے کے عشق کا پردہ ہو گیا۔

واں گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب　　یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو درباں کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونی ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے اِس واسطے کہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے

کہ بتاؤں ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا جبکہ دعائیں بڑ چکیں (از یادگارِ غالب)

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا — سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ شراب جانفزا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا اس کے ہاتھ کی سب لکیریں سچ مچ رگِ جاں بن گئیں۔ گویا کا لفظ مبالغہ کم کرنے کی غرض سے یہاں استعمال ہوا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزا ایمان بن جاتی ہیں (از یادگارِ غالب)

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ آدمی جب رنج و غم کا عادی ہو جاتا ہے تو رنج کی سختی اور تکلیف کم ہو جاتی ہے مجھ پر اتنی مشکلوں کا ہجوم ہوا کہ وہ خود بخود آساں ہو گئیں۔

یونہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں — دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اس مقطع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ رونے کے اثر سے آبادیاں ویراں ہو جائینگی اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ سیلابِ اشک مکانوں کو ڈھا کر بستیوں کو ویران کر دے گا۔

غزل

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں — یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ یہ نئی دیوانگی ہے کہ جس نے ہمارے گریباں میں ایک تار بھی نہ چھوڑا، اگر دو چار تار بھی جنون کے ہاتھ سے بچ جاتے تو ہم ان ہی کو زنار سمجھتے اس لئے کہ مذہب صنم پرستی میں زنار کا ہونا ضرور تھا۔

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے — دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ دیدار کی تمنا میں جب ہم اپنے دل کو خاک میں ملا چکے، اس کے بعد اپنے امتحان کا

خیال آیا غور کرنے سے ثابت ہوا کہ دل کے مٹ جانے نے تاب و طاقتِ دیدار کو بھی مٹا دیا اب اگر وہ دیدار دکھائے بھی تو ہم میں جلوہ دیدار دیکھنے کی قابلیت اور ضبط کی طاقت نہیں رہی۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک حقیقت کے بیان میں ایسے تناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے اِس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو۔ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی اِس لئے کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں ہے اور اس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی (از یادگار غالب)

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں — طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ عشق کے بغیر عمر گزر بھی نہیں سکتی اور مصائبِ عشق برداشت کرنے کی دل میں طاقت بھی نہیں۔ مطلب یہ ہے زندگی بسر کرنے کے لئے دنیا سے تعلقات بھی قایم رکھنے پڑتے ہیں اور غمِ روزگار سے دل بھی اُکتا جاتا ہے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ شوریدہ سری نے گھر میں نہ ٹکنے دیا وحشت سے تنگ آکر سربصحرا نکل کھڑے ہوئے مگر اس وحشت سے نجات یہاں بھی حاصل نہ ہوئی۔ اب مشکل یہ آپڑی کہ جنگل میں سر پھوڑ کر مر جانے کے لئے دیوار نہیں ملتی۔

گنجایشِ عداوتِ اغیار یک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ گنجایشِ عداوتِ اغیار کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ عشق و ہوس کا زمانہ گزر جانے کے بعد یہاں یار سے بھی وہ دلی لگاؤ باقی نہ رہا۔

ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان   آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ خدا کو مان کر میرا دل نہ دُکھا۔ میرے نالوں سے حذر کر میری فریاد نوائے مرغِ گرفتار نہیں ہے جو بے اثر ثابت ہوگی خدا اس میں ضرور اثر کرے گا۔

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی   حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ ارادہ تو یہ ہے کہ فوجِ مژگانِ یار سے مقابلہ کروں اور حالت یہ ہے کہ دل میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ خلشِ خار کی بھی تکلیف برداشت کرسکوں۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ کون ایسا ہے جو یار کی اس سادگی پر قربان نہ ہو جائے۔ لڑتے ہیں یعنی اختلاط میں ہاتھا پائی کرتے ہیں، باوجودیکہ ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا   دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم نے اسدؔ کو خلوت و جلوت میں دیکھا ہے، اس سے ملے ہیں، باتیں کی ہیں وہ اگر تمہارے بیان کے موافق پورا پورا دیوانہ نہیں تو کامل ہشیار بھی نہیں ہے۔

غزل

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں   ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

فرماتے ہیں۔ بخیہ کے قابل کوئی زخم میرے جسم میں نہیں ہے یعنی ایسے بڑے اور گہرے زخم ہیں کہ جن میں ٹانکے نہیں لگائے جاسکتے، اس لئے تاگا چشمِ سوزن میں مایوسی سے تارِ اشک بن گیا ہے۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی   کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

فرماتے ہیں۔ جس ذوق و تماشا میں ہم نے رو کر گھر کی دیواروں کو گرانا چاہا تھا اسی خانہ ویرانی کے ذوق نے روزنِ دیوار کو پانی کے جھاگوں سے بند کردیا یعنی روئی کی طرح سے کفِ سیلاب روزنِ دیوار میں بھر گئے۔

ودیعت خانۂ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں
نگیں نام شاہد ہے مرے ہر قطرۂ خوں تن میں

فرماتے ہیں۔ میں امانت خانہ ہوں بیداد کاوشہائے مژگانِ یار کا جو خون کا قطرہ میرے جسم میں ہے وہ ایک نگینہ ہے مہر کا جس پر میرے معشوق کا نام کندہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں امانتدار مژگانِ یار کی کاوشوں کا ہوں۔ امانت پر جس طرح مہر لگا دی جاتی ہے اسی طرح میرے خون کے قطروں پر کاوشِ مژگانِ یار کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

فرماتے ہیں۔ میرے سیہ خانہ کی تاریکی کا حال کون بیان کر سکتا ہے۔ اگر اس کے روزنِ دیوار میں روئی رکھ دی جائے تو یہ معلوم ہو کہ چاند نکل آیا۔

نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

فرماتے ہیں۔ میرے احباب کی ملامت میرے جوشِ جنوں کو روک دینے والی ثابت ہوئی ہے اور ان کا خندۂ دنداں نما میرے چاک گریباں کا بخیہ بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے دوستوں کے طعنوں نے مجھ کو آوارگی سے روک دیا ہے۔

ہوئے اس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

فرماتے ہیں۔ اس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے روبرو آئینے کے جوہر اس طرح اڑتے ہیں جس طرح روزنِ دیوار میں شعاعِ مہر سے خاک کے ذرے اُڑتے ہیں۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

فرماتے ہیں۔ یہ تو میں بتا نہیں سکتا کہ اچھا ہوں یا برا ہوں لیکن صحبت مجھے مخالف آدمیوں کی نصیب ہوئی ہے یعنی اگر پھول ہوں تو بھاڑ میں ہوں اور اگر گھانس پھونس ہوں تو چمن میں ہوں۔

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

فرماتے ہیں۔ جوشِ جنوں نے ہم کو ہزاروں دل عطا کر دیئے ہیں یعنی دیوانگی کی وجہ سے جو خون سیاہ ہو گیا ہے اس کا ہر ایک قطرہ سویدا بن گیا ہے۔ سویدا دل میں ایک سیہ دھبہ ہوا کرتا ہے۔

اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفتہائے خوباں ہوں　　خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ حسینوں کی تاثیر محبت میرے لیے قید خانہ بن گئی ہے اور مہربانی سے جو معشوقوں نے میری گردن میں باہیں ڈالی ہیں وہ طوق گلو کا کام دے رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اسیر محبت ہوں۔

غزل

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں　　سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ دنیا کے کھانے پینے کے لطف میری نگاہوں میں خاک نہیں ہیں۔ یعنی مجھ کو ان میں خاک مزا نہیں آتا۔ البتہ خونِ جگر کے پینے میں مزا ملا کرتا تھا تو اب جگر میں خاک بھی نہیں ہے یعنی جگر میں خون باقی نہیں رہا۔ میں نے سب چٹ کر لیا۔

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے　　وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ شاید ایسا ہو کہ خاک ہو جانے کے بعد ہوا باغ تک اڑا لے جائے ورنہ بال و پر میں تو اب تاب و طاقت خاک بھی نہیں۔

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے　　کہ غیر جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ یہ کون سا بہشت شمائل تشریف لانے والا ہے کہ جلوۂ گل کے سوا رہ گذر میں خاک نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت میں خاک نہ ہوگی بہشت شمائل کی رعایت سے دنیا میں بھی جلوۂ گل کے علاوہ خاک کا نہ ہونا لطف سے خالی نہیں ہے۔

بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا　　اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر اس کو مجھ پر رحم نہ آیا نہ سہی مجھی کو اپنی حالتِ زار پر رحم آتا کہ میں اس نالہ کشی سے باز رہتا۔ مگر معلوم ہو گیا کہ میرے نالۂ بے اثر میں خاک اثر نہیں ہے۔

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش　　شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ خیال جلوۂ گل یعنی نشا کے طفیل سے میکش بدمست ہو رہے ہیں ورنہ شراب خانے

کی دیوار و در میں خاک نہیں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ زندگی کو پُر لطف بنانے والی شے محبت الٰہی ہے ورنہ اس ناپائدار دنیا میں کیا رکھا ہے۔

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ عشق وہ بلائے روزگار ہے جس گھر میں قدم رکھتا ہے اس کو برباد و غارت کر دیتا ہے۔ میں عشق کی غارت گری سے شرمندہ ہوں کہ میرے گھر میں سوائے حسرتِ تعمیر کے اور خاک بھی نہیں ہے۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہُنر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ اب ہم صرف اپنے دل بہلانے کی غرض سے شعر کہا کرتے ہیں۔ ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ اظہار کمال میں خاک بھی فائدہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب نہ لوگ خوشگوئی کی قدر کرتے ہیں اور نہ شعر کی خوبی سمجھ سکتے ہیں۔

غزل

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ظالم اپنے مظلوم عاشق پر ستم کے ساتھ یہ بھی تاکید کر رہا ہے کہ خبردار آنکھ سے آنسو کا قطرہ نہ ٹپکنے پائے اور عاشق مظلوم گڑگڑا کر اس سے کہتا ہے میرے سینے میں ٹوٹا ہوا دل ہے سنگ و خشت نہیں ہے کیوں نہ بھرے ہوئے ساغر کی طرح چھلک جائے میں تو ہزار بار اسی طرح روؤں گا کوئی مجھ کو کیوں ستائے کمال غصہ میں بجائے مخاطب کرنے کے کوئی کا لفظ استعمال کیا ہے جو ہزار ہزار حسن پیدا کرتا ہے۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

یہ شعر لاکھ نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔ ہر صاحب ذوق اپنے ذوق طبیعت کے موافق اس سے لطف اٹھا سکتا ہے۔

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

فرماتے ہیں۔ جب وہ جمال جس سے دل روشن ہے اور مہر نیمروز کی طرح اُس کے دیکھنے سے نگاہ قاصر ہے تو پردہ میں پوشیدہ کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ پردے میں نہاں نہیں ہے بلکہ آشکار ہے مگر پھر اس کو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔

دشنۂ غمزہ جانستاں ناوکِ ناز بے پناہ　　تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

فرماتے ہیں۔ ایسی صورت میں کہ دشنۂ غمزہ جانستاں ہے اور ناوکِ ناز بے پناہ ہے تیرے روبرو کسی کا آنا ہی بہتر نہیں ہے یعنی جو شخص آئے گا وہ مارا جائے گا اب اگر آئینہ تیرے سامنے آیا اور اس میں تیرا عکس دشنہ و ناوک لئے ہوئے تیرے مقابل ہو گیا تو بتا تیرا کیا حال ہو گا۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

فرماتے ہیں۔ جس طرح قیدِ حیات ایذا دینے والی ہے اِسی طرح بندِ غم تکلیف دہ ہے ان دونوں کی اصل ایک ہی ہے یعنی یہ دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آدمی مرنے سے پہلے غم سے نجات پائے۔

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم　　اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

فرماتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حُسنِ دلکش اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حُسن کی دلفریبی کا یقین بھی کامل ہے اِن دونوں باتوں سے بوالہوس کی شرم رہ گئی اس کو اپنی ذات پر اعتمادِ کلی حاصل ہے کہ جو مجھے دیکھے گا بغیر عاشق ہوئے نہ رہے گا پھر کیوں غیر کا امتحان کرے۔

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع　　راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

فرماتے ہیں۔ یہاں تو یہ پاسِ وضع ہے کہ ہم رستہ میں اس سے ملتے ہوئے شرماتے ہیں اور وہاں وہ غرورِ عز و ناز ہے کہ اپنی بزم میں ہم کو بُلاتے ہوئے اس کو ننگ آتا ہے۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی　　جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

ناصح نے جو عشق کی برائیاں اور معشوق کی بے دینی اور بے وفائی بیان کی ہے اس کے جواب

ہیں میرزا صاحب غصہ کے لہجہ میں فرماتے ہیں ہاں وہ خدا پرست نہیں ہے جاؤ وہ بے وفا سہی جس کو دین و دل پیارا ہو وہ اس کی گلی میں کیوں جائے۔ یعنی اے ناصح مشفق آپ وہاں جانے کی تکلیف نہ فرمائیے گا اور ہم تو نہ اُس کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ اس کی گلی میں جانے سے باز رہ سکتے ہیں۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں ۔۔۔ روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

میرزا صاحب اپنی وفات کے بعد اپنے دوستوں کو رنجیدہ و ملول پاکر تلقین صبر ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ غالب خستہ کے بغیر دنیا کے کون سے کام بند ہو گئے جن کی وجہ سے تم زار زار روتے اور ہائے ہائے کرتے ہو۔

غنچہ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں ۔۔۔ بوسہ کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں

فرماتے ہیں۔ میں نے جو یہ دریافت کیا کہ بوسہ کیونکر لیا جاتا ہے تو نے مُنہ بند کلی کو انگلی کے اشارہ سے دکھا دیا کہ دیکھ بوسہ لینے کی یہ صورت ہوا کرتی ہے۔ میں خاک نہیں سمجھا میرے پاس آکر اور میرا بوسہ لے کر مجھ کو بتا کہ دیکھ یوں لیتے ہیں۔

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے ۔۔۔ اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

فرماتے ہیں۔ دل چھین لینے کے طریقہ کو اس سے کیا دریافت کیا جائے اس کی تو ہر ادا سے یہ اشارہ پیدا ہوتا ہے کہ دیکھ دل یوں چھین لیا جاتا ہے۔

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے ۔۔۔ آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

فرماتے ہیں۔ یہ تو ہماری دلی آرزو ہے کہ وہ شوخ ہمارے گھر میں قدم رنجہ کرے لیکن خدا نہ کرے کہ وہ یوں آئے۔ یعنی شراب پی کر اور غیر کو ساتھ لے کر نہ آئے۔

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے ۔۔۔ سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

فرماتے ہیں۔ میں نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ رات کو غیر سے کیا بنی۔ اس کے جواب میں اس نے یہ کہا کہ میرے سامنے آبیٹھا اور اس ادا سے یہ ظاہر کر دیا کہ دیکھنا یوں یعنی میں

اُس کے سامنے اسی طرح دُور بیٹھا رہا۔

بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے اُسکی تو خاموشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

فرماتے ہیں اُس کے روبرو بزم میں کیونکر خاموش نہ بیٹھا جائے اس کی تو خاموشی میں بھی یہی مدعا نکلتا ہے کہ ہماری طرح تم بھی خاموش بیٹھے رہو۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ یوں

ستم ظریف وہ شخص کہ جس کے ستم میں ظرافت ہو۔ فرماتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ بزم ناز غیر سے خالی ہونی چاہیئے۔ یہ بات سُن کر اُس ستم ظریف نے مجھ کو اپنی بزم سے اُٹھا دیا کہ یوں خالی ہونی چاہیئے۔ یعنی ہماری بزم میں ایک تو ہی غیر تھا۔

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

فرماتے ہیں۔ مجھ سے یار نے یہ دریافت کیا تھا کہ ہوش وحواس کس طرح سے جاتے ہیں، میری بیخودی کو دیکھ کر ہوا چلنے لگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دیکھ بے ہوش یوں اُڑ جاتے ہیں۔

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

فرماتے ہیں۔ مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد نہ تھی۔ نقشِ پا نے مجھے سکھا دیا کہ دیکھ اسطرح خاک میں مل کر اور جلوۂ یار سے حیرت زدہ ہو کر معشوق کے کوچہ میں رہا کرتے ہیں۔

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

فرماتے ہیں۔ اگر تیرے دل میں یہ خیال ہو کہ وصل سے کامیاب ہو کر شوق کیونکر زوال پذیر ہو جاتا ہے اور عاشق ومعشوق میں اتحاد کامل کس طرح ہوتا ہے تو موجِ محیطِ آب کو دیکھ لے وہ بتا رہی ہے کہ یوں دست و پا مارتے مارتے انجام کار اتحاد پیدا ہو جاتا ہے جس سے اطمینان وسکون کی شکل نکل آتی ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی گفتۂ غالبؔ ایکبار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

ریختہ اُردو میں شعر کہنے کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں جو شخص یہ پوچھے کہ ریختہ کیونکر رشکِ فارسی ہوا

کرتا ہے تو غالب کے اشعار ایک بار پڑھ کے سُنا کہ یوں ہوتا ہے۔

ردیف (و)

غزل

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے بلکہ حقیقتِ واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چاردیواری میں محصور دنیا کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جس قدر اس کا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر اُس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جس پر حسد و رشک کیا جائے بلکہ ان کی محنت اور تدبیر کا نتیجہ ہے اور اس لئے انصاف اور فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو جس طرح شعراء نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے (از یادگارِ غالب)

بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

بقدرِ حسرتِ دل کے برابر ذوقِ گناہ بھی ہونا چاہیئے میں اپنے دامن کا ایک گوشہ تر کروں اگر سات دریاؤں کا پانی مجھ کو مل جائے۔ آبِ ہفت دریا سے کثرتِ معاصی کا استعارہ ہے۔

اگر وہ سروِ قد گرمِ خرامِ ناز ہو جائے کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

فرماتے ہیں۔ اگر وہ سروِ قد اپنے خرامِ ناز کے ساتھ گلزار کی سیر کو آجائے تو ایک ایک مٹھی

خاک گلشن کی قمری بناکر اس کے عشق میں نالے کرنے لگے۔ قمری کا رنگ خاکستری ہوا کرتا ہے۔

غزل

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں   بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

فرماتے ہیں۔ اگر میں ہندوستان سے ہجرت کر کے کعبہ میں جا رہا تو مجھ کو طعنہ کیوں دیتے ہو، میں بتکدہ کی صحبتوں کو بھولنے والا آدمی نہیں ہوں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ   دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

فرماتے ہیں۔ بہشت میں جو شہد و شربت کی نہریں ہیں ان کے لالچ سے اگر عبادت الٰہی کی تو کیا کی۔ بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیئے، جب بے غرض عبادت کا مزہ ہے۔

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے   ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سر نوشت کو

فرماتے ہیں۔ میں راہ و رسمِ ثواب سے برگشتہ کیوں نہ رہوں۔ کاتبِ تقدیر نے جس قلم سے میری سرنوشت لکھی ہے اُس پر قط ٹیڑھا لگا تھا۔ یہ وجہ ہے میری رسم ثواب سے برگشتہ ہونے کی۔

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے ملتا نہیں مجھے   خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ اپنی کوشش سے فائدہ اُٹھانا میری تقدیر میں نہیں لکھا۔ اگر ٹڈیاں میری کھیتی کو نہ کھالیں تو اناج کے خرمن میں آگ لگ جائے۔

غزل

وارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو   کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ ہم اس خیال سے آزاد ہیں کہ تم سے اِس بات کی فرمائش کی جائے کہ ہمارے ساتھ تم محبت کا برتاؤ کرو۔ ہاں یہ کہتے ہیں ہمارے ساتھ عداوت بھی کی جائے تو اس میں بھی غیر کی شرکت نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ دوستی اور دشمنی اِن دونوں باتوں میں سے ہمارے ساتھ وہ کرو جو دشمن کے ساتھ نہ کی جائے۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا   ہے دل پہ بارِ نقشِ محبّت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ ضعف نے مجھے ایسا سکھا دیا ہے کہ میرے جسم میں خون باقی نہ رہا اور خون باقی نہ رہنے سے رنگِ اختلاط بھی مٹ گیا۔ اب میرے دل پر نقشِ محبت بھی بار ہے۔

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہو

فرماتے ہیں۔ مجھ کو تم سے غیر کے ذکر کرنے کی شکایت ہے۔ باوجودیکہ تم نے اس کا ذکر شکایت آمیز لفظوں میں کیا ہے، مجھ سے اس کی شکایت نہ کیا کرو۔

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہو

فرماتے ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے۔ دنیا میں ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے۔ اگر یہ بات سچ ہو تو عشق کا بیمار اچھا ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہو

فرماتے ہیں۔ شکر ہے۔ میرا معاملہ میری بیکسی نے کسی غیر سے نہ ڈالا۔ کسی غیر شخص کا احسان مجھ پر نہ ہوا۔ اگر لوگوں سے مجھ کو کچھ نفع بھی نہ پہنچتا تو شرمندگی ضرور اُٹھانی پڑتی۔ اب اگر شرمندہ بھی ہوں تو اپنی ہی ذات سے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہو

فرماتے ہیں۔ تنہائی اور خلوت میں بھی تو خیالات اور تصورات کی ہنگامہ آرائی رہتی ہے۔ وہ کیا انجمن سے کم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تخلیۂ نفس نہایت دشوار کام ہے اور خطراتِ قلب پر قابو پانا اس سے بھی دشوار تر۔ یہ شعر تصوّف میں ہے۔

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہو

فرماتے ہیں۔ کسی شخص سے کچھ حاصل کرنا یعنی اس کا احسان لینا انفعال کا سبب ہے۔ اور شرمندگی حاصل کرنی کم ہمتی کا کام ہے یہاں تک کہ زمانہ سے عبرت بھی حاصل نہ کرنی چاہیئے۔

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہو

فرماتے ہیں۔ وارستگی اور آزادی اس کو نہیں کہتے کہ لوگوں سے وحشت اور بیگانگی کا برتاؤ

کیا جائے۔ اور یہ خیال موجب فخر و ناز ہو کہ ہم دنیا سے آزاد ہو گئے نہیں، بلکہ بیگانگی و وحشت اپنے نفس سے کی جائے، اس کا نام آزادی ہے۔

مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کوئی   عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ وقت کے ضائع ہونے اور گزرنے کا غم ایسا ہے کہ جس کا نعم البدل ممکن ہی نہیں۔ عمر عزیز اگر صرف عبادت بھی ہو تو بھی اس کا غم کرنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عبادت سے بڑھ کر اور کوئی اچھا کام کیا جاتا تو ممکن ہے کہ زیادہ موثر اور سود مند ہوتا۔

اس فتنہ خو کے ڈر سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ   اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ ہم تو اب اس فتنہ گر کے ڈر سے اُٹھتے نہیں۔ بلا سے ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ روز قیامت میں سب اُٹھیں گے مگر ہم جب بھی نہیں اُٹھیں گے۔

غزل

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو   مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

فرماتے ہیں۔ مجھے گرفتار رنج و محن اور سرگرم نالہ و فریاد دیکھ کر میرے وہ دوست جو زمانے کی گردشوں سے محفوظ اور دنیا کے رنج و آلام سے بچے ہوئے ہیں، کیوں نفرت ظاہر کرتے ہیں، میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے   نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

فرماتے ہیں۔ کہ تو، میں نے مانا کہ میرا سا جوش عشق اور نالۂ دلگداز میرے دشمن کو نہیں ملا ہے لیکن یہ رشک کیا کم ہے کہ میری طرح وہ بھی آرزوئے دوست رکھتا ہے۔ یا رب العالمین یہ آرزو دشمن کو نہ دی جاتی تو بہتر تھا۔

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر   کیا سینہ میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

فرماتے ہیں۔ تیری آنکھ سے ان زخموں کا حال سن کر ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ جن زخموں کو میرے

دل میں دیکھ کر سوزنِ غم کی آنکھوں سے خون جاری ہو گیا۔

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

میرزا صاحب نے اس شعر میں یہ شوخی بھر دی ہے کہ اپنے جوشِ عشق اور وفورِ شوق کا الزام بے گناہ ہاتھوں پر لگا دیا ہے۔

ابھی ہم قتلگہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

فرماتے ہیں۔ ابھی تک ہم قتل گاہ کا تماشا دیکھنا آسان ہی سمجھے ہوئے ہیں۔ تیری سواری کے گھوڑے کو خون کے دریا میں تیرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں ہمارا قاتل گروہِ عشاق میں سے ایک خوش نصیب عاشق کو انتخاب کر کے خنجرِ ناز یا تیغِ غمزہ سے شہید کر دے گا، یہ نہیں معلوم کہ اس تماشے کے بعد اتنے آدمی رشک سے اپنے گلے کاٹیں گے کہ خون کا دریا بہہ جائے گا۔

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

فرماتے ہیں۔ میری دیوانگی کا رتبہ اِس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ میرے پاؤں کی زنجیر بنائے جانے کا چرچا سن کر فولاد کو جوہرِ فولاد نے معدن میں بیتاب کر دیا۔ یعنی وہ یہ چاہتا تھا کسی طرح کان سے باہر آکر اس دیوانہ کی زنجیرِ پا بن جاؤں۔

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

فرماتے ہیں۔ میرے کھیت پر بار بار ابر کا آنا اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ میری زراعت کی پرورش کے لئے آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ بجلی ابھی سے میرے خرمن کو تلاش کر رہی ہے اور اس کی جستجو میں دوڑ دوڑ کر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے میں ایسا نامراد شخص ہوں کہ جس کی ساری کوشش بے کار ثابت ہوتی ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانہ میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے تو وہ اِس بات کا مستحق

ہے کہ اس کو کعبہ میں دفن کیا جائے اِس لئے کہ اس نے وفاداری کا پُورا پُورا حق ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے (از یادگار غالب)

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو — جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

فرماتے ہیں۔ میری قسمت میں مرتبۂ شہادت لکھ دیا گیا تھا اِسی واسطے مجھ کو یہ عادت عطا ہوئی تھی کہ جہاں تلوار کو دیکھتا تھا گردن جھکا دیتا تھا۔ گویا تلوار میری آنکھوں میں محراب عبادت کا کام دیتی تھی۔ نہایت بلیغ اور پُرلطف شعر ہے۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اِس شعر کا یہ مطلب ہے کہ انسان دنیا میں آرام اسی صورت میں پا سکتا ہے جب تعلقات دنیوی کو دل سے مٹا دے۔

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے — جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

فرماتے ہیں۔ جگر کاوی کے ساتھ شعر موزوں کرنا معدن کو کھود کر جواہر نکالنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ — فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

میرزا صاحب کا مدعا شاہ سلیمان جاہ کہنے سے یہ ہے کہ بادشاہ مسلمان تھے اور نہایت دیندار یہ سب بادشاہ جن کا مصرعۂ ثانی میں ذکر کیا ہے کافر تھے۔ وجہ فوقیت ثابت ہے۔

غزل

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو — رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

پانو دھو کر پینا۔ اظہار جوش محبت کا استعارہ ہے۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو — ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

میرزا صاحب کے زمانہ میں بیوقوف آدمی کو بنانے کے موقع پر کہا کرتے تھے کہ اس کے پانو پڑے اب ایسے موقع پر کہتے ہیں، ان کا پانو دھو جیے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ فرہاد نے بیوقوفی سے ایک عیار کے دم میں آکر جو پیرزن کا بھیس بدل کر آیا تھا جان دیدی۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہی یہ ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو
مطلب یہ ہے کہ تقدیر الٰہی کے خلاف کوشش بیکار ثابت ہوا کرتی ہے اور اکثر اسکا نتیجہ برعکس نکلتا ہے۔
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو
مطلب یہ ہے، جستجو سے جو ہر مراد ہمیشہ نہیں ملا کرتا کبھی مل جاتا ہے۔
اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو
فرماتے ہیں۔ شوق صحرانوردی مرنے کے بعد بھی میرے ساتھ ہے زندگی میں دنیا کے جنگلوں میں پھرتا تھا۔ موت کے بعد میدان عدم طے کر رہا ہوں۔ بالکل اچھوتا خیال ہے۔
ہے جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغ چمن کے پانو
میرزا صاحب نے اس شعر میں عجب نزاکت معنی سے کام لیا ہے۔ مطلب یہ ہے اس بہار کے ساتھ چمن میں بہار آئی ہے کہ جو پرندے باغ پر اڑتے ہوئے گزرتے ہیں۔ وہ تماشائے گل و لالہ دیکھ کر دل گرفتہ ہو جاتے ہیں اور آگے جانے کا ارادہ فسق کر کے وہیں اتر پڑتے ہیں۔
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں دُکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو
فرماتے ہیں۔ آج اس بت نازک بدن کے پانو دُکھتے ہیں۔ شاید کہیں گیا ہوگا جانے کے خیال کے ساتھ رشک نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ اس کا بیداری میں جانا بیان کیا جائے اس لئے یہ بات بنائی گئی کہ شاید وہ خواب میں کسی کے ہاں گیا ہوگا۔
غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو
خسرو شیریں سخن کا اشارہ بہادر شاہ ثانی المتخلص بہ ظفر آخر بادشاہ دہلی کی طرف ہے۔ باقی شعر صاف ہے۔

قطعہ

واں اس کو ہول دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
جوش محبت کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے معشوق کو کوئی تکلیف یا بیماری پیدا ہو جاتی ہے

تو عاشق اپنی آہ یا دعا یا جذبۂ دل کے اثر سے اس کا ہونا سمجھا کرتا ہے۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ — آئینہ تا کہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

فرماتے ہیں۔ جب تک دیدۂ شکار کا آئینہ روبرو نہ ہو وہ ستم آرا اپنا مُنہ نہیں دیکھتا ہے۔

غزل

واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو — صد رہِ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ کوچۂ یار میں پہنچ کر جو ہم کو پیہم غش آتا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ ہماری ناتوانی اور کمزوری میں یہاں تک پاؤں نے پہنچا دیا۔ اِس احسان کا ہم یہ بدلہ کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے قدم چومنے کے ارادے سے اس زمین پر گر پڑتے ہیں جس پر ہمارا نقشِ قدم ہوتا ہے۔

دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے — کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ دل کو میں محوِ وفا رکھتا ہوں اور مجھ کو دل محوِ وفا رکھتا ہے آپس میں ہم دونوں ایک دوسرے کو گرفتار وفا رکھنا چاہتے ہیں۔

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن — ترے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ چیونٹی کا نقشِ قدم ہم سے کمزور آدمی کے واسطے طوقِ گردن کا حکم رکھتا ہے اتنے بھاری بوجھ کو لے کر ہم کیونکر ترے کوچے سے بھاگ سکتے ہیں۔

جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سَم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ جان کر یعنی سمجھ کر ارادہ کے ساتھ مجھ سے چشم پوشی کیجئے تو مجھ کو رحم آجانے کی اُمید بندھ جائے لیکن ایسی ناآشنا نظر سے دیکھ لینا تو میرے لئے زہر سے کم نہیں ہے۔

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں — نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ ایک تو ہمنوائی کا رشک دوسرے درد فریاد کا اثر ان دونوں باتوں نے نالہ مرغِ سحری کو میرے واسطے جڑواں باڑھ کی تلوار بنا دیا ہے۔

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا — ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

اس شعر میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور تیرا سر کاٹیں گے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ تیرا سر کاٹنے کی ہم کو قسم ہے۔ ہم تیرا سر ہرگز نہ کاٹیں گے۔ محاورہ میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔ یعنی آج ہم کو پانی پینے کی قسم ہے تو آج ہم پانی نہ پئیں گے۔

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار ۔۔۔ پاس بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ دل کے خون کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ صرف اس مجبوری سے دل کو خون کرتے ہیں کہ بغیر اشک خونی کے آنکھیں ذرا بے رونق سی معلوم ہوتی ہیں۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ۔۔۔ ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

فرماتے ہیں تم اس قدر نازک ہو کہ فغاں ترک کر دینے کے بعد ہماری خاموشی کو بھی فغاں کہتے ہو۔ اور ہم اتنے کمزور ہیں کہ ستم موقوف کر کے تم نے تغافل اختیار کیا تو ہمارے حق میں اس نے بھی ستم کا کام دیا۔

قطعہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ۔۔۔ ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ لکھنؤ آنے کا کچھ سبب ہم پر ظاہر نہیں ہوا۔ یعنی سیر و تماشہ کی غرض سے انسان سفر کیا کرتا ہے تو دونوں باتیں نہیں ہیں۔

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر ۔۔۔ عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ یہ شہر سلسلۂ شوق کا مقطع نہیں ہے۔ یعنی اس کا ختم کرنے والا نہیں ہے۔ سیر نجف اور طواف حرم کا ارادہ ہم کو ہے۔

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ ۔۔۔ جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

میرزا صاحب بغرض استغاثہ پنشن کلکتہ جاتے ہوئے چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں ٹھہرے تھے، اس مقطع میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

غزل

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

فرماتے ہیں غیر کی رسم و راہ کے ساتھ اگر مجھ سے بھی ربط و ضبط رہے تو یہ کچھ بری بات نہیں ہے ترکِ ملاقات سے کیا فائدہ ہوگا۔

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے — قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

فرماتے ہیں۔ تم کسی طرح مواخذۂ حشر سے بچ نہیں سکتے۔ یہ میں نے مانا کہ میرا قاتل رقیب ہے یعنی اس کی طرح رشک نے مجھ کو قتل کیا ہے لیکن گواہی میں تم بھی ضرور پیش ہوگے۔

کیا وہ بھی بے گنہ کش و ناحق شناس ہیں — مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

فرماتے ہیں۔ کیا خورشید و ماہ بھی تمہاری طرح بے گناہ قتل کرنے والے اور حق نہ پہچاننے والے ہیں۔ یہ تو میں نے مانا کہ تم بشر نہیں ہو۔ خورشید جمال اور ماہ پیکر ہو۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار — مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

فرماتے ہیں۔ اس کی نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا ہے۔ مجھے اس کو دیکھ کر یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی مشتاقِ جمال کی نگاہ تو داخلِ نقاب نہیں ہو گئی ہے۔ میرزا صاحب نے اس شعر کا مصرعۂ اولیٰ بے مثل لکھا ہے۔ ثبوتِ دعوے کے واسطے اس سے بہتر خیالی کا بہم پہنچنا ممکن نہیں

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اِس شعر میں از راہِ تہذیب اس کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھٹ گیا، اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص از راہِ شوخی کے کی گئی ہے یعنی یہ مقامات جو اِس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔ (از یادگارِ غالب)

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

فرماتے ہیں۔ بہشت کی جو کچھ تعریف ہم سنتے ہیں وہ سب بجا ودرست ہے ہم کو اسکی اور خوبیوں سے کچھ غرض اور مطلب نہیں ہے لیکن خدا ایسا کرے کہ وہ تیری جلوہ گاہ قرار پا جائے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں　　دنیا ہو یارب اور میرا بادشاہ ہو

فرماتے ہیں۔ غالب کا سا باکمال شاعر اگر دربار میں نہ ہو تو اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا لیکن یارب دنیا ہو اور اس میں میرا ممدوح بادشاہ زندہ سلامت رہے۔

غزل

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو　　کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ وہ زمانہ گزر گیا کہ جب ہم یہ سوچا کرتے تھے کہ ان سے اظہار کی تمنا کی ابتدا کیونکر اٹھانی چاہیئے۔ خوش نصیبی سے ہمیں ایسا موقع مل گیا کہ بہت سی فکر کے بعد جو ایک تجویز ہم نے سوچی تھی اس کے موافق ہم نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور انھوں نے وہ سب سنی مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ اب کیونکر ہمارا کام بنے۔ مطلب یہ ہے ہم نے سب کچھ کہا مگر ان پر اثر خاک بھی نہ ہوا اور ہمارے کہنے کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا اب کیا کریں مجبور ہیں۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال　　کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ہمارے نزدیک اسی کا نام وصال ہے کہ پہروں بیٹھے ہوئے یہ سوچا کرتے ہیں کہ اگر وصل یار خدانخواستہ نصیب نہ ہوا تو ہم کیا کریں گے۔ کہاں جائیں گے اور اگر ہو گا تو کیونکر ہو گا اس کے لئے کیا سامان ہونے چاہئیں۔ کس قسم کی کوشش کی جائے۔

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجئے　　حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ ارمان۔ شوق۔ تمنا ہم کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنی مراد دلی حاصل کریں مگر ادب روکتا ہے اور ان دونوں فریقوں میں باہم کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی حیا ان کو صاف جواب نہیں دینے دیتی۔ ان کی طرف سے گومگو میں بات جا پڑتی ہے اب کامیابی

حاصل ہو تو کیونکر ہو۔

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا   بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ ہم تمہیں سے پوچھتے ہیں۔ تم ہم کو یہ بات بتا دو کہ صنم پرستوں کا گزارا یعنی ان کا حصول مدعا کس طریقہ سے حاصل ہو اگر سارے جہان کے معشوقوں کی ایسی ہی عادت ہو جائے کہ جیسی تمہاری ہے کسی بات کو مانتے ہی نہیں۔ ہر سوال پر انکار کر دیتے ہو۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ   جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اسکا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک، دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا ہی اپنی مانند گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا   وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

اس دن کی سیاہی کیسی ہو گی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے (از یادگار غالب)

ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر   ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ ہم کو ان سے کسی بھلائی کی اُمید کیونکر ہو اور ان کو ہم جیسے جانباز عاشق کی قدر ہو تو کیونکر جب وہ ہماری بات ہی نہ پوچھیں اور ہم سے اپنے دل کا کوئی مدعا بھی نہ کہیں اور جاں نثاری کا موقع بھی نہ دیں۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا   نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ ہمارا یہ گمان غلط نہ تھا کہ ان کے خط سے ہمارے دل کو تسلی ہو جائے گی ہمیشہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ معشوق کی تحریر سے عاشق کی بیتابی کم ہو جایا کرتی ہے مگر ہماری بد نصیبی سے دیدۂ دیدار طلب نے دلِ مضطر سے بھی زیادہ پاؤں پھیلائے وہ کمبخت کسی طرح اس کے خط سے بہلتا ہی نہیں اور یہی ضد کئے جاتا ہے کہ میں تو اس کا دیدار ہی دیکھوں گا اب تسلی ہو تو کیونکر ہو۔

بتاؤ اس کی مژہ دیکھ کر کہ مجھ کو قرار یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ اے حضرت ناصح آپ کا یہ ارشاد کہ تو بیتاب نہ ہو اور صبر کر میرے سر آنکھوں پر مگر اس ظالم کی پلکوں کو دیکھ کر فرمائیے کہ ایسے نشتر جب دل میں چبھے ہوئے ہوں تو صبر و قرار کیونکر ہو۔

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقول حضور فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ میں کچھ دیوانہ تو نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ بے قرار اور پریشان رہوں بقول حضور کے (حضور سے مراد ظل سبحانی بہادر شاہ ثانی المتخلص بہ ظفر بادشاہ آخر دہلی ہیں یہ مصرع ثانی ان کا ہے) فراق یار میں تسکین کا کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا اب تسکین ہو تو کیونکر ہو۔

غزل

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ کسی پر عاشق ہو کر فریاد و فغاں کرتے رہنا منافی شانِ عشق ہے۔ عاشق کو خاموش رہنا چاہیئے۔ گویا پردہ داریِ عشق شانِ عاشقی ہے۔ جب دل سینہ میں نہ ہو اور وہ کسی کو دیدیا جائے تو لازم ہے کہ زبان بھی منہ میں نہ ہو، اس کو بھی کاٹ کر پھینک دینا چاہیئے یا کیل دینا مناسب ہے۔ کیا خوب مطلع فرمایا ہے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

اس شعر کا مضمون نثر کے فقروں میں بھی اس برجستگی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا جس طرح میرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔ قادر الکلامی کی حد ہو گئی۔ فرماتے ہیں وہ اپنے روٹھے رہنے کی عادت نہ چھوڑیں گے۔ ہم اپنی خودداری کی وضع کیوں ترک کریں، حقیر بن کر ان سے کیا پوچھیں کہ تم ہم سے آزردہ کیوں ہو۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ راز عشق ہم نے تو چھپا لیا تھا مگر ہمارے غمخوار کی بیتابیوں نے اس کو ظاہر کر دیا

اِس محبت کو آگ لگے جس کی وجہ سے ہمارا غمخوار ہماری مصیبتوں کو دیکھ کر گھبرا گیا جو رنج و غم کی تاب نہ لا سکے وہ کمبخت ہمارا رازداں ہی کیوں بنے۔ ادائے مطلب میں بلاغت ختم ہو گئی۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ وفاداری کیسی اور عشق و محبت کیا۔ جب سر پھوڑ کر مر جانے ہی کی ٹھان لی تو پھر مذکورہ بالا دونوں باتوں کا پاس اور خیال کیسا اور جب سر پھوڑ کر مر جانے کی تجویز دل میں قرار پا ہی چکی تو پھر اے سنگدل تیرے سنگِ آستاں کو کیا احتیاج ہے۔ یہ نہیں اور کسی پتھر سے سر پھوڑ لیں گے، جواہر کے ٹکڑے ہیں الفاظ نہیں ہیں۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم   گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ اے ہمدم یعنی اے ہمصفیر تو آج ہی گرفتار ہو کر چمن سے آیا ہے اور میں بہت دنوں سے اسیرِ قفس ہوں۔ تو مجھے یہ تو بتا دے کہ چمن کی کیا حالت ہے اور تو اس کے بیان کرنے میں جھجکتا کیوں ہے۔ صاف صاف کہہ۔ رودادِ چمن بیان کر دے۔ کل جس آشیانہ پر بجلی گری ہے وہ شاید میرا آشیانہ ہو تو اس کے بیان کرنے میں پس و پیش نہ کر۔ ایسا بلیغ شعر اور پھر اس زمین میں مرزا کے سوا کون کہہ سکتا ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ   کہ جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اِس شعر میں مخاطب معشوقِ حقیقی ہے۔ فرماتے ہیں یہ تو تم کہہ نہیں سکتے کہ ہم دل میں نہیں ہیں، مگر ہم کو یہ بتا دو کہ جب دل میں تم ہی تم ہو اور کوئی دوسرا نہیں ہے تو پھر آنکھوں سے پوشیدہ کیوں ہو۔ جس طرح دل میں رہتے ہو اُسی طرح آنکھوں کے سامنے بھی رہا کرو۔

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے   نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ تم جو مجھ سے میرے جذبہ دل کی شکایت کرتے ہو کہ یہ ہم کو اپنی طرف کھینچتا ہے غلط ہے۔ خیال کر کے دیکھو اس میں قصور کس کا ہے، یعنی میرا یا تمہارا۔ اگر تم مجھ سے نہ کھینچو تو آپس میں کشاکش کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے کھنچتے ہو۔ میرا جاذبِ دل تم کو کھینچتا ہے

باہم کشمکش کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ یہ فتنہ یعنی تمہارا دوست ہونا خانہ ویرانی کے لیے کافی ہے۔ تم جس کے دوست ہو آسماں اُس کا دشمن کیوں ہو۔ یعنی تمہاری دوستی اس کے برباد کر دینے کے لئے ہر پہلو سے کافی ہے۔ آسمان کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ بھی دشمنوں میں اپنا نام لکھوائے۔

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ جب تم ہمیشہ کے واسطے دشمن کے ہو لئے اور اس کے عمر بھر نباہ دینے کا وعدہ کر چکے تو پھر میرے عشق و محبت اور وفا و مروت کا امتحان کیوں لیتے ہو تم میری آزمائش تو نہیں کرتے بلکہ ظلم کرتے ہو۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

فرماتے ہیں کہ تم نے جو یہ کہا کہ غیر سے ملتے ہیں، بدنامی و رسوائی کیوں ہو، کیا وجہ ہے، بجا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو۔ پھر دوبارہ تو کہو کہ ہاں رسوائی کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رسوائی تو ضرور ہو گی تمہاری خاطر سے کہو تو کہدوں کہ ہاں غیر سے ملنا رسوائی کا موجب نہیں ہے۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

میرزا صاحب نے یہ ساری غزل مرصع لکھی ہے۔ ایک ایک شعر کا جواب نہیں ہے اور مقطع سونے پر سہاگہ کا کام دے رہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ تو التجا کے موقع پر طعنے دے کر اپنا کام نکالا چاہتا ہے۔ اپنے دل میں یہ تو سمجھ کہ وہ تیرے بے مہر کہنے سے تجھ پر مہرباں کیوں ہو۔ خوبی اس مقطع میں یہ رکھی گئی ہے کہ معشوق کی عادت کو نئی شوخی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کہنے کے خلاف کیا کرتا ہے۔ اور یہ بات سمجھ کر اُس کو نامہربان کہا ہے کہ وہ اپنی قدیم ضد کے موافق مہربان ہو جائے، یعنی جو اس سے کہا جاتا ہے وہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

قطعہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہمزباں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں۔ مجھ کو اپنے دوستوں۔ ہموطنوں۔ ہمسایوں۔ ہمدموں، ہمسخنوں سے اتنے رنج و ملال پہنچے ہیں کہ اب میں ایسے مقام پر جا کر رہنا چاہتا ہوں کہ جہاں یہ سب ذات شریف نہ ہوں۔

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے　　کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں۔ کسی میدان میں لکڑیاں کھڑی کر کے ایک چھپر ڈال لینا چاہیئے جو گھر کا بھی کام دے اور اس میں در و دیوار بھی نہ ہوں۔ دروازہ نہ ہوگا تو پاسبان کی کیا احتیاج رہے گی اور دیوار نہ ہوگی تو کوئی ہمسایہ میں آکر کیونکر رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی سے میل جول نہ رکھا جائے تو رنج نہ پہونچے گا۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار　　اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں۔ ایسے غیر آباد مقام پر نصیبِ دشمناں اگر بیمار پڑ جائیے تو ان دشمنوں میں سے کہ جن سے رنج پہونچے ہیں کوئی تیماردار بن کر نہ آئے گا اور اگر خدانخواستہ مر جایئے تو ان ظالم دوستوں میں سے جنھوں نے تکلیفیں دی ہیں۔ بزم ماتم میں نوحہ خواں کوئی نہ ہوگا۔

(ردیف ہائے ہوز)

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ　　طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

فرماتے ہیں۔ مہر سے ذرہ تک عالم میں رخ و رخ اور دل و دل آپس میں آئینہ ہیں۔ اِس کو اُس میں اور اُس کو اِس میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سارا عالم متحد بہ وجود واحد ہے اور ایک ذات کو دوسری ذات سے غیریت نہیں ہے۔ یہ اس میں اپنے کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح آئینہ میں کوئی اپنی صورت دیکھے۔ جب یہ حال ہے تو طوطی شش جہت

میں سے جس طرف منہ کرے آئینہ اُس کے سامنے موجود ہے۔ طوطی کی مثال آئینہ سے استعارتاً لکھی گئی ہے۔ مراد اس بیان سے وہ صوفی شخص ہے جس کو یہ اتحاد باہمی دکھائی دیتا ہے اور وجد و حال کی حالت میں نعرۂ انا الحق بلند کرتا رہتا ہے۔

غزل

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ　　جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

فرماتے ہیں۔ میرے غمکدہ کے دیوار و در ایسے منہدم ہو گئے ہیں جن پہ برسات کے موسم میں ہری بھری گھاس اُگ کر سبزہ زار کا سماں دکھاتی ہے جس گھر کی بہار یہ ہو یعنی ایسا اجاڑ ہو گیا ہو اس کی خزاں کا حال نہ پوچھو کہ وہ کس قیامت کی ہو گی۔

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے　　دشواریٔ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

فرماتے ہیں۔ راہ کی دشواریاں اور ہمراہیوں کے ستم کا حال مجھ سے نہ پوچھو وہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ مجبور ہو کر میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ اب بیکسی اور تنہائی کی حسرت اٹھانی چاہیئے اور ایسے دشوار گزار راستہ میں اس قدر ظالموں کا ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔

ردیف (ی)

غزل

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے　　طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

فرماتے ہیں۔ سو جلوے روبرو ہیں، اگر آنکھ اُٹھا کر دیکھئے یہ طاقت کہاں ہے کہ دید کا احساں اٹھائیے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت کے گوناگوں تماشے نظر آ رہے ہیں۔ یہ کس میں طاقت ہے کہ ان سب کیفیتوں کو دیکھے اور سمجھے۔ آدمی دیکھتے دیکھتے تھک جاتا ہے اور اسکی قدرت کی نیرنگیاں ختم نہیں ہوتیں۔

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق　　یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھائیے

برات تنخواہ کی چٹھی کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ پتھروں پر معاش جنون عشق کی تنخواہوں کی چٹھیاں لکھی ہوئی ہیں اس لئے مناسب ہے کہ ابھی اور کچھ دن پتھر مارنے والے لڑکوں کا احسان اٹھاتے رہنا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ جنونِ عشق میں لڑکوں کے ہاتھ سے پتھر کھانے چاہئیں۔

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم　　اے خانماں خراب احساں اُٹھائیے

فرماتے ہیں۔ احسان اِس قدر بوجھل چیز ہے کہ دیوار میں بھی اس کے اٹھالینے کی طاقت نہیں ہے وہ بھی مزدور کے بارِ احسان سے خم ہو گئی ہے۔ اے خانہ خراب دنیا میں رہ کر کسی شخص کا احسان نہ اُٹھا اور دیوار کو دیکھ کر عبرت حاصل کر کہ ایسی مضبوط چیز بھی ایسے سنگین بار کو اُٹھانے کے بعد خم ہو گئی۔

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے　　یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

فرماتے ہیں۔ رشکِ رقیب کے زخم جو میرے دل کے اندر پڑ گئے ہیں اور وہ خندہ زن ہیں۔ یا تو ان زخموں کو رسوا نہ کیجئے اور یا ایسا کیجئے کہ پردہ میں رقیب کے ساتھ چھپ چھپ کر مسکرانا چھوڑ دیجئے۔

غزل

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے　　بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

شعرا آنکھ کو میخانہ اور ابرو کو محراب مسجد سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اے قبلۂ حاجات (یہ اشارہ واعظ یا شیخ یا زاہد کی طرف ہے) مسجد کے برابر میخانہ ضرور بنانا چاہیئے۔ جس طرح بھوں کے پاس آنکھ اللہ تعالیٰ نے بنا دی۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اِک اور شخص پر　　آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

فرماتے ہیں۔ ہم جس طرح آپ پر عاشق ہیں اسی طرح آپ بھی ایک اور شخص پر عاشق ہو گئے ہیں اور یہ راز ہم پر کھُل گیا ہے۔ آپ نے اپنے عاشقوں پر بہت سے ظلم روا اور ناروا کئے ہیں۔ آخر ان کا بدلہ کچھ تو آپ کو بھی خدا کی طرف سے ملنا چاہیئے۔

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی　　ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیئے

فرماتے ہیں۔ اے فلک بہت سی حسرتیں تو نے خاک میں ملادی ہیں۔ اب تو ان حسرتوں کی ہم کو داد ملنی چاہیئے۔ میرا دل حسرت پرست بہت مغموم ہوگیا ہے اور کوئی آرزو تو ہماری بھی پوری کردے کہ جس سے گزری ہوئی باتوں کی تلافی ہو جائے۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

فرماتے ہیں۔ خوبصورت لوگوں کے واسطے ہم نے تصویر کھینچنی سیکھی ہے یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ شاعری سیکھی ہے۔ معشوقوں کی ملاقات کے لئے کوئی ذریعہ ہونا چاہیئے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

فرماتے ہیں۔ مے پینے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ نشاط سرور حاصل کروں بلکہ میں تو رنج و غم فراموش کرنے کی غرض سے شراب پیتا ہوں۔ مجھ کو دن رات اک تھوڑی سی بیخودی درکار ہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

فرماتے ہیں۔ لالہ و گل و نسرین کا رنگ علٰحدہ علٰحدہ ہوتا ہے۔ یعنی لالہ بہت سے رنگوں کا ہوتا ہے مگر اس کے ہر رنگ کے پھول پر داغ ہوتا ہے۔ گل گلاب کے پھول کو کہتے ہیں۔ اس میں بھی بہت سے رنگ ہیں۔ نسرین بیشتر سفید ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ رنگوں یا صورتوں کے اختلاف سے غرض نہیں ہے۔ ہر رنگ میں بہار کا ثابت ہونا لازمی ہے۔ بہار سے یہاں ظہور ذات باری تعالیٰ کا خیال مقصود ہے۔ شعر تصوف میں ہے اور خوب ہے۔

قطعہ

سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بیخودی　　رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

فرماتے ہیں۔ بیخودی کے وقت سر کو پائے خم پر ہونا لازمی ہے اور مناجات کے وقت منہ کو قبلہ کی طرف ہونا لازمی ہے۔

یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات　　عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیئے

فرماتے ہیں بحسب منشاء گردش پیمانۂ صفات۔ عارف کو ہمیشہ مے ذات سے مست

و سرشار رہنا چاہیئے۔

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو   خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

فرماتے ہیں۔ اصل سے یعنی جڑ سے ٹہنیوں کا بڑھنا اور پھولنا پھلنا ہے۔ اے غالبؔ جو بات انسان کے منہ سے نکلتی ہے، پہلے آدمی اس کا مطلب سوچ سمجھ لیتا ہے جب زبان سے کسی بات کو نکالا کرتا ہے۔ اس سارے قطعہ میں ان ہی تصوف کے خیالات کو باندھا ہے اور ان شعروں میں یہ تین باتیں بیان کی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ تمام عالم اجسام کا مبدع جسم و شکل سے منزہ ہے اور اس عالم ظہور سے باہر ہے۔ جس طرح درخت کی شاخیں خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں لیکن سب کی سب جڑ سے پھوٹ کر نکلتی ہیں۔ مگر ان کی جڑ پوشیدہ ہے دوسری مثال یہ ہے کہ ہر بات خاموشی سے نکلی ہے۔ یعنی اس کے معنی اوّل ذہن میں گزرتے ہیں۔ بعدازاں اس سے بات پیدا ہوتی ہے اور خود معنی پوشیدہ ہیں۔ تیسری مثال یہ ہے کہ چمن میں بہت سے رنگوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہر رنگ کے پھول سے بہار کا وجود ثابت ہے اور خود آنکھوں سے نہاں ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رنگ برنگ کے پھولوں سے یہ سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ ہر رنگ میں انسان اپنے مبدع کو ثابت کرتا ہے۔ کبھی نشے میں سرشار ہے کبھی زاہدِ شب بیدار ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ دنیا کے یہ سارے رنگ ذات کی صفات ہیں اور یہ ساری صفتیں اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہو کر وجود ذات کی شہادت دیتی ہیں۔

غزل

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی   سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ بساطِ عجز میں ایک دل تھا اور وہ بھی صرف ایک خون کا قطرہ تھا اسکی حقیقت اس سے زیادہ کچھ بھی نہ تھی مگر ٹپکنے کے انداز سے وہ کمبخت بھی سرنگوں رہتا ہے۔ خبر نہیں کس وقت ٹپک جائے۔ انسان کے پہلو میں دل ایک رودے کے ذریعہ سے لٹک رہا ہے۔ اور اس کی وہی صورت ہے جو ٹپکتے وقت قطرۂ خوں کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے

کا سرمایہ جو کچھ تھا وہ ایک دل تھا۔ اب رنج وغم سہتے سہتے اس کی بھی یہ حالت ہو گئی ہے کہ خون کے قطرہ کی طرح ہر وقت ٹپک جانے پر آمادہ رہتا ہے۔

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے   تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ اس شوخ سے تھوڑے دن تک بناوٹ اور تصنع سے آزردہ خاطر رہے لحاظ پاس کیا وہ بھی ایک اندازِ جنون تھا پہلے مصرعہ میں تکلف کے معنی بناوٹ کے ہیں اور دوسرے مصرعہ میں شرم و لحاظ کے۔

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے   مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ ہمارا آزردہ وغمناک دل مرجانے کے خیال سے بھی کچھ خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ تمنا کے جال میں خیالِ مرگ بھی ایک مریل سا شکار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کے عذابوں سے مرنے کے بعد بھی چھٹکارا ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوتا اس لئے موت کا خیال بھی کچھ تسلی بخش نہیں ہے۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم   کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ اے ہمدم کاش میں نالہ نہ کرتا تو بہتر تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ دل کے چھپے ہوئے رنج وغم اس نالہ کے ذریعہ سے ظاہر ہو جائیں گے مطلب یہ ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ نالہ میں ضرور اثر ہوگا اور اس کے ذریعہ سے کوئی کامیابی کی صورت نکل آئے گی مگر اس کے بے اثر ثابت ہونے سے دلی صدمات اور زیادہ ہو گئے۔

نہ اتنا بُرشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ   مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ اے میرے قاتل برش تیغِ جفا پر تو ایسا مغرور کیوں ہے۔ یہ میں نے مانا کہ تیرے ستم کی تلوار مجھ کو قتل کر رہی ہے۔ مگر وہ کیا ہے میرے دریائے بیتابی کی اِک ادنیٰ سی موج خون ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دریائے بیتابی اس قدر موجزن ہو رہا ہے کہ اس میں ایسی ایسی سینکڑوں تلواریں میرے حلق پر چل رہی ہیں۔

مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے   لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ شرابِ عیش وعشرت کی خواہش ساقیِ فلک سے کس اُمید پر کی جائے۔ وہ بھی ایک دو چار اُلٹے ہوئے جام لئے بیٹھا ہے۔ ایک دو چار مل کر سات آسمان ہو گئے اور اُلٹے ہوئے جام خالی ہوا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان کے پیالوں میں شرابِ عشرت ہے کہاں جس کی ہم تمنا کریں۔

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں　　خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

یہاں تخلص نے عجیب لطف دیا ہے۔ دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ باقی مطلب تو صرف اتنا ہی ہے، خدا وہ دن دکھلائے جو میں اس سے شوقِ وصل بھی کہوں اور شکوۂ ہجراں بھی کروں یعنی کسی طرح اس سے ملاقات کا موقع ملے۔ یہ مقطع بے مثل لکھا ہے۔

غزل

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے　　تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

اِس مطلع میں دو معنی پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی محفلِ ناز میں رعبِ حُسن سے بات کرتے ہوئے میرا دل کانپتا ہے اور جو کہنا چاہتا ہوں وہ زبان سے ادا نہیں ہوتا۔ اس مطلب کو میرزا صاحب نے یوں فرمایا ہے کہ سخن خوشامد طلب ہو گیا ہے اِس لئے ہمارے ہونٹوں سے بار بار روٹھ کر یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی خوشامد کریں۔ ایسے خوشامد طلبوں سے ہم تنگ آ گئے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ معشوقوں کو خوشامد طلب کہا گیا ہے اور ان کی جا و بیجا خوشامد کرنے کی وجہ سے سخن ہمارے لبوں سے بیزار ہو گیا ہے۔

ہے دورِ قدح وجہ پریشانیِ صہبا　　یکبار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

فرماتے ہیں۔ صہبا تو باعثِ دلبستگی ہے اس کو پریشان کرنا زیبا نہیں ہے اور دورِ قدح وجہ پریشانی ہے یعنی تھوڑی تھوڑی شراب نکال کر جو لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے یہ بظاہر شراب کے پراگندہ اور پریشان ہونے کا سبب ہے ایک بار شراب کے مٹکے کو میرے منہ سے لگا دو کہ میں ڈگڈگا کر سارا مٹکا پی جاؤں۔ اِس صورت میں شراب ایک ہی جگہ رہے گی جگہ جگہ نہ پھیلے گی۔ اپنے مطلب کی بات

اِس خوبی سے اور دلیل کے ساتھ بیان کرنی لطف سے خالی نہیں۔

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد — زنہار نہ ہونا طرف اِن بے ادبوں سے

فرماتے ہیں۔ اے حضرتِ زاہد یہ رندوں کی بھیڑ جو درِ میخانہ پر جمع ہو گئی ہے یہ لوگ نہایت گستاخ اور حاضر جواب ہیں۔ خبردار آپ ان لوگوں کے منہ نہ لگئے۔ یعنی اِن پاک شہدوں کے سامنے شراب کی مذمت کا بیان نہ فرمائیے گا۔

بیدادِ وفا دیکھ کے جاتی رہی آخر — ہر چند مِری جان کو تھا ربط لبوں سے

فرماتے ہیں۔ باوجود کہ میری جان میرے لبوں کی قدم آشنا تھی اور دل سے بہت ہی محبت رکھتی تھی۔ ہمیشہ ہونٹوں پر رہا کرتی تھی۔ لیکن وفا کے ظلم دیکھ کر اس نے بے وفائی اختیار کر لی اور ہمیشہ کے لئے ان دوستوں یعنی لبوں سے رخصت ہو گئی۔

قطعہ

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا — سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ ہمارے معشوق نے یہ وضع اختیار کر لی ہے کہ اگر کوئی اس کے سامنے ہمارا ذکر چھیڑ دیتا ہے تو وہ اس کو منع نہیں کرتا کہ تو میرے سامنے یہ ذکر نہ کر چونکہ منع کرنے میں ایک قسم کی بے مروتی پائی جاتی ہے اِس لئے وہ اِس بات سے گریز کرتا ہے اور خود بھی ہمارا ذکر کبھی کِسی کے سامنے نہیں کرتا اور اِن دونوں باتوں سے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم کو اس سے شکایت کرنے کا بھی موقع نہ ملے۔

غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم ان کو — وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

کیا خوب مقطع فرمایا ہے اور الفاظ نے کس قدر بلاغت کے پہلو اختیار کر لئے ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ اے غالبؔ تیرا حال کسی خاص موقع پر اپنی جان پر کھیل کر ہم ان کو سُنا تو دیں گے یعنی آمدہ سخن یا کوئی بات کا پہلو نکال کر تیرا ذکر ان کے گوشگزار کر دیں گے لیکن اس بات کا ذمہ نہیں لے سکتے کہ وہ تیری محبت یا مصیبتوں کا حال سُن کر تجھ کو اپنی بزمِ ناز میں

باریابی کی اجازت بھی فرمادیں۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا　　وہ جو رکھتے تھے ہم اِک حسرتِ تعمیر سو ہے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ غمِ عشق نے ہم کو برباد کر دیا لیکن حسرتِ تعمیر کو وہ بھی غارت نہ کر سکا اور یہی حسرتِ تعمیر ہمارے گھر کی سب سے بڑی پونجی تھی۔ اِس کے سوا ہمارے جھونپڑے میں کچھ تھا ہی نہیں کہ جس کو غمِ عشق برباد کرتا۔

غزل

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی　　فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یعنی جب غمِ دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اُٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے۔ اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اس کے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے اب دوسرا غم شروع ہوجاتا ہے۔ غرضکہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔ (از یادگارِ غالب)

کھُلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب　　قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

فرماتے ہیں۔ دو صورتوں سے میرے خط کا مضمون اس پر ظاہر ہو سکتا تھا ایک اِس طرح کہ وہ میرے خط کو کھول کر پڑھتا تو اس کے مطالب سے خبردار اور آگاہ ہوجاتا۔ اِس بات کی تو اُس کافر سے اُمید ہی نہیں وہ کیوں میرا خط کھولے اور پڑھے۔ دوسری یہ صورت تھی کہ میرے خط کو غصّہ میں آکر جلا دیتا اور اس وقت میرے سوزِ عشق اور آتشِ فراق سے آگاہ ہوجاتا، مگر اس نے کاغذ کے جلانے کی قسم کھالی ہے یہ بھی اُمید قطع ہوگئی۔

لپیٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے　　ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

فرماتے ہیں کہ جامۂ حریر میں شعلۂ آتش کو لپیٹ کر باندھ لینا جو ناممکن ہے، ممکن سمجھا جاتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ دل میں سوزِ غم کو پوشیدہ رکھا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ دلِ عاشق پرنیاں سے بھی زیادہ نازک ہے اور سوزِ غمِ عشق شعلۂ آتش سے بھی زیادہ سرکش ہے۔

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا　　اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

فرماتے ہیں۔ ان کو اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا منظور تھا۔ اس کا اظہار غیروں کے روبرو صاف صاف تو وہ نہ کر سکے۔ یہ کہدیا کہ ذرا باغ کی سیر کو جاتے ہیں، گل و لالہ کا تماشہ دیکھیں گے۔ اس حیلہ سے اپنے زخمیوں کو دیکھ تو لیا مگر گل و لالہ کی سیر اور زخمیوں کا دیکھنا مساوی درجہ میں ان کے خیال کے موافق ثابت ہوا اور یہی بہانے کی شوخی تھی۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا تر آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

فرماتے ہیں۔ یہ ہماری سادگی یعنی حماقت تھی کہ تیرے التفات ناز پر فریفتہ ہو گئے۔ ہمارے گھر میں تیرا آنا آنا نہ تھا بلکہ جانے کی تمہید۔ مطلب یہ ہے کہ اسی غرض سے آیا تھا کہ تھوڑی دیر میں واپس جائے اور ہم تیرے فراق میں مہینوں تڑپتے ہیں۔

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

فرماتے ہیں۔ اب ہم ایسے کمزور ہو گئے ہیں کہ بارِ حوادث بھی اٹھاتے ہوئے ہچکے جاتے ہیں۔ وہی ہم تھے کہ بتوں کی ناز برداری کی طاقت رکھتے تھے۔ گویا زمانے کے حوادث و آفات بتوں کے ناز و انداز سے بوجہ بہار ہیں کم ہیں۔

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ بدی کی اُس نے جس سے ہمنے کی تھی بار ہا نیکی

اس قافیہ کو معمولہ کہتے ہیں۔ ایک دو شعروں میں ایسا قافیہ باندھنا حُسنِ کلام سمجھا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ابنائے زماں کی کچھ ایسی وضع ہو گئی ہے کہ ہم ان کی خوبی بیان ہی نہیں کر سکتے، ہم نے جس سے بار ہا نیکی کی تھی اُسی نے ہمارے ساتھ بُرائی کی اُوپر کے مصرعہ میں خوبی کا لفظ طنزاً استعمال ہوا ہے جو بُرائی کے معنی دیتا ہے۔

غزل

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

ڈوبی ہوئی اسامی زمینداروں کی اصطلاح میں اُس کاشتکار کو کہتے ہیں جس کو کسی افتادگی کی وجہ سے نقصان پہنچا ہو اور مالگذاری کا روپیہ مہاجن کا قرضہ اُس کے ذمہ ایسا باقی ہو جس کی وصولی

کی اُمید قطع ہو گئی ہو۔ اور جواریوں کی اصطلاح میں اُس شخص کو کہتے ہیں جو ہمیشہ ہارتا رہتا ہو میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دل جوشِ گریہ میں اثرِ گریہ کو اپنی بدنصیبی سے کھو بیٹھا ہے۔ اثرِ گریہ گویا حاصلِ گریہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے آرزو تو گریہ پر بھروسہ کرکے اپنی مراد دلی حاصل کرنی چاہتی ہے اور گریہ کی بے اثری دل کو لے ڈوبی ہے، تیرے حسبِ مراد کوئی کام نکلتا معلوم نہیں ہوتا۔

اِس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے　　　میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

فرماتے ہیں۔ داغ ناتمامی ہوں۔ یعنی مجھ کو اپنے ناتمام رہنے کا داغ اس شمع کی طرح سے ہے جس کو کسی قدر جل چکنے کے بعد کوئی شخص ارادتاً گل کر دے اور وہ ناتمام اور ناکام رہ جائے۔

غزل

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے　　　جسمیں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

فرماتے ہیں۔ ہم ستم کے مارے ہوؤں کا جہان ایسا چھوٹا سا ہے کہ اس جہان کا آسمان صرف ایک چیونٹی کا انڈا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مظلوم آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرے واسطے دنیا سمٹ کر بہت ہی تنگ دائرہ میں آگئی ہے۔ نہ کوئی میرا معاون ہے نہ فریاد رس۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے　　　پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

فرماتے ہیں۔ ساری کائنات نے تجھ کو اپنا مبدء و اصل قرار دے لینے کے بعد فطرت کے تقاضائے لازمی سے تیری جانب اپنی ساری توجہ مبذول کر دینے کے بعد رجوع کی ہے جس طرح آفتاب کی روشنی سے خاک کے ذرّوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ ذرّات کی حرکت کو جان پڑ جانے سے محمول کیا ہے جس میں عجیب لطف پیدا ہو گیا ہے۔

حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ　　　غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

فرماتے ہیں۔ حقیقتِ حال تو یہ ہے کہ میرے شیشۂ دل کو سنگِ خارا کی چوٹ یعنی زمانے کی سختی نے لال کر دیا ہے جس کا اثر میری آنکھوں کو سُرخ رکھتا ہے۔ آنکھوں کی سُرخی اکثر نشاط کی وجہ سے

بھی ہوا کرتی ہے اِس لئے ناواقف لوگوں کو یہ گمان ہے کہ میرا شیشۂ دل شراب سے لبریز ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔

اس واسطے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا آئے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

فرماتے ہیں۔ رقیبوں کے دل میں ہماری طرح سوزِ عشق کی آگ نہیں ہے اور اِسی لئے معشوق نے رقیبوں کے دل میں جگہ کر لی ہے۔ ٹھنڈے مکان میں رہنا ہر شخص پسند کرتا ہے اور جس دل میں آتشِ عشق نہیں ہے وہ ضرور سردخانہ کا کام دے گا۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ رہو ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے

ہمارے بھی منہ میں زبان ہے۔ اِس میں دو معنی رکھے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دیں گے۔ اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا دیں گے کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں (از یادگارِ غالب)

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

فرماتے ہیں۔ جو عاشق سایۂ دیوارِ یار میں بیٹھا ہوا ہے وہ گویا کشورِ ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ ہندوستان کی تخصیص باعتبار رنگ سایہ کے ہے۔ یعنی سایہ بھی کالا ہوتا ہے اور ہندوستان کالا ملک سمجھا جاتا ہے۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کِس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

یہ مضمون بالکل اچھوتا مضمون ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہجوم غم نے میرے جگر پر داغ ڈال دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اِس داغ نے جگر کو نوش جان فرما لیا۔ داغ ہی داغ باقی رہ گیا۔ جگر کی ہستی مٹ گئی۔ اب اگر کسی سے یہ کہتا ہوں کہ کبھی میں بھی جگر رکھتا تھا اور اب تک اسکی نشانی یعنی داغ میرے سینہ میں موجود ہے تو کسی شخص کو میرے کہنے کا یقین نہیں آتا۔

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر غالبؔ ہم اسی میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

فرماتے ہیں۔ ہماری وفاداری پر اس کو ایسا بھروسہ اور یقین کامل ہے کہ باوجود نامہربان ہونے

اور ستم کرنے کے کبھی اُس کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ غالب ہماری بے رُخی سے ترکِ محبت کرے گا۔

غزل

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

یہ ساری غزل قطعہ بند اور معشوق کا مرثیہ ہے اس کو نزع میں دیکھ کر فرماتے ہیں کہ میں تجھ کو اس حالت میں دیکھ کر دردمند ہو رہا ہوں اب تو اس حال میں بھی میرا رنج و غم گوارہ نہیں کرتا۔ اور میرے تڑپنے سے تو خود بھی بیقرار ہو رہا ہے۔ تیری وہ غفلت شعاریاں کیا ہوگئیں جب میری جان پر بنی تھی اور تو میری بات بھی نہ پوچھتا تھا۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ　　تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ اگر ترے دل میں غم کی سختیاں اُٹھانے کی برداشت نہ تھی تو تو نے میری غمگساری کا دعوئی ہی کیوں کیا تھا۔ یعنی مجھ سے تجھے ملنا ہی نہ تھا اسی طرح ناآشنا رہتا۔

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال　　دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ کاش تو میرا غمخوار نہ بنا ہوتا اور میرے ساتھ غمخواری کرنے کا خیال تجھے پیدا نہ ہوا ہوتا تو نے مجھ سے غمخواری کر کے اپنے کو رسوائے خلق کر لیا اور انجام کار رسوائی کے خوف سے اپنی جان دے دی۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا　　عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ تو نے تمام عمر وفاداری کے ساتھ ملتے رہنے کا مجھ سے عہد بھی کیا تو کیا تیری عمر ہی نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور مجھے تڑپتا ہوا چھوڑ کر تجھ کو دنیا سے جانا پڑا۔

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی　　یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ میرے لئے زندگی کی آب و ہوا زہر کا اثر رکھتی ہے۔ جب اس نے تجھ سے وفا نہ کی تو میں بھی ایسی زندگی کو موت سے بدتر سمجھتا ہوں۔

گلفشانیہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا　　خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ تیری جلوہ افروزی کے وقت تیرے ناز و انداز سے جو پھول جھڑا کرتے تھے وہ کیا ہو گئے۔ یا تو وہ زمانہ تھا یا اب یہ وقت آ گیا کہ تیری قبر پر پھول رکھے ہوئے ہیں۔

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں　　ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ رسوا ہو جانے کی شرم سے تو زمین کا پیوند ہو گیا اور تو نے خاک کی نقاب اپنے چہرے پر ڈال لی۔ تجھ سے زیادہ دنیا میں محبت کا پردہ پوش کون ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خوفِ رسوائی سے تو نے اپنے کو ہلاک کر لیا۔

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی　　اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ تیرے مر جانے سے ناموسِ پیمانِ محبت خاک میں مل گئی گویا دوستی کی راہ و رسم ہی دنیا سے اُٹھ گئی۔ یعنی تیرے بعد اب کوئی معشوق وفادار زمانہ میں پیدا نہ ہو گا۔

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا　　دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ افسوس کی جگہ ہے کہ دستِ قاتل بیکار ہو گیا۔ مجھ کو تو یہ آرزو تھی کہ میرے دل پر اس کے ہاتھ سے تلواروں کے زخم لگتے وہ آرزو میری پوری ہونے نہ پائی۔ زخم اُٹھانے کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے ناز و انداز کے لطف حسبِ دلخواہ حاصل نہ کر سکا۔

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشگال　　ہے نظر خوکردۂ اختر شماری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ ہم کو تو اِس بات کا مزا پڑا ہوا تھا کہ انتظار کی گھڑیاں اور فراق کی راتیں تارے گن گن کر بسر کرتے تھے۔ اب یہ برسات کی اندھیری راتیں کیونکر ہم سے کٹیں گی۔ شبہائے غم کو شبہائے تار سے تعبیر کیا ہے اور برسات رونے کا استعارہ ہے۔

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال　　ایک دل اس پر یہ نا اُمیدواری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ کان تو پیامِ یار کے ہجر میں مبتلا ہیں اور آنکھیں جمالِ یار سے محروم ہو گئی ہیں۔ میرے ایک دل پر یہ دو مصیبتیں نا اُمیدواری کی بلائیں نازل کر رہی ہیں۔

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ اے غالب میرے عشق نے ابھی تک وحشت کا رنگ اختیار نہ کیا تھا۔ یعنی ابھی میں نے ہرزہ گردی و دشت نوردی نہ کی تھی کہ رسوائی کے ڈر سے میرے معشوق نے اپنی جان دیدی۔ اور میرے دل میں ذوقِ خواری اسی طرح رہ گیا۔

غزل

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

فرماتے ہیں۔ اپنی سرگشتگی کی وجہ سے زندگی سے نا اُمید ہو گیا ہوں۔ اب تسکین کو مبارکباد دینی چاہیئے کہ موت آجانے کے بعد یقینی سرگشتگی سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

فرماتے ہیں۔ میرا دل میرے اختیار سے باہر ہو کر آوارگی پسند ہو گیا ہے لیکن معشوق کو اب تک یہی یقین ہے کہ وہ میرے ہی پاس ہے۔ اسی یقین کے بھروسہ پر وہ میرے دل سے بے پرواہ ہو گیا ہے اور اس کی خبر نہیں لیتا ہے۔

کیجے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

فرماتے ہیں۔ تپِ غم کے بڑھنے سے جو خوشی حاصل ہوئی ہے کہاں تک اس کا بیان کروں۔ مختصر یہ ہے کہ رونگٹا رونگٹا میرے جسم کا شکر گزاری کے واسطے زبان بن گیا ہے۔ جاڑے کے بخار میں جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

فرماتے ہیں۔ میرا دل حق شناس تو اسی کے پاس رہا کرتا ہے اور مجھ کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ اس ظالم کو میرے دلِ حق شناس نے رسم و راہ وفا سے بخوبی خبردار کر دیا ہوگا، مگر وہ اپنے غرورِ حُسن میں کسی کی سُنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک رسم و راہ وفا سے بیگانہ رہا۔

پی جس قدر ملی شبِ مہتاب میں شراب اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

فرماتے ہیں. شبِ مہتاب میں جس قدر شراب میسر آسکی میں نے پی لی۔ میرا مزاج بلغمی ہے اور بلغمی مزاج والے کو حار چیزیں ہمیشہ مفید ہوا کرتی ہیں. شراب کو آتشِ تر سے تعبیر کرتے ہیں جو اس کی گرم مزاجی کا ادنیٰ ثبوت ہے اور شبِ مہتاب بھی ٹھنڈی ہوا کرتی ہے۔ اس وجہ سے شبِ مہتاب میں شراب کا استعمال زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ　　مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ ہر مکان کو مکیں سے شرف حاصل ہوا کرتا ہے۔ جنگل کی آبادی مجنوں کے دم سے تھی۔ اس کے مر جانے کے بعد جنگل اُداس ہو گیا ہے۔

غزل

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

فرماتے ہیں۔ اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ دل کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اور رازِ دل چھپا رہتا ہے تو میں اپنی گفتگو سے بھی خوش ہوں۔ یہ بھی خاموشی کے برابر کام دیتی ہے اِس لئے کہ میری بات کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ خاموشی اور گفتگو کو مساوات کا درجہ دینا بہت بلیغ خیال ہے۔

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ　　دل فردِ جمع و خرچِ زباںہائے لال ہے

فرماتے ہیں۔ حسرتِ اظہار۔ زبان کے گویا نہ ہونے کی گلہ مند ہے۔ میں کس کے آگے جا کر اس کا دُکھڑا روؤں اور دل میرا ایک فردِ حساب ہے جس پر جمع و خرچِ زباںہائے لال کا حساب رقم ہے مطلب یہ ہے کہ حسرتِ اظہار ان لوگوں سے گلا مند ہے جو گونگوں کی طرح زبانوں کو منہ میں رکھتے ہیں۔ یعنی مجھ سے میری مصیبتوں کا حال نہیں پوچھتے۔ باوجودیکہ میرے چہرے سے حسرتِ اظہار ظاہر ہو رہی ہے۔

کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا　　رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

فرماتے ہیں۔ اے خدا تیری رحمت کس پردہ میں چھپی ہوئی آئینۂ بخشش کی جلا کر رہی ہے اور کیوں پردہ سے باہر نہیں آتی اب تو اُسے ظاہر ہو جانا چاہیئے اِس لئے کہ میرا لبِ بے سوال

عذر خواہ معصیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے لب رحمت کا سوال اِس شرم سے نہیں کرتے کہ میں نے بے انتہا گناہ کئے ہیں۔ اور میری یہ خاموشی گویا میرے گناہوں کا عذر ہے۔ اِس صورت میں اظہار رحمت ضروری ہے۔

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی　　اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

فرماتے ہیں۔ اے شوق محبت تو جو اس خیال سے منفعل ہو رہا ہے کہ اس شوخ نے تیرے ساتھ دشمنی برتی یا برتے گا۔ ہے ہے خدا نخواستہ وہ ایسا کیوں کرنے لگا۔ یہ خیال تیرا بالکل غلط ہے۔

مشکیں لباس کعبہ علیؑ کے قدم سے جان　　نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

یہ شعر منقبت میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ غلاف کعبہ کو مشک آگیں علی کے قدم سے جانو یعنی خانۂ کعبہ سے جو فیض و برکت تمام دنیا کو پہنچ رہا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے خانہ کعبہ کی دیواروں سے بتوں کو توڑ کر نکالا ہے۔ اگر بت نہ توڑے جاتے تو اس پر کفار کا قبضہ رہتا مسلمانوں کو اس سے فیض نہ پہنچتا اور خانہ کعبہ زمین کی ناف ہے۔ نافِ غزال نہیں ہے جس میں مشک ہوتا ہے۔ مشک کے اعتبار سے خانہ کعبہ کو مشکیں لباس نہ سمجھنا چاہیئے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت پیدا بھی خانۂ کعبہ میں ہوئے ہیں۔

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا　　دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

فرماتے ہیں۔ میدان دنیا میری صحرا نوردی کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اور اِس لئے زمین عرقِ انفعال میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ دریا اور سمندر گویا زمین کے واسطے عرقِ انفعال کا حکم رکھتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ یہ ساری دنیا صرف خیالی اور اعتباری وجود رکھتی ہے یہاں اپنے موجود ہونے کو بھولے سے اپنی ہستی نہ سمجھ لینا۔ یہ سارا عالم حلقۂ دامِ خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

غزل

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو　　حذر کرو مرے دل سے کہ اسمیں آگ دبی ہے

فرماتے ہیں۔ تمہاری شکایتیں میرے دل میں اسی طرح چھپی ہوئی ہیں جس طرح چولھے میں آگ دبی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر تم انھیں کھود کھود کر اور کرید کرید کر پوچھو گے تو ان باتوں کا شکایت آمیز اظہار دشمنی کی آگ کو مشتعل کر دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ دوستوں میں اکثر شکوہ و شکایت سے رنج پیدا ہوتا ہے۔

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

فرماتے ہیں۔ یہ درد و الم کا نتیجہ ہونے والا ہے کہ ایک دن ہم مر جائیں گے اور پھر نہ گریۂ سحری باقی رہے گا نہ آہِ نیم شبی کا وجود ہوگا۔ اے دل درد و غم کی حالت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ جس وقت تک یہ ہے ہماری زندگی بھی ہے۔

غزل

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا ظاہراً کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار اُس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بآسانی کزلک وغیرہ سے اُڑ سکے اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں ازراہِ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے ہیں جس پر سے حرف غلط خود بخود اُڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے (از یادگار غالب)

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

فرماتے ہیں۔ ہر سانس سینے کے اندر پہنچ کر اشتعال پیدا کرتا ہے اور یہی اشتعال زندگی کا باعث ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر اشتعال میں جسم کا انس اور بدن کا حصّہ فنا ہوتا ہے۔ اس سے یہ امر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ بمقتضائے فطرت و طبیعت ہر ذی حیات کو فنا کا ذوق ہے۔ یعنی یہ وہی اشتعال ہے جو فنا کرتا ہے اور حیات بخشتا ہے۔ اس ذوقِ فنا کی ناتمامی پر دل جلتا ہے کہ ایک بار جسم کو جلا کیوں نہیں دیتا۔

آگ سے پانی میں بُجھتے وقت اُٹھتی ہی صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے لاچار ہے

فرماتے ہیں۔ آگ ایک خاموش چیز ہے۔ غُل شور سے تعلق نہیں رکھتی لیکن جب اسے پانی میں ڈال دیتے ہیں تو اس میں سے بھی ایک آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہر کوئی مصیبت کے وقت نالہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے:

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق عذر خواہ۔ معافی چاہنے والا یا معذور رکھنے والا۔ اِس شعر میں دعویٰ ایسے طریقہ سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرّات عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں۔ ان کی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پرتو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں (از یادگار غالب)

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی — زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بیزار ہے

فرماتے ہیں۔ تو مجھ سے یہ نہ کہہ کہ تو ہمیں اپنی زندگی کہا کرتا تھا۔ جب میں ایسا کہتا تھا وہ اور وقت اور زمانہ تھا۔ اب تو اپنی زندگی سے بھی میرا جی بیزار ہو گیا ہے۔

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا — تجھ پہ کھُل جائے کہ اسکو حسرتِ دیدار ہے

فرماتے ہیں۔ میں نے لفافہ خط پر بجائے پتہ لکھنے کے آنکھ کی تصویر قلم سے بنا دی ہے اور اس سے میرا مدعا یہ ہے کہ تجھ پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ کاتبِ خط کو حسرتِ دیدار بہت زیادہ ہے۔

شعر

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

فرماتے ہیں جس طرح میری صورت سے ان کو نفرت ہے۔ اسی طرح میرے محلہ سے بھی ہے میرے کوچہ میں اتنی دیر توقف فرمانا بھی گوارا نہیں ہوتا کہ جتنی دیر میں کہار کندھا بدل لیتے ہیں۔ اس لئے کہاروں پر تاکید ہوتی ہے کہ اس کوچہ سے باہر نکل کر کندھا بدلنا یہاں سے جلد گزر جاؤ۔

غزل

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے جسے کہتے ہیں نالہ وہ اِسی عالم کا عنقا ہے

فرماتے ہیں، میری ہستی آباد تمنا کو رونق بخشنے والی ہے۔ نالہ و فریاد جس آواز کا نام اہلِ دنیا نے مقرر کر لیا ہے وہ اس عالم کا عنقا ہے۔ یعنی کسی قسم کی آواز بلند ہی نہیں ہوتی۔ صوفیا کی اصطلاح میں مقام حیرت اس مقام کو کہتے ہیں جہاں طالب پر تجلی ذات وارد ہوتی ہے۔

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

میرزا صاحب نے چھ جملے دو مصرعوں میں عجیب حُسن و خوبی کے ساتھ ادا کر دیئے ہیں اور اس میں لطف یہ ہے کہ یہ سب جملے زبانِ بلبل سے ادا کیئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں ہمیں معلوم نہیں خزاں کس کو کہتے ہیں اور بہار کس کو کہتے ہیں۔ ہماری حالت کسی موسم میں بدلتی ہی نہیں۔ ہم وہ بلبل گرفتار ہیں کہ قفس میں مدت سے بند ہیں اور ہمیشہ بال و پر کے ماتم میں گرفتار ہیں۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

فرماتے ہیں وفادار معشوق کا مل جانا خوش نصیبی سے اتفاقیہ امر ہے ورنہ اے ہمدم فریاد کے اثر اور محبت کی تاثیر کے ہم قائل نہیں ہیں۔ یعنی نہ محبت کے اثر سے معشوق رام ہوتا ہے نہ آہ و نالہ کی تاثیر کارگر ہوتی ہے۔

نہ لائے شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

فرماتے ہیں۔ شوخی اندیشہ سے ناامیدی اور مایوسی کا صدمہ نہیں اُٹھ سکتا اِس واسطے ایسی تمنا میں ہمیشہ مبتلا رہنا مایوس ہو جانے سے بدرجہا بہتر ہے اِس لئے کفِ افسوس کا ملنا ناامیدی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دوبارہ تمنا سے تجدید بیعت کرنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو یاس کے عالم میں کفِ افسوس ملتا ہوں یہ ناامیدی کی وجہ سے نہیں ملتا بلکہ تمنا کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کرتا ہوں۔ بیعت کرنے کے وقت مرید اپنے دونوں ہاتھوں میں پیر کا ایک ہاتھ تھام کر توبہ استغفار کرتا ہے اور کفِ افسوس ملنے کی بھی یہی صورت ہوتی ہے۔

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے ‏ ‏ ‏ نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

چراغِ کشتہ استعارہ ہے بیمارِ وفا سے۔ فرماتے ہیں۔ رحم کر ظالم کہ بیمار وفا کی ہستی ہی کیا ہے گویا اسکی نبض دودِ چراغ کشتہ ہے۔ نزع کے وقت کی نبض کو اطبا دودی کہتے ہیں اور نملی بھی کہتے ہیں۔

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں ‏ ‏ ‏ ورنہ یاں بیرونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

فرماتے ہیں۔ دل لگی کی آرزو ہم کو بے چین رکھتی ہے اور اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ رونق چراغ اس کے نقصان کا باعث ہے یعنی چراغ جلتا رہتا ہے تو اس کا تیل اور بتی دونوں ختم ہو کر چراغ کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اور اگر وہ بجھ جاتا ہے تو اس کی بے رونقی چراغ کے واسطے مفید ہے۔

غزل

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے ‏ ‏ ‏ سُرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

فرماتے ہیں۔ حسینوں کی آنکھیں خاموشی میں بھی گفتگو کرتی رہتی ہیں۔ گویا ان کی آنکھوں کا کاجل شعلۂ آواز پر اُپارا گیا ہے۔ سُرمہ خورانیدن یا سرمۂ آواز یہ دونوں فارسی والوں کے محاورے ہیں خاموش کر دینے کے معنی پر ان کا استعمال ہوتا ہے۔ میرزا صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہ کاجل شعلۂ آواز پر بنایا گیا ہے اس لئے اس کا اثر خلاف اور سُرموں کے قوتِ گویائی بخشتا ہے تو کہوے تو گوئی کا ترجمہ ہے۔

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے ‏ ‏ ‏ نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

فرماتے ہیں۔ پیکرِ عشاق یعنی عاشقوں کے جسم بدنصیبی کے ساز ہیں۔ اور ان کے نالے گویا بدبختی کے ستاروں کی آواز ہیں۔ عشاق ہمہ تن نالہ و فریاد ہوا کرتے ہیں اس لئے ان کو بدبختی کا ساز کہا گیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اہلِ عجم کے محاورے میں مقامِ عشاق ایک راگنی کا نام ہے۔

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا ‏ ‏ ‏ یک بیاباں جلوۂ گُل فرشِ پا انداز ہے

فرماتے ہیں۔ دیدۂ خونبارِ مجنوں کی دستگاہ تو ملاحظہ فرمائیے کہ آنکھوں سے خون کی ندی بہی ہے، اس نے نجد کے جنگل کو ایسا فرشِ پا انداز بنا دیا ہے جس میں کوسوں تک جلوۂ گُل کا سماں نظر آتا ہے۔

غزل

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ تو جو میرے دعوئے عشق پر کہتا ہے کہ تجھ کو عشق نہیں ہے بلکہ یہ دیوانگی کا جوش ہے جس میں وحشت پیدا ہو گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھا مجھے عشق نہ سہی وحشت ہی سہی اور یہ میری وحشت تیری شہرتِ حُسن کا باعث ہی سہی۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یہ مضمون میرزا صاحب کے حصّہ میں آگیا۔ جہاں نظم کیا ہے بمثل نظم کیا ہے۔ ہر جگہ نئے انداز سے باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہم سے قطع تعلق آپ کیوں کرتے ہیں۔ اگر کچھ بھی لگاؤ باقی نہیں ہے تو ہمارے ساتھ دشمنی ہی کیجئے۔ محبت نہ سہی عداوت سہی۔

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی　　اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ اگر تنہائی میں آپ سے ملوں گا تو اس میں کونسی آپ کی بدنامی ہو گی، ملنا دونوں جگہ یکساں ہے۔ مجلس نہ سہی خلوت سہی۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے　　غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ ہم کچھ اپنے عدو تو نہیں ہیں کہ تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کریں جب تجھے غیر کی محبت کا یقین کامل ہے اور اس کو اپنا سچا عاشق سمجھتا ہے، ہم تجھ سے کیوں ملیں۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ اپنی ہستی کو جاننا عین عرفان ہے۔ بمصداق مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ یعنی جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا اپنے رب کو۔ دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں۔ اگر اپنے نفس سے آگہی حاصل نہ ہوئی تو اپنی ہستی سے غفلت ہی کر لینی مناسب ہے یعنی جب اپنے کو نیست سمجھ لیا تو موجود بحق کا جلوہ ضرور نظر آ جائے گا۔ یہ شعر بھی میرزا کے نشتروں میں کا ایک آبدار نشتر ہے۔

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم نے مان لیا کہ عمر قیام بجلی کی چمک کی مانند ہے لیکن پھر بھی اتنی فرصت مل جانی ممکن ہے کہ دل کو خون کر لیا جائے۔

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں ۔۔۔ نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ ہم عشق کی تکلیفوں سے گھبرا کر ترکِ وفا نہ کریں گے یوں سہی کہ عشق کو ہم ذریعہ راحت نہ سمجھیں باعثِ مصیبت سمجھیں گے۔

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف ۔۔۔ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ اے فلک میں تجھ سے یہ تو نہیں کہتا کہ تو میری مراد ہی پوری کر دے۔ اے ظالم فرصت فریاد تو مجھے دے کہ اس کے دینے میں بھی تیرا کچھ نقصان ہے۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ۔۔۔ بے نیازی تری عادت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم بھی تسلیم و رضا کی عادت ڈال لیں گے جب یہ سمجھ لیں گے کہ بے نیازی تیری عادت میں داخل ہو گئی ہے۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ ۔۔۔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ یار سے مدعا طلبی کی چھیڑ چھاڑ ہوئے جانے۔ خاموش ہو کر بیٹھ رہنا کچھ کام کی بات نہیں ہے اگر وصل نہیں ہوا تو اظہارِ حسرت ہی سہی۔

غزل

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے ۔۔۔ صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

فرماتے ہیں۔ آرام لینے کی حالت میں اس بات کا سزاوار ہوں کہ مجھ کو سرزنش کی جائے۔ وطن میں رہ کر صبح کا ہونا میرے واسطے خندۂ دنداں نما ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ کو تلاشِ یار میں ترکِ وطن کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ میں آرام طلبی کی وجہ سے جو گھر میں بیٹھا ہوا ہوں تو وطن کی صبح میری حالت پر ہر روز خندہ زن ہوتی ہے۔

ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی ۔۔۔ جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

فرماتے ہیں۔ میرا دل اُس گانے والی کو ڈھونڈھ رہا ہے جس کی آواز کی بجلی مجھ پر گر کر فنا کر دے
یعنی غم ماسوا کے ساتھ اپنی ہستی کو بھی بھول جاؤں۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال　　تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

فرماتے ہیں۔ میدان خیال میں مستانہ وار راہ کو طے کر رہا ہوں اور وہ اس لئے کہ پلٹ کر آنے سے مجھ کو غرض مطلب نہ رہے یعنی میں اپنے کو اس طرح گم کر دوں کہ پھر ہوش میں نہ آسکوں۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں　　آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

فرماتے ہیں۔ میں تو ہمیشہ نکہتِ گل کو بے حجابی کا الزام دیتا رہا ہوں اور اس سے یہی کہتا رہا ہوں کہ ذرا ہوا چلی اور تو جامہ سے باہر ہو گئی مگر تو آج اس سے بھی زیادہ بے حجاب اور بے شرم نکلا اب مجھے نکہتِ گل سے شرمسار ہونا پڑا یعنی تیری بے حجابیاں دیکھ کر بوئے گل کو کس منہ سے بے حجاب کہوں۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

فرماتے ہیں۔ کسی شخص پر میرے دل کا معاملہ یعنی میرا رازِ عشق کیوں ظاہر ہوتا مگر اشعار کے انتخاب نے مجھے بدنام کر دیا یعنی میں ایسے ہی شعر چن کر پڑھا کرتا تھا جن میں معاملاتِ عشق و محبت کے مضامین بندھے ہوئے ہوتے تھے۔

شعر

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ جب ہماری زندگی ایسے بُرے حالوں سے گزری تو ہم کیا ذکر کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

غزل

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے　　بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

میرزا صاحب نے اس شعر میں حیا کے معنی غیرت کے لئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اس کی بزم ناز میں

مجھ کو غیرت سے کام لیتے ہوئے بن نہیں آتی۔ میں بیٹھا رہا باوجودیکہ غیر سے اُن کے اشارے ہوتے رہے۔

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا میں اور جاؤں در سے ترے بے صدا کئے

فرماتے ہیں۔ دل ہی تو ہے یعنی دل کی یہ کیفیت ہے کہ کبھی مضبوط ہو جاتا ہے اور کبھی بودا بن جاتا ہے۔ اس وقت اس کا یہ حال ہوا کہ ذرا سے دربان کے دھمکا دینے سے ڈر گیا ورنہ میں ایسا نہ تھا کہ تیرے دروازہ پر سے بغیر صدا کئے چلا جاتا۔

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

فرماتے ہیں۔ خرقہ و سجادہ شراب کے بدلے گرو رکھتا پھرتا ہوں اِس لئے کہ سال بھر کے بعد بہار کا موسم آیا ہے۔ مینہ برس رہا ہے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ مناسب ہے کہ اِس وقت فصلِ بہار کی دعوت کی جائے اور شراب کا دَور ہو اور دونوں چیزوں کو ملا کر گرو میں رکھتے ہیں۔ یہ شوخی رکھی ہے کہ ایک چیز سے قیمت شراب ادا نہ ہوئی۔

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

فرماتے ہیں۔ تعلقات دنیا سے چھٹکارا کہاں کہ عمر کو عبادت الٰہی میں صرف کیا جائے۔ عمر اگرچہ خضر ہی کی کیوں نہ ہو مگر بیکار ضرور گزرے گی۔ حضرت خضر بھی کل فرمائیں گے کہ معلوم نہیں ہم کیا کرتے رہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

فرماتے ہیں۔ اگر یہ قدرت حاصل ہو جائے تو میں ضرور خاک سے دریافت کروں کہ اے لئیم تو نے وہ قیمتی خزانے کیا کر دیئے۔ یعنی بڑے لوگ تیری آغوش میں آئے اور تو نے ان کو خاک میں ملا دیا اِس طرح کہ کسی کا بھی نشان باقی نہ رہا۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

فرماتے ہیں۔ وہ کون سا دن تھا کہ جس دن دشمنوں نے ہمارے اوپر تہمتیں نہ باندھیں اور وہ

کونسا دن تھا کہ جس دن ان کی جھوٹی باتوں میں آکر تم نے ہمارے سر پر آرے نہ پھیرے۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو　　دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو یہ وہم پیدا ہو گیا ہے۔ کہیں غیر کی صحبت میں تو اس کو یہ عادت نہیں پڑ گئی، وہ بغیر التجا کئے بوسہ دیتا ہے اور اِس وہم نے وصل کی خوشی کو غم سے بدل دیا ہے۔

ضِد کی ہے اور بات مگر خُو بری نہیں　　بھُولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

فرماتے ہیں۔ ضِد کی تو بات ہی اور ہے کہ اسے ہم سے کسی وقت کسی بات پر خاص ضد پیدا ہو جائے ورنہ یہ عادت بُری تو نہیں ہے اکثر اس نے بھُولے سے وعدے وفا کئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی بھُول بھی بعض اوقات لطف کا کام دے جاتی ہے۔

غالبؔ تم ہی کہو کہ ملے گا جواب کیا　　مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سُنا کئے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ تم خود ہی سوچ کر اس بات کا جواب دو کہ وہاں سے تم کو جواب کیا ملے گا۔ یہ تو ہم نے فرض کر لیا کہ تم اپنا مطلب اس سے کہتے رہے اور وہ سُنتے بھی رہے لیکن تمہاری مطلب برآری کی کیا صورت ہو گی۔ وہاں تمہاری پہونچ کیونکر ہو سکے گی اور پھر رعب حُسن اظہار تمنا کی اجازت کس طرح دے گا تم کہاں وہ کہاں۔ کچھ دل میں تو اپنے سوچو۔

غزل

رفتارِ عمر قطع رہِ اضطراب ہے　　اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

فرماتے ہیں جس طرح اہل تنجیم آفتاب کی رفتار سے سال کا حساب لگا لیتے ہیں عمر گریزاں کا حساب آفتاب کے بدلے تجلّی سے کرنا چاہیئے۔ سال بمعنی عمر بھی استعمال ہوتا ہے، راہِ اضطراب وہ راستہ ہے جو حالتِ اضطراب میں طے کیا جائے۔

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے　　بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

فرماتے ہیں۔ نشاطِ بہار سے سبز شیشۂ شراب سرو کا مدمقابل بن گیا ہے اور شراب تُند کی لہر بالِ تدرو کا نمونہ دکھا رہی ہے۔

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا — نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

فرماتے ہیں۔ پائے ثبات کی ایڑی زخمی ہو کر مشکل یہ ہو گئی ہے کہ اب نہ میدانِ عشق سے بھاگ سکتا ہوں اور نہ ٹھہر سکتا ہوں۔

جادادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت — غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

فرماتے ہیں۔ جاداد یعنی جا دُاد۔ بادہ نوشی سے مراد شرابِ عرفان ہے۔ رند سے مراد عارف۔ مطلب یہ ہے اہلِ عرفاں کو شش جہت پر اپنے عرفان کی وجہ سے قبضہ حاصل ہو گیا ہے۔ وہ ہر طرف ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلیاں دیکھ رہے ہیں اور جو شخص جلوہ حقیقت سے نا آشنا یعنی غافل ہے۔ اس کے گمان میں دنیا خراب ہے یعنی غافل ہو رہی ہے۔

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حُسن کا — جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

فرماتے ہیں۔ ظہورِ عالمِ اجسام شاہدِ حقیقی کے واسطے پردہ کا حکم رکھتا ہے نظر اس کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔ یعنی نظر جب دیکھے گی نقاب ہی کو دیکھے گی۔ آنکھ جب اُٹھے گی اجسام ہی پر پڑے گی۔ جوشِ بہار استعارہ ہے ظہورِ عالم کا۔ اور نقاب کہنے سے اس کو یہ مراد ہے کہ نقاب جس طرح چہرے کو چھپا لیتی ہے اسی صورت سے عالمِ اجسام کا تماشہ صوفیہ کے نزدیک عالمِ لاہوت تک جانے سے روکتا ہے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟ — مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

فرماتے ہیں۔ میں اپنے دلِ نامراد کی تسلی کیونکر کروں، یہ تو میں نے مانا کہ صرف تیرے دیکھ لینے سے نگاہ کو تسلی ہو گی۔ مگر دل کو تسلی اسی صورت میں ہو گی کہ جب تجھ سے وصل جسمانی بھی حاصل ہو گا۔

گزرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے — قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ میں پیغامِ یار کی خوشی و مسرت کو نے کر کیا کروں، مجھ کو یہ رشک قتل کئے ڈالتا ہے کہ اگر میں قاصد کو بھیجوں گا تو قاصد جا کر اس سے گفتگو کرے گا، ہمکلام ہو گا،

اور مجھے یہ بات کسی طرح گوارا نہیں۔

غزل

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ میری بدنصیبی تو دیکھو کہ مجھ کو آپ اپنے پر رشک آجاتا ہے (انتہائے محبت یہ ہے کہ محبت میں بدگمانی پیدا ہو جائے اور انتہائے بدگمانی یہ ہے کہ انسان کو کامیابی کی صورت میں خود اپنے پر بھی رشک آئے) رشک کی حالت میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ انتہائے محبت کامیابی محبت سے بھی محروم رکھتی ہے۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ اگر آتشِ فکر میں ایسی ہی گرمی ہے تو دل سے نا اُمید ہو جانا چاہیئے دوسرے مصرعہ میں اسی مضمون کو تشبیہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ آبگینہ یعنی دل کا شیشہ شراب کی تیزی سے پگھلا جاتا ہے۔

غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے گر حیا بھی اُسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملہ کا ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرعہ میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے پھر اس کے کیا معنے کیا حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور۔ اگر حیا بھی اُس کو آتی ہے یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے اور شرما جائے ہے یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے (از یادگار غالب)

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ شوق کو نالے کرنے کا ایسا چسکا پڑ گیا ہے کہ کسی وقت آہ و فریاد سے اُکتاتا بھی نہیں اور دل کی حالت ایسی زار و نزار ہو گئی ہے کہ سانس لینا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ لت کے معنی بُری عادت کے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں کہ اُس کو جُوا کھیلنے کی لت ہے۔

دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ　　　نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ چشمِ بد دُور تیری بزمِ طرب کی کیا بات ہے یعنی اس قدر خوشی سے معمور ہے کہ میرا نالہ بھی وہاں پہنچ جاتا ہے تو وہ بھی نغمہ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری فریاد کو سُن کر تو خوش ہوتا ہے۔ اس سنگ دلی پر اللہ رحم کرے۔

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق　　　پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ اس کی چشم پوشی یعنی بے توجہی رازِ عشق کی پردہ پوش ہے۔ لیکن ہم اس کے روبرو ایسے بدحواس اور خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ وہ رازِ عشق سے خبردار ہو جاتا ہے۔ کھوئے جانے سے پا جانا ایسے دو محاورے اس شعر میں نظم کئے گئے ہیں کہ جن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

اُسکی بزم آرائیاں سُنکر دلِ رنجور یاں　　　مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

اُس کی محفل نازکی خبریں سُن کر میرا دلِ رنجور یہاں اس طرح سے بیٹھا جاتا ہے (یعنی نا اُمید ہو جاتا ہے) جس طرح رقیب کی دفا کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ گیا ہے۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا　　　رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ وہ پری رُخ غیر پر عاشق ہو کر اور زیادہ نازک بن گیا۔ محبت کے صدمے سے جس قدر اس کا رنگ اُڑتا ہے اُتنا ہی رنگ نکھرتا جاتا ہے یعنی زیادہ گوارا ہو جاتا ہے۔

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں　　　کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ اس کی تصویر بھی مصوّر کے ساتھ ناز و غرور کا برتاؤ کرتی ہے۔ یعنی جس قدر مصوّر تصویر کو کھینچتا جاتا ہے اسی قدر اس کی تصویر مصوّر سے کشیدگی پیدا کرتی جاتی ہے۔

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ　　　پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ میں عشق کی بدولت ایسی مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہوں کہ میرا سایہ بھی مجھ سے گریز کرتا ہے۔ یعنی جس طرح آگ سے دُھواں اُٹھ کر بلند ہو جاتا ہے اسی طرح میرے سوزِ جگر کے خوف سے میرا سایہ مجھ سے دُور بھاگ جاتا ہے۔ گویا شعلۂ آتشِ جگر کا دھواں ہے۔ یا سایہ

نہیں۔ عجب پرلطف مقطع لکھا ہے۔

قطعہ

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے　　تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

فرماتے ہیں۔ نقش قالین کو دیکھ کر میں مصروف نالہ و فریاد ہوا کہ ہائے یہ شکل تو میرے پہلو میں ہوا اور میرا معشوق نہ ہو گرم فریاد ہونے نے شب ہجر کی سردی سے میری جان بچالی ورنہ ٹھٹھر کر مرجاتا۔

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم　　لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

فرماتے ہیں۔ میری ہمت کی نگاہ پر دنیا و عقبیٰ میں سے کوئی بھی نہ چڑھ سکی اور نسیہ و نقد ان دونوں کو بے حقیقت سمجھ کر میری ہمت عالی نے مجھ کو خود خرید لیا۔ یعنی میں وہ بیش بہا جنس ہوں کہ میری خریداری کے لئے نقد دنیا اور نسیہ عقبیٰ کافی تھا۔

کثرتِ آرائیٔ وحدت ہے پرستاریٔ وہم　　کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

فرماتے ہیں۔ کثرت کے لباس میں وحدت کو آراستہ کرنا اور وحدت پر کثرت کا خیال کرنا وہم پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔ یعنی یہی خیال کثرتِ اصنام خیالی سمجھے جاتے ہیں اور جس طرح بتوں کو بتوں کا بندہ شریک باری تعالیٰ سمجھتا ہے اسی طرح وہ بے خبر جو وجود کثرت کے قائل ہیں کثرت کو وحدت کا شریکِ وجود سمجھ رہے ہیں اور ایسا خیال کرنا کھلا ہوا شرک و کفر ہے۔

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا　　عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

فرماتے ہیں۔ تماشائے گل کا تصور بھی اب آنے نہیں پاتا۔ اس کے کھٹکے سے بھی مجھ کو نجات حاصل ہو گئی۔ یہ راحتِ قلبی بے بال و پری کی بدولت مجھے حاصل ہو گئی۔ مطلب یہ ہے، کہ جب تک بال و پر میں طاقتِ پرواز رہی میں اُڑ کر باغ میں پہنچ جاتا تھا اب ناطاقتی کی بدولت عشق گل کی قید سے آزاد ہو بیٹھا۔

غزل

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے　　برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے

میرزا صاحب اپنے رقعات عودِ ہندی میں ان تینوں شعروں کی شرح خود تحریر فرماتے ہیں۔ وہ یہ ہے داغ سامانِ شل انجم انجمن۔ وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجئے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عناد ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت اور صورت رنج غنچہ۔

غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

کلی جب تک نکلی بصورتِ قلب صنوبری نظر آئی اور جب تک پھول بنے برگِ عافیت معلوم، یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگِ عافیت بمعنی مایۂ آرام۔ مصرعہ:۔ برگِ عیشی بگورِ خویش فرست۔ برگ اور برگ و برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خوابِ گل شخصیتِ گل باعتبار خاموشی و برجاماندگی پریشانی ظاہر ہے۔ یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بصورت دل جمع ہے، باوصف جمعیتِ دل گل کو خوابِ پریشاں نصیب ہے۔

ہم سے رنج بیتابی کس طرح اٹھایا جائے داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

پشت دست صورتِ عجز اور خس بدنداں دکاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو قبلہ ابتدائے فکر و سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا ؎ طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے ۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا، آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق تک چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔

اُگ رہا ہے درودیوار پہ سبزہ غالبؔ ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

فرماتے ہیں۔ ہم تو وحشتِ دل کی بدولت دیوانگی کے عالم میں بیاباں نورد ہوگئے اور برسات نے آکر گھر کے درودیوار پر دیوانگی کے عالم میں گھاس پیدا کردی۔ افسوس ہے کہ ہم تو جنگل میں مارے مارے پھرتے ہیں اور گھر میں بہار آکر خانہ ویراں باغ بن گیا ہے۔ میرزا صاحب نے دیوانگی کی تصویر ایسے سادے الفاظ میں کھینچی ہے کہ تعریف سے مستغنی ہے۔

غزل

سادگی پر اسکی مرجانیکی حسرت دل میں ہے بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

یہاں سادگی سے مراد ترکِ زینت و آرائش ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس کی سادگی جو بغیر تلوار کے قتل کر رہی ہے۔ یعنی ابھی تلوار اُس نے باندھی بھی نہیں ہے۔ میرا ارادہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ کر مرجانے کا تھا اور یہی حسرت ابھی تک میرے دل میں ہے کہ اس کی سادگی پر گلا کاٹ کر مرجاؤں مگر میرے اس ارادہ کی تکمیل ابھی نہ ہوئی تھی کہ خنجر اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اب میری حسرت نکلنے کے یہ دو سبب مانع ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جب خنجر اس کے قبضہ میں آگیا تو ہم اپنا گلا کیونکر کاٹیں۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ جب خنجر اس نے کھینچ لیا تو اب وہ سادگی کہاں باقی رہی جس پر ہم جان قربان کرنی چاہتے تھے۔ دوسرے مصرعہ میں پھر کے لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے کہ ہم اپنا گلا کاٹنے پر مستعد تھے مگر اس نے اسی طرح خنجر ہمارے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حسن بیان کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اُس کو یہ شُبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی (از یادگار غالب)

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ میرا ذکر اُن کے سامنے بُرائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور غیر وہ ذکر کرتے ہیں۔ مگر بہرحال مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں آتو جاتا ہے۔

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائیگی یہ جو اِک لذّت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

فرماتے ہیں۔ اے ہجومِ نا امیدی بس کر کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری سعیٔ بے حاصل میں جو اک ذرا سی لذّت باقی رہ گئی ہے یہ بھی خاک میں مل جائے۔

رنجِ رہ کیوں کھینچئے واماندگی کو عشق ہے اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

راہ کی تکلیفیں کیوں کھینچی جائیں اور بیجا کوشش کیوں کی جائے۔ واماندگی کو ہم سے عشق ہو گیا ہے۔ یعنی ناکامی و نامرادی ہم پر عاشق ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ واماندگی ہم پر مبتلا ہے پھر کبھی منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکیں گے تو اب ہمارا ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا۔ یعنی رستہ چلنے سے بالکل جی چھوٹ گیا۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گِل میں ہے

فرماتے ہیں۔ یہ آپ سچ کہتے ہیں ہمارے دل میں آتشِ دوزخ بھری ہوئی ہے لیکن فتنۂ قیامت کس کے آب و گِل میں شریک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو سراپا فتنۂ قیامت کا نمونہ ہو۔

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

مطلب تو اس شعر میں صرف اتنا ہے کہ میری تمنائے دلی نکال دو۔ میرزا صاحب نے اسکو عجیب شوخی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ غالبؔ کا دلِ شوریدہ طلسمِ پیچ و تاب ہے۔ یعنی اس میں گورکھ دھندے کی طرح بہت سے بل پڑے ہوئے ہیں۔ تمہاری تمنا اُس کے پیچوں میں پھنس کر مشکل میں مبتلا ہو گئی ہے۔ تم غالبؔ پر رحم نہ کرو بلکہ اپنی تمنا پر رحم کر کے اس کو اس آفت سے نکال کر لے جاؤ۔

غزل

دل سے تِری نگاہ جگر تک اُتر گئی دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

فرماتے ہیں۔ تیری نگاہ تیر کی طرح دل سے جگر میں جا پہنچی اور ان دونوں کو ایک ہی ادائے ناز میں رضامند کر کے واپس ہوگئی۔

شق ہوگیا ہے سینہ خوشا لذّتِ فراق　　تکلیف پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

فرماتے ہیں۔ سنو تو سہی، میرا سینہ شق ہوگیا ہے اور اس کے شق ہونے سے لذتِ فراق کو عجب سرور حاصل ہوا ہے۔ بڑی تکلیف زخمِ جگر چھپانے کی تھی۔ اب وہ مٹ گئی کھُلم کھُلا فراق کے مزے لوٹنے نصیب ہوگئے۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اُٹھئے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

فرماتے ہیں۔ اب وہ رات کی پی ہوئی شراب کی سرمستیاں کہاں باقی رہیں۔ یعنی شباب کا زمانہ گزر گیا۔ بیدار ہونے کا وقت آگیا۔ لذّتِ خوابِ سحر باقی نہ رہی۔ یعنی پیری کا آغاز ہوگیا جوانی کی نیند سونے کا وقت ختم ہوگیا۔ نفس کو غفلت کا موقع نہ رہا۔

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں　　بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

فرماتے ہیں۔ مجھے برسوں سے یہ آرزو تھی کہ بال و پر پیدا ہوجائیں اور میں یار کے کوچہ میں اڑ کر پہنچ جاؤں زندگی میں میری یہ مراد پوری نہ ہوئی لیکن مرنے کے بعد میری خاک کوئے یار میں اس طرح لوٹتی پھرتی ہے جس طرح میں زندگی میں چاہتا تھا۔

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا　　موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

فرماتے ہیں۔ اس کی نقشِ پا کی دلفریبیوں کے انداز تو ذرا دیکھو موجِ خرامِ یار مقراض بنکر کیسے پھول کتر گئی۔ دوسرے معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ گُل کترنا محاورہ ہے جو فساد برپا کردینے کے موقع پر بولا جاتا ہے اور اس کے نقشِ پا نے زمین پر قائم ہوکر عشاق و اغیار میں باہم فساد برپا کردیا ہے۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

فرماتے ہیں۔ ہوس رانوں کی عادت حُسن پرستی نہ تھی مگر اب انھوں نے بھی بغیر سوچے سمجھے یہ عادت اختیار کرلی۔ اہلِ نظر کے عشقِ صادق کی قدر جاتی رہی۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فرماتے ہیں۔ رُخِ یار تک پہنچ کر نگاہ ایسی بدمست ہوگئی کہ اس کی زلفوں کی طرح پریشان ہوکر بکھر گئی۔ اور دامنِ نقاب کی طرح دیدار کی مانع ہوگئی گویا خود نقاب بن گئی۔

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

کہتا ہے کہ تمہارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی اور مستقبل دونوں مبدل بہ زمانہ حال ہو جائیں گے۔ پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گزر گئی، قیامت گزر جانے کے دو معنی ہیں یا نہایت سختی کا زمانہ گزر جانا اور خود قیامت کا آجانا (از یادگارِ غالب)

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

فرماتے ہیں۔ اے اسد اللہ خاں بہادر تمہیں زمانہ کی گردشوں اور محبت کی تکلیفوں نے موت سے پہلے تمام کردیا۔ وہ جوش و خروش اب کہاں ہے اور وہ زور و شور جوانی کے کدھر گئے۔

غزل

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے حورانِ خُلد میں تری صورت مگر ملے

فرماتے ہیں۔ عاشق کے لئے یہ دو باتیں عیش و مسرت کی ہیں۔ ایک تسکینِ قلب۔ دوسری ذوقِ نظر حورانِ خُلد اگر تیری ہمشکل ہوں تو ان کے ملنے سے ہم کو صرف ذوقِ نظر حاصل ہوسکتا ہے، مگر نہیں ایسا نہیں ہے کہ حوروں کی صورت تجھ سے ملتی ہوئی ہو اور اس صورت میں بھی کہ ان کو تیرا ہمشکل مان لیا جائے تو بھی تسکینِ قلب بغیر تیرے حاصل نہیں ہوسکتی، مگر ہم ذوقِ نظر مل جانے پر بھی صبر کر لیتے ہیں لیکن یہاں وہ بھی میسّر نہیں اِس لئے کہ حوریں تیری شباہت نہیں رکھتیں۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

فرماتے ہیں۔ تو مجھے اپنی گلی میں دفن کرے گا تو اس میں دو قباحتیں پیدا ہو جائیں گی۔ پہلی قباحت

یہ ہے کہ میرے پتہ سے تیرا گھر مشہور ہو جائے گا یعنی قبر والی گلی مشہور کریں گے یا یہ کہیں گے کہ غالب کی قبر جس گلی میں ہے اور مجھے دونوں حالتوں میں رشک آئے گا اور رشک مجھکو مر جانے کے بعد بھی گوارا نہ ہوگا۔ دوسرے باریک معنی اِس شعر میں یہ ہیں کہ جب قبر کے پتہ سے تیرا مکان مشہور ہو جائے گا تو لوگ تجھ کو غالب کا قاتل یا معشوق مشہور کردیں گے، اِس میں تیری توہین اور بدنامی ہوگی۔ مجھ کو مرجانے کے بعد بھی تیری بدنامی گوارا نہ ہوگی۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم　　　ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

فرماتے ہیں۔ آج تم ساقی بنے ہو چاہیے کہ ہم کو چھکا دو۔ تھوڑی بہت تو ہر روز اپنے گھر پر بھی پیتے ہی رہتے ہیں مگر پیٹ بھر کر پینی نصیب نہیں ہوتی۔ آج تو ہمیں جی بھر کے پلاؤ۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم　　　میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

فرماتے ہیں۔ اے ندیم تجھ سے تو ہم کو کچھ زیادہ شکوہ شکایت نہیں ہے البتہ نامہ بر جو بڑی ڈینگیں ہانکتا تھا اور دعوی کر کے گیا تھا کہ میں ضرور جوابِ نامہ لے کر آؤں گا اور اب تک اس نے شکل ہی نہیں دکھائی اور شرمندگی سے چھپ کر بیٹھ گیا، اگر وہ مل جائے تو میرا سلام کہہ دینا۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا اس سے شکایت کرنا اور شرمندہ کرنا۔

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا　　　فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

فرماتے ہیں۔ ہم تم کو دکھا دیتے کہ مجنوں یعنی قیس نے عاشقی کو کس حد تک ترقی دی ہے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ غمِ پنہاں اپنی پردہ دری اور رسوائی کے خوف سے کھینچ کھینچ کر لے آتا ہے اور جنگل میں نکل جانے سے مانع ہوتا ہے۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں　　　مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

فرماتے ہیں۔ راہِ سلوک میں تو ہم خضر کے برابر ہیں لیکن راہِ طلب میں خضر سے سبقت لیجانی چاہتے ہیں اِس لئے ان کو ایک بزرگ آدمی سمجھتے ہیں مگر ان کی پیروی کرنے سے قاصر ہیں۔ اس شعر سے مرزا صاحب کی شوخیِ طبع ظاہر ہوتی ہے۔

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا　　تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

فرماتے ہیں۔ اے ساکنانِ کوچۂ راہِ سلوک تم کو غالبؔ آشفتہ سر اگر مل جائے تو اسکی زیارت کرنا اور دیکھنا کہ جذبی کیفیت کس قدر بلند رتبہ رکھتی ہے۔ تم جس کوچہ میں جھونپڑی چھا کر رہ پڑے ہو وہ وہاں سے کس طرح بے تعلقی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔

غزل

کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

فرماتے ہیں۔ ہم نے اب تک تمہاری التجائیں، غیروں کی منتیں کیں اور راہِ عشق کی ٹھوکریں کھائیں مگر اب ہم نے اپنے دل میں ٹھان لی ہے کہ تم سے ترکِ تعلق کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ جائیں گے۔ اگر عشق کامل اور جذبۂ صادق رکھتے ہیں تو تم خود ہمیں پوچھتے ہوئے ہمارے گھر چلے آؤ گے۔ مگر یہ ساری باتیں اسی صورت میں ہو سکتی ہیں کہ ہماری زندگی بھی وفا کرے، اور غمِ فراق ہماری جان پر نہ بنا دے۔

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں!　　سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

فرماتے ہیں۔ یہ گرمی آتشِ دوزخ کو کہاں نصیب ہے۔ غمِ پنہاں کا سوز کچھ دوسری چیز ہے مطلب یہ ہے کہ سوزِ غم عذابِ دوزخ سے بھی زیادہ سخت ہے۔

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں　　پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

فرماتے ہیں۔ دفورِ محبت کی بدگمانی غضب کی چیز ہے۔ باوجودیکہ بہت دفعہ اُن سے بگاڑ ہوا ہے اور پھر باہم صفائی ہو گئی ہے لیکن اب کی بار یہی یقین ہے کہ اب اُن سے ملاپ نہ ہو گا۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر　　کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

فرماتے ہیں۔ نامہ بر نے اُن کا خط مجھے دے دیا لیکن اُس کے مُنہ دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مُنہ زبانی بھی کچھ کہلا بھیجا ہے اور وہ ایسی بات ہے کہ اُس کے دُہرانے میں قاصد کی

زبان نہیں اُلٹ سکتی معلوم ہوتا ہے وہ چار گالیاں بھی خط کے ساتھ دی گئی ہیں۔ میرزا صاحب کی شوخی اور ظرافت ہر غزل میں ضرور اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم   وہ بلائے آسمانی اور ہے

فرماتے ہیں۔ اکثر ستارے ایسے ہیں جن سے عمریں قطع ہو جاتی ہیں، لیکن یہاں جس بلائے آسمانی سے کام پڑا ہے وہ ان منحوس ستاروں کے مقابلہ میں قضائے مبرم کا حکم رکھتی ہے۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ زندگی میں جن مصیبتوں کا سامنا ہوا وہ انجام کار سب ختم ہو گئیں اب تو ایک مرگِ ناگہانی کی آفت اور باقی رہی ہے۔ موت کچھ کہہ کر تو آتی ہی نہیں کیا معلوم کس وقت آجائے۔ آئے گی ضرور اور بے خبر کئے یکایک آدھمکے گی، میں اس کا ہر وقت منتظر ہوں۔

غزل

کوئی اُمید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ حصول اُمید کی کوئی صورت نظر ہی نہیں آتی۔ ناکامی اور نامرادی میں زندگی بسر ہو رہی ہے۔

مَوت کا ایک دن معیّن ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

فرماتے ہیں: مَوت کے واسطے ایک دن معیّن ہو چکا ہے، جب تک وہ دن نہ آئے گا مَوت کیونکر آسکتی ہے۔ لیکن نیند کو شبِ فرقت میں کیا ہوگیا ہے۔ وہ کوئی مری محبت تو نہیں ہے کہ اس کے آنے کے لئے کسی خاص دن کی قید لگادی گئی ہو۔ وہ (یعنی نیند) شبِ فرقت میں رات رات بھر کیوں نہیں آتی۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

میرؔ اگر زندہ ہوتے تو میرزا صاحب کے اس شعر کی داد دیتے۔ پریشان خاطری کی تصویر کس

سادے لفظوں میں کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ فرماتے ہیں پہلے تو مجھے اپنے دل کی مصیبت پر ہنسی آجایا کرتی تھی۔ اب میری مصیبتوں نے اس قدر مجھ کو افسردہ خاطر کردیا ہے کہ اب خوشی کی بات پر بھی مجھ کو ہنسی نہیں آتی۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ زہد و عبادت کو ثواب جانتا ہوں اور ان دونوں باتوں کی خوبیوں سے بخوبی آگاہ ہوں لیکن طبیعت اِدھر رجوع نہیں ہوتی، اس کا کیا علاج۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ توفیق نہ دے انسان کوئی نیک کام نہیں کرسکتا۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ میرا منہ نہ کھلواؤ ورنہ بیٹھے بٹھائے رسوا ہو جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے وہ راز کی باتیں معلوم ہوگئی ہیں کہ جن کے بیان کردینے میں بدنامی کا خوف ہے۔

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں　　میری آواز گر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ میری نالہ کشی کو میرا معشوق اپنی شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے اس لئے اس کو میری فریاد میں ایک قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اگر میں خاموش ہو جاتا ہوں تو وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ ہمارے مکان کے قریب ایک دیوانہ سا آدمی بیٹھا ہوا نالے کیا کرتا تھا آج اس کی آواز نہیں آتی۔ شاید کہیں چلا گیا اِس لئے میں رات دن چیخا کرتا ہوں۔

داغ دل گر نظر نہیں آتا　　بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ اے چارہ گر اس بات کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا داغ دل پردے میں یعنی میرے سینے کے اندر چھپا ہوا ہے تو اس کو دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن اے کمبخت کیا تیرا دماغ بند ہے کہ تجھ کو اس کے جلنے کی بو بھی نہیں آتی۔ سانس کے ساتھ کباب کی بو آرہی ہے اور تو اُس کو نہیں سونگھ سکتا اور دل کے کباب ہونے سے انکار کرتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں استفہام اقراری ہے۔ یعنی بو آرہی ہے یعنی بو آرہی ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ خود رفتگی اور خود فراموشی اِس قدر بڑھ گئی ہے کہ ہم کو اپنے حال کی خبر نہیں۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ مرتے ہیں۔ یعنی موت کے بے انتہا مشتاق و آرزو مند ہیں۔ موت آتی ہے یعنی موت کا آنا لازمی اور ضروری ہے۔ رات دن سینکڑوں آدمیوں کا مرنا سنتے رہتے ہیں۔ مگر ہم کو موت نہیں آتی ہم نہیں مرتے۔

کعبہ کِس منہ سے جاؤ گے غالبؔ　　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ ساری عمر تو شاہد پرستی اور شراب خواری کرتے رہے۔ اب کیا مُنہ لے کر خانۂ کعبہ جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ تم کو شرم نہیں آتی۔

غزل

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　　آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ دلِ ناداں تجھ کو کیا ہو گیا ہے، تو کسی طرح اپنے کوتکوں سے باز نہیں آتا۔ آخر اِس درد یعنی دردِ عشق کی دوا کیا ہے۔ تیرا کیا علاج کریں جو تو ان حرکتوں سے باز آئے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

گویا ابھی عشق کے کوچہ میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔ ان سے ناواقف ہے اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے (از یادگار مرزا غالبؔ) یہ شعر بھی مرزا کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔

میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں　　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

فرماتے ہیں کہ غیروں سے تو تم ان کی حالت پوچھتے رہتے ہو۔ مجھ کو بھی اللہ تعالیٰ نے زبان عطا فرمائی ہے مجھ سے بھی تو کبھی پوچھو کہ تیرا مدعا کیا ہے۔ دیکھو میں تم کو اس کا کیا جواب دیتا ہوں۔

قطعہ

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ اے خدا جس صورت میں کہ تیرے سوا دنیا میں کوئی دوسرا موجود ہی نہیں ہے پھر یہ ہنگامہ آرائی کیسی ہے، یعنی:۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

جب تیرے سوا کوئی دوسرا اس عالم میں نہیں ہے تو یہ پریوں کے سے حسین اور خوبصورت لوگ کیسے نظر آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کے یہ غمزے اور ناز و ادائیں کیا چیز ہیں۔

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے　　نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے

یہ خوشبو دار گھونگر والی زلفیں کس لئے بنائی گئی ہیں۔ اور یہ نگہِ سُرمہ سا کیا کام دے رہی ہے۔

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ سبزۂ وزار اور یہ خوشبو دار پھول کہاں سے آگئے ہیں۔ کس نے ان کو پیدا کر دیا ہے اور یہ ابر کیا چیز ہے اس کی ماہیت کیا ہے اور یہ ہوا کیا ہے۔ اس کی حقیقتِ حال کیا ہے۔ اِس قطعہ کا مطلب یہ ہے کہ زبانِ حال سے مرزا صاحب فریاد کر رہے ہیں کہ اس دلکش اور دلفریب منظر کو دیکھ کر ایسا مطمئنُ نفس کس کے پاس ہے کہ آدمی ان سب تماشوں کو ہیچ سمجھ کر ذاتِ باری تعالےٰ کی طرف رجوع ہو جائے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس نمائش دلفریب نے انسان کو ایسا مشغول کر لیا ہے کہ ذات باری تعالےٰ کی طرف توجہ کرنی دشوار ہو گئی ہے۔ فریاد اس امر کی ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ان ساری لذتوں کو ترک کر کے اس ذات واحد کی طرف رجوع کریں، لیکن ان منظروں کی دلفریبیاں ہم کو اپنی جانب کھینچے لیتی ہیں۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ وہ ابھی سلامتی سے اِس قدر کمسن اور نادان ہیں کہ سرے سے وفا ہی کو نہیں

جانتے کہ وفا کس جانور کا نام ہے اور ہم عشق کے دام میں پھنس کر ایسے نادان بن گئے ہیں کہ اس پر بھی ان سے وفا کی اُمید رکھتے ہیں۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے۔ اس میں شک وشبہ کرنے کی کیا بات ہے۔ فقیر کی یہ صدا کہ جو بھلا کرے گا، یعنی دنیا میں کسی کو کچھ فائدہ پہنچائے گا، دونوں جہان میں اسکو فائدہ پہنچے گا۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ اوروں کی طرح زبانی خرچ میرے پاس نہیں ہے یعنی میں خالی دعا دینی نہیں جانتا۔ جان کو تم پر قربان کرتا ہوں۔ میری بڑی دعا یہی ہے کہ اپنی جان تمہارے صدقہ میں اُتارتا ہوں۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ اِس بات کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ غالبؔ ایک بیکار سا آدمی ہے لیکن تم کو تو مُفت کا غلام ملتا ہے۔ تم کو اس کے غلام بنانے میں کیا بُرائی ہے۔ کچھ گرہ سے دام تو خرچ کرنے ہی نہیں پڑتے۔ مُفت کا سودا ہے لے لو۔

غزل

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مو آئے اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

فرماتے ہیں۔ اے دوستو، اے ہمدمو، اے ندیمو، اے غمخوارو، تم سب میرے لئے یہ دعا تو کر رہے ہو کہ خدا کرے وہ بتِ غالیہ مو آجائے۔ ایسا ہو کہ ایک بار تم سب لوگ گھبرا کے یہ کہہ اُٹھو کہ لو وہ آ گئے۔

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

فرماتے ہیں۔ میں تو اس وقت کشمکشِ نزع میں مبتلا ہوں، مگر ہاں اے جذبِ محبت چلتے چلتے ایک

کشش تو تو بھی دکھا دے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مجھ میں بات کرنے کی طاقت باقی نہیں رہی ہے، لیکن وہ میرے پوچھنے کو تو آجائے، بلا سے جواب نہ دے سکوں نہ سہی۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم — آنا ہی سمجھ میں مرے آتا نہیں گو آئے

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ میرے گھر میں تشریف لے آئے ہیں لیکن ان کی حالت صاعقہ و شعلہ و سیماب کی سی ہے یعنی دم نہیں لیتے۔ بیٹھتے نہیں۔ ٹھہرتے نہیں، آتے ہی جانے کا سوال ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا آنا بھی آنے میں شمار ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

بادۂ دوشینہ۔ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی، از راہِ شوخی، کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں تاکہ نکیرین اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال و جواب کئے چلے جائیں (از یادگارِ غالب)

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے — ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

یہ شعر تصوف میں ہے۔ گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

فرماتے ہیں۔ یہ طعنہ کس سے سنا جائے کہ برسوں اس کی طلب میں خاک چھانی، اور پھر اس کو نہ پایا ناکام و نامراد واپس آ گئے۔ ہم نے جب دیکھا کہ معرفتِ الٰہی کے راز پوشیدہ دریافت نہیں ہو سکتے اور ان کا پتہ کہیں نہیں ملتا تو ہم اپنے کو کھو آئے، یعنی ہوش و خرد سے گزر کر مست و مجذوب ہو گئے۔

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں — اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

فرماتے ہیں۔ ہماری یہ عادت نہیں ہے کہ طلب دوست سے اکتا کر آرام سے ہو بیٹھیں، جب ہم کو یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا پتہ کہیں نہیں ملتا اور ہم کسی طرح اس تک نہیں پہنچ سکتے تو کعبہ جا کر خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو آئے یعنی یہاں بار نہ ملا تو یار کے گھر کو ہی دیکھ آئے۔

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر　　اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

فرماتے ہیں۔ میرے ہم نفسوں نے معشوق سے اثرِ گریہ کی بابت تقریر کی یعنی گریہ میں اثر ہونے کو ثابت کیا، مگر ثابت نہ کر سکے اور وہ اس بنا پر کہ جب معشوق نے یہ کہا کہ رونے میں اگر تاثیر ہوتی اور تم جس کے جانب دار بن کر یہ گفتگو کر رہے ہو کہ وہ تیرے فراق میں رات دن روتا رہتا ہے اور اس رونے کا تجھ پر اثر ہوگا تو نصیب دشمناں تیرے دم پر بن جائے گی یہ بالکل غلط ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ آنسو بہانے میں اگر تاثیر ہوتی تو میں اس وقت رونے والے کے پاس ہوتا۔ یہ سُن کر میرے ہم نفس گریہ کا بے اثر ہونا مان گئے اور مایوس ہو کر واپس چلے آئے قائل ہو جانے کے بعد یہ لوگ تو اس سے اچھے رہے یعنی اس کے ہمزبان بن گئے مگر مجھ کو ڈبو آئے یعنی میری گریہ کی بے اثری کا قائل ہو جانا میرے لئے شرمندگی کا سبب تھا۔ دوسرا پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ معشوق سے میرے گریہ کا حال کہہ دیا جس کو میں ہمیشہ پوشیدہ رکھتا تھا اب اس حال کے ظاہر ہو جانے کے بعد اس کی نگاہوں میں حقیر ہو جاؤں گا۔

اِس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ　　ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

فرماتے ہیں۔ وہ انجمنِ ناز، یعنی تیرے معشوق کی بزم۔ اے غالبؔ قابلِ تعریف ہے وہاں تو کسی کی روک ٹوک نہیں ہے۔ دوست دشمن سب جمع ہو جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق۔ غرض یہ کہ لطفِ صحبت حاصل کرتے ہیں۔ تیری بدنصیبی ہے جو تو وہاں جانے سے محروم ہے اور باریابی سے رو کا جا سکتا ہے۔

غزل

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے　　سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

فرماتے ہیں۔ پھر دل میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے اور ہر وقت گدگدی سی ہوتی رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عشق کا زخم کھانے کی دوبارہ خواہش پیدا ہو گئی ہے۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن!　　آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

فرماتے ہیں۔ ناخن نے پھر جگر کریدنا شروع کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہار کا موسم قریب آگیا ہے۔ باغ میں لالہ و گل کھلیں گے اور سودا پھر زور پکڑے گا۔ اہلِ جنون کے زخم پھر تازہ ہو جائیں گے۔

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز　　پھر وہی پردۂ عماری ہے

فرماتے ہیں۔ پھر نگاہِ نیاز کا قبلۂ مقصد وہی پردۂ عماری بن گیا ہے جس میں محبوب جلوہ گر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لیلےٰ کی طرح ہمارے معشوق کو بھی محمل میں سوار ہونے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔

قطعہ

چشم دلال جنسِ رسوائی　　دل خریدارِ ذوق خواری ہے

فرماتے ہیں۔ آنکھ جنس رسوائی کی دلالی کرنے لگی ہے اور دل ذوق خواری کا خریدار بن گیا ہے یعنی دیوانہ بن گیا ہے۔

وہی صد رنگ نالہ فرسائی　　وہی صد گونہ اشکباری ہے

پہلے شعر کی تفصیل اس شعر میں فرمائی ہے۔ یعنی دل سو سو طرح سے نالہ و فریاد کرتا ہے، جس کا انجام ذلت و خواری کے اور کیا قرار پا سکتا ہے اور آنکھ سو سو طرح سے اشکباری کرتی ہے جو رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے۔

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر　　محشرستانِ بیقراری ہے

فرماتے ہیں۔ خرامِ نازِ یار کے شوق میں پھر ہمارا دل بیقراری کے لئے میدانِ حشر بن گیا ہے۔

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے　　روز بازار جاں سپاری ہے

فرماتے ہیں۔ جلوۂ یار متاع نازہ غرور کو دکھا کر کہہ رہا ہے کہ کون عاشق جانباز اس کا خریدار بنتا ہے۔ گویا بازار جانسپاری کی ہر روز گرمیِ بازار ہے۔

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں　　پھر وہی زندگی ہماری ہے

فرماتے ہیں۔ پھر اسی بے وفا کا عشق دوبارہ پیدا ہو گیا ہے یعنی پہلے جس پر مرتے تھے اور پھر اسی طرح سے زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں، جس طرح پہلے بسر ہوتے تھے۔

قطعہ

پھر کھُلا ہے درِ عدالتِ ناز   گرم بازار فوجداری ہے

فرماتے ہیں۔ تعطیل ختم ہو گئی۔ پھر عدالتِ ناز کے دروازے کا قفل وا ہو گیا۔ آج کل پھر فوجداری کا بازار گرم ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ فصلِ گُل کے آتے ہی پھر عشق و جنون کے ولولے دلوں میں پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر   زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

فرماتے ہیں۔ جہان میں پھر وہی اندھیر ہو رہا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ زلف کو پھر عہدۂ سرشتہ داری مل گیا ہے۔

پھر کیا پارۂ جگر نے سوال!   ایک فریاد و آہ وزاری ہے

فرماتے ہیں۔ پارۂ جگر نے پھر دعویٰ دائر کر دیا ہے پھر چاروں طرف سے فریادی ٹوٹ پڑے ہیں۔

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب   اشکباری کا حکم جاری ہے

فرماتے ہیں۔ پھر عدالت کے روبرو عشق کے گواہ پیش ہو رہے ہیں۔ اشکباری کا حکم جاری ہے۔ آنسوؤں کے ساتھ خونِ دل، لختِ جگر کو عشق کی شہادت میں پیش کر رہا ہے۔

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا   آج پھر اُسکی روبکاری ہے

فرماتے ہیں۔ مژگانِ یار اور دلِ عاشق میں جو مقدمہ بازی ہو رہی تھی آج عدالتِ ناز میں اس کی روبکاری ہے۔ یعنی دونوں فریق اپنا اپنا ثبوت دعویٰ اور جواب دعویٰ پیش کر رہے ہیں۔ مرزا صاحب کی جدت پسند طبیعت اشعار میں نئی نئی ترکیبیں پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ یہ قطعہ بھی ندرتِ بیان کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ   کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالب یہ بیخودی بے سبب تو نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے، جس کے چھپانے کی غرض سے یہ بیخودی طاری ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اخفائے رازِ عشق کے لئے یہ پردۂ بیخودی حائل ہوا ہے

قطعہ

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی　　نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

فرماتے ہیں۔ اے جنون مجھ پر تسکین کی تہمت میرے تھوڑی دیر کے لئے شادماں ہو جانے کی وجہ سے نہیں عائد ہو سکتی۔ اگر میں دم بھر کے لئے خوش ہو گیا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تجھ پر خدانخواستہ شادمانی کی تہمت لگا دی جائے گی۔ مجھ کمبخت کی شادمانی تو زخمِ دل پر نمک پاشی کے سبب سے ہے تسکین کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے بلکہ اس زخمِ دل پر لذتِ زندگانی کا نمک پاش ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایسے برے حال سے زندہ رہنا زخمِ دل پر نمک چھڑک رہا ہے اور زخم پر نمک چھڑکنے سے زخموں میں سوزش اور تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے نہ کہ تسکین۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی　　ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

فرماتے ہیں۔ آزادی چاہے جتنی کوشش کر لے مگر دنیا میں آکر ہستی سے کوئی آزاد نہیں ہو سکتا دریا کی موجوں کو دیکھ لو وہ آزاد ہونے کے لئے جس قدر ہمکتی ہیں اسی قدر زنجیروں میں زیادہ الجھتی چلی جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خلائق ہستی سے انسان جس قدر آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے اسی قدر اس کی گرفتاری بڑھتی جاتی ہے۔ انجام کار اس کی کوشش کشش سے مغلوب ہو جاتی ہے۔

پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے　　شرارہ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

فرماتے ہیں۔ مر جانے کے بعد بھی تیرے دیوانہ کو لڑکوں نے زیارت گاہ بنا رکھا ہے اور وہ اب تک بھی میری قبر پر آکر پتھر مارتے ہیں۔ شرارۂ سنگ کے پھول قبر پر ہر روز چڑھائے جاتے ہیں۔

غزل

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی — مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

فرماتے ہیں۔ ظلم معشوق کی فریاد کرنے والے مجرم کی سزا زجر و ملامت ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو صبح حشر بھی اس کمبخت کے حق میں خندۂ دنداں نما بن کر نمودار ہو۔

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے — اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی

مشہور ہے کہ ایک بار لیلےٰ کی فصد ہوئی تھی اور قیس کی رگِ بازو سے خون جاری ہو گیا تھا۔ فرماتے ہیں۔ دشتِ مجنوں کی خاک رگِ لیلیٰ کو زخمی کردے۔ اگر دہقان غلہ کی جگہ نوکِ نشتر بودے مطلب یہ ہے کہ اگر دشت مجنوں میں دانہ کی جگہ نوکِ نشتر بوئیں تو زمین سے بجائے کونپل کے رگِ لیلیٰ پیدا ہو۔ یعنی جذبۂ عشق نے عاشق و معشوق اور رگ و نشتر میں اس قدر اتحاد باہمی پیدا کر دیا ہے۔

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا — ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پروانہ کا پر مے کی کشتی کا بادبان تھا۔ اس لئے کہ جب مجلس خوب گرم ہو گئی تو دورِ ساغر چلنے لگا۔ مطلب یہ ہے جہاں بزم آرائی ہوتی ہے وہاں شمع روشن کی جاتی ہے اور جہاں شمع روشن ہوتی ہے وہاں پروانوں کا لشکر آدھمکتا ہے اور گرمی مجلس روانی دورِ ساغر کا سبب قرار پاتی ہے تو شاید کشتیِ مے کا بادبان پرِ پروانہ ہوتا ہے۔

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت — کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے قبل میرے شہپر کی

فرماتے ہیں۔ میری کیا مجال ہے جو ذوقِ پرفشانی کے ستم و جور کو عرض کر سکوں۔ پھڑکنے سے پہلے شہپر کی طاقت نے جواب دے دیا۔

کہاں تک روؤں اُس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے — مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

فرماتے ہیں۔ خیمہ کے پیچھے کہاں تک روؤں۔ قیامت یہ ہے کہ یارب میری قسمت میں پتھر کی دیوار بھی نہ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو گریہ میں اتنا جوش ہے کہ کم سے کم قناتِ خیمہ کو

بہادے اور یار کا دیدار نصیب ہو جائے۔ نہ رونے میں ایسا اثر ہے کہ وہ خیمہ سے گھبرا کر باہر نکل آئے یا ہم کو خیمہ کے اندر بُلالے اور قسمت سے بجائے قناتِ خیمہ سنگین دیوار بھی نہیں ہے کہ نااُمیدی اور مایوسی کی حالت میں دیوار سے سر ٹکرا کر مر جائیں۔

غزل

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

فرماتے ہیں۔ جس قدر ہم نے اپنی حد سے تجاوز کیا اُسی قدر لوگوں کی نگاہوں میں سُبک ہو گئے۔

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیاں کے اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جو مطلب اِس طریقہ سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔ (از یادگار غالب)

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

فرماتے ہیں۔ ہماری ہستی ہماری فنا پر دلیل ہے۔ ہم اِس قدر مٹے ہیں کہ آپ اپنی قسم بن گئے ہیں۔ کسی شے کے نہ ہونے کو محاورے میں یوں کہتے ہیں کہ فلاں شے ہمارے پاس قسم کھانے کو بھی نہیں ہے۔ اور اس قسم پر یہ بھی بولا جاتا ہے کہ نام کو بھی نہیں ہے یعنی اگر وہ شے برائے نام بھی ہوتی تو ثبوتِ قسم کے لئے کافی سمجھی جاتی اور اس طرح کی ہستی جو برائے نام ہو وہ ہستی فنا کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی ہستی کو اِس قدر مٹا دیا ہے کہ قسم کھانے کے لایق بھی باقی نہیں رہی۔

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

فرماتے ہیں۔ عشق کی سختیاں کھینچنے والوں کی یعنی اپنے عشاق مصیبت زدہ کی خبر کیا دریافت کرتے ہو۔ وہ لوگ گھلتے گھلتے یعنی فنا ہوتے ہوتے سراپا الم بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح رنج و الم ظاہر و محسوس شے نہیں ہے یہی حال ان بدنصیبوں کا ہو گیا کہ گھلتے گھلتے نظر سے پوشیدہ ہو گئے۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

فرماتے ہیں۔ تیری وفا سے تیری ہی جفا کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اور ہم ایسے ستم زدہ ہیں کہ تیرے علاوہ زمانے بھی ہزاروں ستم ہم پر کئے ہیں۔ ان کی تلافی تیری وفا سے کیونکر ہو سکتی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر رحم کھا کر اپنی جفا کی تلافی کرتا ہے تو پھر ایسا کر کہ عمر بھر کے لئے ہمیں کوئی شکایت ہی پیدا نہ ہو۔ یعنی دنیا کی تکلیفوں سے بھی تیری بدولت چھٹکارا ہو جائے۔ میرزا صاحب معشوق کو مہربان پا کر اور پاؤں پھیلاتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں ہر چند اسمیں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

جنون سے مراد یہاں عشق ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہم عشق کی حکایات خونچکاں اپنے اشعار میں لکھتے رہے ہیں۔ باوجودیکہ معشوق نے ہمارے ہاتھ قلم بھی کئے تو بھی ہم گزرے ہوئے معاملات نظم کرنے سے باز نہ آئے۔ ایک شارح صاحب نے میرزا کے اِس مصرعہ ثانی پر اپنی جودت طبع دکھانے کے لئے سترہ مصرعے لگائے ہیں مگر اس ہیچمداں کی رائے میں میرزا کا مصرعہ اولی سب پر سبقت حاصل کئے ہوئے ہے۔

اللہ ری تیری تندیِ خو جس کے بیم سے اجزائے نالہ دل میں مرے رزق ہم ہوئے

فرماتے ہیں۔ تیری بدمزاجی کے خوف سے نالہ لب تک نہ آسکا۔ نالۂ دل دل ہی میں تحلیل ہو گیا۔ اور اس کا ایک جزو دوسرے جزو کو اسی طرح نوش جان فرما گیا۔ جس طرح خوف سے رگوں میں خون خشک ہو جاتا ہے۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

فرماتے ہیں۔ بوالہوسوں کی جیت اِسی میں ہے کہ میدانِ عشق کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور وہ لوگ اپنے دل میں یہ سمجھیں کہ میدان سے بھاگتے وقت جو پاؤں اُٹھا وہ گویا علم فتح کا بلند ہوا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

فرماتے ہیں۔ ہم ازلی بدنصیب ہیں۔ ازل میں بھی نالہ کشی کا منصب ہم کو عطا ہوا تھا۔ جو نالے وہاں کھینچنے سے باقی رہ گئے تھے وہ دنیا میں آکر ہمارے لئے سانس بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نہ عدم میں خوش تھے نہ وجود میں آکر خوش رہے۔ ہمارے لئے سانس بھی نالوں کا حکم رکھتے ہیں۔

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی — سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ ہم نے گدائی میں بھی عاشق مزاجی ترک نہ کی۔ سائل ہونے کی حالت میں جس کسی نے ہمیں پیسہ ٹکہ دیا ہم اُسی کے عاشق ہو گئے۔

غزل

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی — تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی

فرماتے ہیں۔ اگر شعلہ عشق میرے داغِ دل کی حفاظت نہ کرے۔ یعنی اسے ٹھنڈا ہونے سے نہ روکتا رہے تو افسردگی کا قابو چل جائے جو بے زبانی کے پردہ میں چور کی طرح چھپی بیٹھی ہے اور قابو ڈھونڈ رہی ہے کہ ذرا غافل پاؤں تو اشرفی داغ دل کو لے بھاگوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شعلۂ عشق داغِ دل کی ہر وقت خبرداری نہ کرتا رہے تو داغ دل ٹھنڈا ہو جائے۔

مجھے اِس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی — کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی

فرماتے ہیں۔ کم عمری میں کہانی سُننے کا شوق بہت ہوا کرتا ہے۔ اس عمر میں تو اِس مغرور نے کبھی میری کہانی سُنی ہی نہیں۔ اب جوانی کے زمانے میں مجھے اس سے کب توقع ہو سکتی ہے کہ میری مصیبت کی داستاں سُنے گا۔

یونہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا — کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

فرماتے ہیں۔ بے وجہ کسی کو تکلیف دینی اچھی بات نہیں ہے ورنہ میں ضرور یہ دعا مانگتا کہ الٰہی میری مصیبتیں دشمن کو مل جائیں جو میرے رنج و غم کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

غزل

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے　　اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

میرزا صاحب نے عودِ ہندی میں خود اس مطلع کی شرح لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں، ایک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے۔ یہ خبر ہے پہلے مصرعہ کی، مصرعہ:۔ ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے، یہ مبتدا ہے، شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہے (اندھیرا۔ ظلمت غلیظ) سحر ناپیدا گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک دلیل صبح کی بود پر ہے، یعنی بجھی ہوئی شمع اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا ہے، وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ پس دیکھنا چاہیئے جس گھر میں علامت صبح مؤید ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال　　مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

فرماتے ہیں۔ نہ اب وصل کا مژدہ کانوں کو حاصل ہوتا ہے، نہ جمال کا نظارہ آنکھوں کو میسر آتا ہے۔ مدت ہوگئی کہ چشم و گوش میں باہم اتحاد و اتفاق پیدا ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے وہ زمانہ گزر گیا کہ جب آنکھوں کو اگر نظارۂ جمال ہوتا تھا تو کانوں کو رشک پیدا ہو جایا کرتا تھا کہ ہم کو بھی وصل کا مژدہ ملے یا کبھی کانوں تک وصل کی خوش خبری پہنچ جاتی تھی تو آنکھوں کو حسد پیدا ہو جاتا تھا کہ کانوں نے تو مژدۂ وصل سن لیا اور ہم نظارۂ جمال سے محروم ہیں۔

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب　　اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

فرماتے ہیں۔ شراب نے حسن خود آرا کو بے حجاب کر دیا ہے۔ اے شوق دلِ عاشق اب تجھ کو بھی اجازت ہے کہ تو بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنے ہوش و حواس اس حسن بے حجاب کی نذر کر دے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا　　کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

فرماتے ہیں۔ موتیوں کا ہار حسینوں کی گردنوں میں دیکھنا نصیب ہوگیا ہے۔ گوہر فروش کا ستارہ کس قدر اوج پذیر ہے۔

دیدار، بادہ، حوصلہ، ساقی، نگاہِ مست　　بزمِ خیالِ میکدۂ بے خروش ہے

فرماتے ہیں۔ دیدار تو شراب ہے اور حوصلہ ساقی ہے اور نگاہ میخوار ہے۔ خیالی مجلس ایک ایسا میکدہ ہے جس میں کسی قسم کا غل و شور ہی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بزم خیالی عجب سرور افزا منظر ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں اضافت کہیں نہیں ہے۔

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

فرماتے ہیں۔ اے نوجوانو تم نفسانی خواہشوں میں تازہ گرفتار ہوئے ہو۔ خبردار اگر تمکو نے کا سننا اور شراب کا پینا منظور ہے تو:۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

مجھ کو دیکھو اور میرا حال دیکھ کر عبرت حاصل کرو اور نے کے مقابلہ میں میری نصیحت گوش دل سے سنو اور وہ نصیحت یہ ہے کہ:۔

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمانِ آگہی!　　مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

ساقی اس جلوہ گری کے ساتھ ایمان و آگہی کا دشمن واقع ہوا ہے اور مطرب اس خوش گلوئی کے ساتھ تمکین و ہوش کا لوٹ لے جانے والا ہے۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

یا تو رات کو نظر کے سامنے وہ تماشے ہو رہے تھے کہ فرش کا ایک ایک کونہ پھولوں کی آراستگی سے باغبان کا دامن اور گلفروش کا ہاتھ بنا ہوا تھا یعنی عجب دلبستگی اور دل فریبی کے سامان جمع ہو گئے تھے اور ان کی تفصیل یہ ہے۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

ساقی کی مستانہ چال پامال کئے دیتی تھی اور چنگ و رباب کی آواز کھینچے لیتی تھی ایک طرف تو نگاہ کے لئے جنت کا سماں روبرو تھا اور دوسری طرف کانوں کے واسطے فردوس کی نغمہ سرائی کے لطف حاصل ہو رہے تھے۔ یہ گویا حوریں تھیں اور وہ طیور خوشنوا۔

یا صبحدم جو دیکھیے آ کر وہ بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

صبح کے وقت جو آ کر دیکھا تو بزم میں عجیب اُداسی اور بے رونقی پائی جاتی تھی، نہ تو وہ باجوں کی آوازیں تھیں نہ وہ اہلِ بزم کا سوز و گداز تھا نہ وہ محفل کا جوش و خروش تھا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ان سب کیفیتوں اور سامانِ انبساط کے بدلے یہ نظر آیا کہ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اور داغِ فراق سے افسردہ خاطر ایک شمع باقی ہے اور وہ بھی کمبخت دلِ عاشق کی طرح بجھی ہوئی ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

حق تو یہ ہے ایسی زبردست غزل لکھ کر میرزا صاحب کا یہ مقطع لکھنا ہرگز تعلّی میں داخل نہیں ہے بلکہ حقیقتِ حال ہے۔ فرماتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے مضامین بلند غیب سے وارد ہوتے ہیں۔ اسے غالبؔ میرے خامہ کی آواز فرشتہ کی صدا سمجھنی چاہیئے۔

غزل

آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

فرماتے ہیں آ اور جلد آ، کہ میری جانِ زار کو صبر و قرار باقی نہیں رہا ہے۔ اب مجھ میں بیدادِ انتظار سہنے کی طاقت باقی نہیں ہے۔

دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ حیاتِ دنیا کے بدلے جنّت عطا فرمائی جائے گی، لیکن دنیاوی تکلیفوں کی تلافی جنّت سے نہ ہو سکے گی اور اس بیان کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ جس نے نشہ کی اُتار کی مصیبت بے انتہا جھیلی ہو اور اس کے بعد اس کو تھوڑی مقدار میں شراب پلائی جائے تو وہ کیا نشہ کر سکتی ہے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ میرا رونا تیری بزم سے مجھ کو نکال رہا ہے یعنی آنسو تو رُکتے نہیں اور میں بشرم بدنامی سے بزم میں ٹھہر نہیں سکتا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مجھ کو اپنے رونے پر بھی

دل کی طرح سے اختیار نہیں ہے۔ آنسوؤں کا روکنا میرے حدِ اختیار سے باہر ہے۔

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر　　خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ ہم لوگوں سے رنجشِ خاطر کا گمان بے فائدہ ہے۔ عشاق تو ایک مشت خاک سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے جو زندگی میں خاک ہو گئے ہیں ان میں غبارِ خاطر کو دخل نہیں ہے۔

دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی　　غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ جلوۂ معانی آئینۂ دل میں اسی طرح سے نظر آیا کرتا ہے جس طرح آئینۂ گل میں بہار کا حسن و جمال دکھائی دیا کرتا ہے۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے　　وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ اس نے خدا خدا کر کے میرے قتل کرنے کا عہد تو کر لیا ہے یعنی یہ تو کہہ دیا ہے کہ تجھے ہم ضرور قتل کر دیں گے۔ ہائے اگر یہ عہد مضبوط نہیں ہے تو بڑا ستم ہو گا۔

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالبؔ　　تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ تو نے میکشی کی قسم کھائی ہے۔ تیری قسم سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ترکِ میکشی کی قسم کھائی ہے یا میکشی کرنے کی، اور جب تیری قسم سے یہ دونوں پہلو جھلک رہے ہیں تو ہمیں تیری قسم کا ہرگز اعتبار نہیں ہے۔

غزل

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے　　کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

فرماتے ہیں۔ میرے حصہ میں اتنا غم آ گیا ہے کہ اس کے بوجھ سے میرا سر میرے دامنِ قبا سے اس طرح جا ملا ہے کہ نظر کے تار اور قبا کے تاروں میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی　　سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

فرماتے ہیں۔ زخم میں ٹانکے لگانے سے مجھ کو لذتِ زخمِ سوزن مطلوب ہے اور اس لذت کو حاصل کر کے جو میں بے خود و مدہوش ہو جاتا ہوں اور پھر ہوش میں آ کر لطف سے تڑپ جاتا

ہوں تو اس کو یہ نہ سمجھنا کہ دردِ زخم کی وجہ سے دیوانہ غافل ہو گیا ہے۔

وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ — چٹکنا غنچۂ گُل کا صدائے خندۂ دل ہے

فرماتے ہیں۔ وہ گل اندام جس باغ میں اے غالب سیر کے واسطے جاتا ہے اُس کے حُسنِ دلکش کے اثر سے گلاب کی کلیاں جو چٹکتی ہیں ان میں سے خندۂ دل کی آواز نکلتی ہے مطلب یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر باغ کا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔

قطعہ

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد — خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

فرماتے ہیں۔ میں صحرا نوردی کا عادی تھا۔ بمجبوری پا بہ دامن ہو کر یعنی پاؤں توڑ کر گھر میں بیٹھ رہا ہوں۔ صحرا نوردی کے زمانے میں جو کانٹے میرے پاؤں میں چبھے تھے وہ اب آئینۂ زانو کا جوہر بن گئے ہیں۔ زانو کو آئینہ سے تشبیہ دی جاتی ہے اور آئینہ فولادی کے جوہر کانٹوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت — ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے

فرماتے ہیں۔ ہم آغوشی کے وقت میرے دل کی حالت دیکھنے کے قابل ہو گی، یعنی یہ وہی دل ہے جو برسوں تیری زلفوں میں اسیر رہ چکا ہے۔ اِس لئے یہ تیرے ایک بال کو نگاہِ آشنا سمجھتا ہے اور کسی دوست کے دل کا حال دوست کو خوب معلوم ہوتا ہے۔

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ — ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

فرماتے ہیں۔ میں وہ باجا ہوں جس میں تیری شکایت کا راگ بھرا ہوا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو غیروں کے سامنے مجھے نہ چھیڑے۔ اگر تو مجھ کو چھیڑے گا تو تیری شکایت کا راگ میرے دل سے نکلنا شروع ہو جائے گا۔

غزل

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آئے — جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آئے

فرماتے ہیں۔ ناز و ادا کے ساتھ جس بزم میں تو باتیں کرتا ہے اس مکان کی دیواروں پر جو تصویریں لگی ہوتی ہیں ان میں جان پڑجاتی ہے۔

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو صنوبر   تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آئے

فرماتے ہیں۔ سرو صنوبر سایہ کی طرح تیرے ساتھ ساتھ پھرتے رہیں۔ پھر گلستان کے پابند نہ رہیں۔ اگر تو اس قدِ دلکش سے ایک بار بھی باغ میں چلا آئے (سے) کے معنی یہاں ساتھ یا ہمراہ کے ہیں۔ اکثر اہلِ زبان محاورے میں اس کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ میرزا کا یہ شعر بیت الغزل ہے۔

تب نازِ گرانمایگی اشک بجا ہے   جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آئے

فرماتے ہیں۔ ہم اس وقت اپنے آنسوؤں کو انمول موتی سمجھیں گے جب جگر کے ٹکڑوں کے ساتھ اشکوں میں مل کر دیدۂ خونبار میں آجائیں گے۔

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر   کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے

یہ دوسرا شعر بھی حاصلِ زمین ہے ایسے گرانقدر شعر ایسی سُست زمینوں میں کب کسی کو نصیب ہوا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو اپنی ستمگاری کا لطف اٹھانا ہے تو مجھ کو شکایت کی اجازت دیدے۔ اگر صبر و خاموشی کے ساتھ میں نے تیرے ظلم و ستم اٹھائے تو تجھ کو کیا معلوم ہوگا کہ کونسا تیرِ جفا تیرا زیادہ کارگر ہوا اور کونسا ناوک بیداد تیرا اوچھا زخم ڈالتا ہوا نکل گیا۔

اِس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ   طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے

فرماتے ہیں۔ اسکی چشمِ فسوں گر کا اشارہ پا جائے تو آئینہ بھی طوطی کی طرح باتیں کرنے لگے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب   اِک آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آئے

فرماتے ہیں۔ کانٹوں کی خشک زبانی پیاس کی وجہ سے ہے آبلوں کا پانی مل جائے تو ان کی تشنگی دفع ہو۔

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک   آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آئے

فرماتے ہیں. میرا معشوق زنار بند ہندو ہے۔ اس کے دوش پر زنار دیکھ کر مجھ کو رشک آتا ہے کہ وہ نازک تن میرے آغوش میں نہ ہو اور حلقۂ زنار میں ہو۔ مرجانے کی جگہ ہے۔

غارتگرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آئے

فرماتے ہیں. گل کو ہوسِ زر ہے یعنی گلاب میں جو زیرہ ہوتا ہے اُس کو زرِ گل کہتے ہیں۔ اب گل کو یہ ہوس ہے کہ اس زر کو زیادہ ہونا چاہیئے۔ اِس لئے ہوسِ زر سے اس کو بازار میں بکنے کے واسطے آنا پڑا۔ اور اس صورت میں بربادیِ ناموس ظاہر ہے یعنی شاہد بازاری بن گیا۔

تب چاک گریباں کا مزا ہے دلِ نالاں جب اِک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آئے

فرماتے ہیں. اے دلِ نالاں گریباں چاک کرنے کا مزا یہ ہے کہ تارِ گریباں کے ساتھ سانس بھی کھنچ آئے اور تارِ نفس ٹوٹ کر دم نکل جائے۔

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آئے

فرماتے ہیں. میرا سینہ رازِ نہاں کی گرمی سے آتشکدہ بن گیا ہے۔ اگر وہ راز ظاہر ہو گیا تو معلوم نہیں کہاں کہاں آگ لگ جائے گی۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ میرے اشعار کا ایک ایک لفظ گنجینۂ معنی اور طلسمِ معنی سمجھنا چاہیئے یعنی جیسے ایک لفظ میں کئی کئی معنی ہوتے ہیں اِس لئے اس کو گنجینہ سمجھنا چاہیئے اور طلسم اس وجہ سے اس کو کہا جاتا ہے کہ ایک ایک معنی میں کئی کئی پہلو نکلتے ہیں اور طلسم کی تعریف یہ ہے کہ مشکل سے کھلے اور نہایت حیرت انگیز ہو اِس لئے اس کو طلسم کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا کلام بہت دشواری سے سمجھ میں آتا ہے اور سمجھ جانے کے بعد اس کے معنی سے ایک حیرت پیدا ہوتی ہے۔

غزل

حُسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے اِس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرعہ میں دعویٰ متضمن دلیل ہے۔ معشوق کو مہِ خورشید جمال اِس لئے کہا ہے تاکہ اسکو

بادۂ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے (از یادگار غالب)

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ　　جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

میرزا نے اس شعر میں حرص و آز معشوقانہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہر لحظہ یعنی بار بار دل پر نگاہ ڈالتے ہیں جس سے دل کا سوال پیدا ہوتا ہے اور بوسہ دینے سے صاف انکار ہے۔ چہرہ کے تغیرات دلی خیالات کے ترجمان ہیں۔ دل تو یہ کہہ رہا ہے کہ مال اچھا ہے چھوڑنا نہ چاہیئے مگر ناز معشوقانہ جو حرص کا پہلو لئے ہوئے ہے وہ یہ تعلیم دے رہا ہے کہ اگر مفت میں مل جائے تو اس صورت میں اچھا مال ہے۔ پھر کسی موقع پر بوسہ کو جان کی قیمت میں لگائیں گے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جام جمشید ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جام سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ جام جم جیسی چیز سے فائق اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جام جم میں شراب پی جاتی تھی اور مٹی کے کوزے میں بھی شراب پی جا سکتی ہے۔ اب قوت متخیلہ نے ان تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دے کر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جام سفال کے آگے جام جم کی کچھ حقیقت نہ رہی اور پھر اس صورت موجودہ فی الذہن کو بیان کا ایک دلفریب پیرایہ دے کر اس قابل کر دیا کہ زبان اسکو پڑھ کر زبان متلذذ اور کان اس کو سن کر محظوظ اور دل اس کو سمجھ کر متاثر ہو سکے۔ اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل یا امیجنیشن ہے اور اس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہن کر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے۔ اس کا نام شعر ہے۔ نیز اس مثال میں امیجنیشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بمرتبۂ غایت اعلیٰ درجہ میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال

سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے (از مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ)

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے　　وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

فرماتے ہیں۔ سوال کی تلخی عطا کی شیرینی کو بدمزا کر دیتی ہے جو چیز بے طلب عنایت فرمائی جائے، اس کے لطف کا کیا کہنا ہے۔ وہ گدا جس کو عادت سوال کی نہ ہو، اچھا ہے۔ اس شعر میں ردیف کی نشست ایسی زبردست واقع ہوئی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بگڑی ہوئی طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ دوست کو جب تک عاشق اپنی حالتِ زار اور اس کی جدائی کا صدمہ نہ جتلائے دوست عاشق کی محبت اور عشق کا پورا پورا الیقین نہیں کر سکتا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ بعضی خوشی سے دفعتہً ایسی بشاشت ہوتی ہے کہ رنج و غم اور تکلیف کا مطلق اثر چہرے پر باقی نہ رہے اور اب امیجنشن نے اس تمام معلومات میں اپنا تصرف کر کے ایک نئی ترتیب پیدا کر دی یعنی یہ کہ عاشق کسی طرح سے اپنی جدائی کے زمانہ کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے اس وقت معشوق نہیں ہوتا اور جب معشوق ہوتا ہے اس وقت تکلیف نہیں رہتی۔ اس مثال میں بھی امیجنشن کا عمل معناً اور لفظاً دونوں طرح بدرجہ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے جیسا کہ ہر صاحبِ ذوقِ سلیم پر ظاہر ہے۔ (از مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ)

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض　　اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑے گا۔ وبا نہیں آئے گی، لڑائیاں نہ ہوں گی وغیرہ وغیرہ (از یادگار غالب)

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

فرماتے ہیں۔ فرہاد ایک مزدور پیشہ جوان تھا اور شیریں اس کی معشوقہ ایک بڑے دولت مند خاندان کی عورت اور نہایت باعصمت تھی۔ مگر سنگ تراشی کے کمال نے فرہاد کو شیریں تک پہنچا کر اس سے ہمکلام کر دیا۔ دنیا میں کمال عجیب شے ہے۔ اہل کمال کی احتیاج بادشاہوں کو بھی ہوتی ہے۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

فرماتے ہیں۔ فرع کا اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا زمانے کے سارے کاموں سے اچھا ہے۔

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

شاہزادہ خضر سلطان بہادر شاہ ظفر کے ایک صاحبزادہ تھے۔ یہ شعر ان کی مدح میں ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ ہم کو جنّت کی حقیقت معلوم ہے لیکن دل کے بہلائے رکھنے کو یہ خیال اچھا ہے۔ میرزا صاحب نے اِس مقطع میں قیامت کی شوخی برتی ہے۔

غزل

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی! امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

اِس مقطع کی نسبت مولانا طباطبائی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں۔ اِس شعر پر اگر غالبؔ خدائے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو خدا گواہ ہے کہ زیبا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ مطلع بھی ویسا ہی بے مثل ہے جیسا مرزا صاحب کا کلام ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے وفا کا امتحان ایسی کامیابی سے دیا کہ انجام کار اپنی جان دیدی۔ اِس پر بھی اگر آپ کی تسلّی نہیں ہوئی اور آپ نے مجھے کامل وفادار نہیں سمجھا تو اب جو آپ کے خیال میں امتحان ہو وہ بھی میری نعش پر پورا کر لیا جائے، یعنی میں نے آپ کے اور آپ کے عشق میں جان دیدی۔ اب میری نعش بھی اگر آپ چاہیں تو قیامت تک آپ کے کوچہ میں رہ سکتی ہے۔

خارِ خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے　　　شوقِ گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی

فرماتے ہیں۔ اگر شوق گلستانِ تسلّی کا گلچیں نہ بن سکا نہ سہی اس کے واسطے حسرتِ دیدار کے کانٹے ہی کافی ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر شوق کو تسلّی حاصل نہ ہوئی تو حسرتِ دیدار نے بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ تسلّی نہ سہی اس کے لئے حسرتِ دیدار کیا کم ہے۔

مے پرستاں خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے　　　ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

فرماتے ہیں۔ اے مے پرستو، انتظارِ ساقی کے بعد بھی تو خُمِ مے کو منہ لگا کر شراب پینی ہی پڑی، اگر ایک دن بزمِ مے میں ساقی موجود نہ ہوا تو نہ سہی یعنی اگر ساقی ہوتا تو وہ خم سے شیشے اور صراحیاں بھرتا اور صراحی یا شیشے سے شراب گلاس میں نکال کر پیش کرتا ہم نے اس کی غیر موجودگی میں اگر مٹکے سے منہ لگا کر پی لی تو اس میں کیا قباحت ہوئی۔

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا　　　گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

فرماتے ہیں۔ قیس کا دم صحرا کے واسطے چشم و چراغ کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی اس سے جنگل آباد ہو کر روشن ہو گیا ہے۔ اگر قیس کو لیلیٰ کے سیہ خانہ میں باریابی حاصل نہ ہوئی (اور وہاں سے دھتکار دیا گیا) نہ سہی لیلیٰ کے گھر کو سیہ خانہ تین غرض سے کہا گیا ہے۔ ایک یہ کہ مجنوں کو وہاں بار نہ ملی، نفرت سے اس کو سیہ خانہ کہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ لیلیٰ کا رنگ کالا بیان کیا جاتا ہے اس اعتبار سے بھی اس کا گھر سیہ خانہ ہونا چاہیئے۔ تیسری رعایت یہ ہے کہ لیلیٰ ہمیشہ سیاہ خیمہ میں رہا کرتی تھی۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　　نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

فرماتے ہیں۔ دنیا کی شادی و غم دونوں بے اصل ہیں۔ علاوہ ازیں نگاہِ عارف میں نہ شادی کی کوئی وقعت نہ غم کی کوئی حقیقت۔ گھر کی رونق کے لئے البتہ انجمن آرائی کی ضرورت ہے۔ محفلِ نشاط ہو یا بزمِ ماتم۔ لوگ دونوں صورتوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا　　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

میرزا صاحب اس شعر میں ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں جو میرزا کے کلام کو مہمل یا دشوار کہتے تھے۔ مطلب یہ ہے اگر کوئی ناقدر دان کچھ صلہ یا انعام دینا چاہتا تھا تو نہ دے یا کوئی سخن ناشناس تحسین و آفریں کرتا تھا تو نہ کرے۔

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

فرماتے ہیں حسینوں کی صحبت میں جو ایک دم بھر کے واسطے ناپائدار خوشی حاصل ہو جاتی ہے۔ اے غالب اسی کو غنیمت سمجھو۔ اگر اس کو قیام نہیں ہے نہ سہی۔

غزل

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

فرماتے ہیں۔ اس خوشی کے ساتھ قتل ہونے کے لئے ہم جلاد کے آگے آگے مقتل کیطرف دوڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں کہ ہمارے پاؤں جو شوق قتل میں جلد جلد بڑھ رہے ہیں ہمارے سر کا سایہ ان سے بھی دو قدم آگے آگے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ آفتاب پشت کی جانب واقع ہو تو سایہ آگے کی طرف پڑتا ہے۔

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو خراب بادۂ الفت لکھنا چاہا تھا مگر قلم مست و مدہوش ہو کر تھم گیا اور بادۂ الفت نہ لکھ سکا۔ یعنی خراب بادۂ الفت کا جملہ ناتمام رہ گیا اور اسی وجہ سے میں نرا خراب ہی رہ گیا۔ یہاں اِس جملہ کی ناتمامی نے عجیب لطف پیدا کر دیا اور اکثر کسی حالت کی ناتمامی کا بیان زیادہ لطف خیز ہوتا ہے بہ نسبت اس حالت کے تمام ہو جانے کے۔

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

فرماتے ہیں۔ دنیا کے الم و غم نے سارے نشے ہرن کر دیئے ورنہ ہم بھی غمِ عشق کی لذتوں کے لطف اٹھایا کرتے تھے۔

خدا کے واسطے داد اِس جنونِ شوق کی دینا کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

فرماتے ہیں۔ خط لکھ کر اس کے جواب کا دل میں ایسا شوق پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم نامہ بر سے بھی پہلے معشوق کے دروازے پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے　　تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

تیرے آگے آئے ایک قسم کا کوسنا ہے۔ عورتیں اس محل پر تیرے دیدے گھٹنوں کے آگے آئے بولتی ہیں۔ میرزا فرماتے ہیں۔ اے طرہ ہائے پُر خم معشوق یہ عمر بھر جو ہم نے تمہاری وجہ سے پریشانیاں اُٹھائی ہیں یہ تمہارے آگے آئے یعنی خدا تم کو ہمارے تکلیف دینے کا بدلہ دے۔

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے　　ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

فرماتے ہیں۔ ہم جس کو سانس سمجھ رہے تھے وہ ایک موجِ خوں کی پرافشانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم نے دل و جگر کو خون کر دیا ہے۔

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ　　ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

فرماتے ہیں۔ یا تو اس قدر محبت اور ایسا اتحاد تھا کہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے یا اب ایسی نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ جنازہ پر آنے سے بھی صاف انکار کیا جاتا ہے۔

غزل

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے　　یہ بھی مت کہہ کہ جو کہئے تو گلا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ شکوہ کے نام سے اس کو ایسی نفرت ہو گئی ہے کہ اگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ (اس کو شکوہ سے نفرت ہو گئی ہے) تو اس بیان کو بھی گلا سمجھتا ہے، یعنی یہ بیان بھی داخل شکوہ سمجھا جاتا ہے۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا　　اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ میں شکایت سے ایسا بھرا ہوا ہوں جیسا راگ سے باجا بھرا ہوا ہوتا ہے اور اِک ذرا مجھ کو چھیڑ کر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ یعنی میں کس قدر شکایت کرتا ہوں اور کیسے کیسے گلے میری زبان پر آجاتے ہیں۔ چھیڑنا محاورہ میں آغاز گفتگو کو بھی کہتے ہیں اور باجا شروع کرنے کو

بھی کہتے ہیں۔ اور ایسے مذاق کو بھی کہتے ہیں جس سے دوسرا آدمی بُرا مانے۔

گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو! شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ جس وقت معشوق سے ہم اس کے جور کی شکایت کرتے ہیں، باوجودیکہ وہ اپنی کمسنی کی وجہ سے ہماری بات کا پہلو سمجھ نہیں سکتا۔ مگر تاہم یہ حُسن تلافی قابل دید بلکہ لائقِ داد ہے کہ وہ جفا پر اور زیادہ مستعد ہو جاتا ہے۔

عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی وہ چال سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ عشق کی راہ میں آسمان ستارہ دار اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی آبلہ پا بہت تکلیف سے آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ آسمان کو چرخ مکوکب کہہ کر اس کا آبلہ پا ہونا ثابت کیا ہے۔

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ زمانے کو ہم سے ایسی ضد پیدا ہو گئی ہے کہ ہمارا ہر کام برخلاف مدعا ہوا کرتا ہے۔ اگر ہم پر پہلے ہی سے یہ بات ظاہر ہو جاتی تو ہم اپنے بدخواہ بن جاتے، اور ہماری بدخواہی ہماری مدعا برآری کی صورت پیدا کر دیتی۔ یعنی ہمارا ہر کام برعکس مدعا ہوتا ہے جب ہم اپنی بربادی کی خواہش کرتے تو نتیجہ اس کا کار براری ہوتا۔ میرزا کی شوخیِ طبیعت کا یہ شعر ثبوت دے رہا ہے۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوکِ بیداد کہ ہم آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ ہم تیر ستم کے ایسے شائق ہیں کہ اگر کوئی تیر خطا ہوتا ہے تو ہم دوڑ کر اس تیر کو اٹھا لاتے ہیں اور ناوک افگن کی نذر کر دیتے ہیں کہ لیجئے پھر اس کو دوبارہ لگائیے اور ہم کو ہدفِ تیر ستم کئے بغیر نہ چھوڑیئے۔

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ یا تو وہ کیفیت تھی کہ میرا نالہ سات آسمانوں سے گزر کر بابِ اجابت پر پہنچتا تھا۔ یا اب ضعف و نقاہت سے یہ حالت ہے کہ جو نالہ بہت ہی رسا ہوتا ہے وہ لب تک آ جاتا ہے

ورنہ ایسا ویسا نالہ تو سینہ ہی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

قطعہ

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن! شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

باربد ایک مشہور گویّے کا نام ہے۔ فرماتے ہیں۔ میرا قلم وہ کہ بزمِ سخن کا ایک باربد ہے بادشاہ کی مدح میں اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے۔ یعنی:۔

اے شہنشاہ کواکب سپہ و مہر علم تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

اے شہنشاہ گویا ستارے تیری سپاہ ہیں اور مہر تیرا علم ہے۔ تو ایسا بڑا بادشاہ ہے، تیری مہربانیوں کا حق کس شخص سے ادا ہو سکتا ہے۔

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجئے تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ اگر ساتوں اقلیموں کا حاصل جمع کر لیا جائے تو وہ تیرے لشکر کا گویا نعل بہا ہے۔

ہر مہینہ میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ چاند ہر مہینہ میں جو بدر بن جانے کے بعد کاہیدہ ہوتے ہوتے ہلال کی صورت پکڑتا ہے۔ یہ تیرے در پر ناصیہ سائی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلخوانی میں یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ میں جو آئینِ غزلخوانی کو توڑ کر تیرا مدح سرا ہو جاتا ہوں، یہ تیرے کرم کی وجہ سے ہے یعنی تیرا کرم ذوقِ مدح سرائی بڑھاتا رہتا ہے۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ میری نواہائے تلخ کو سُن کر تو بے مزا اور بے لطف نہ ہو، یہ عذر کے سبب سے ہے۔ یعنی آج میرے دل میں درد کسی قدر زیادہ ہو گیا ہے، اِس لئے میری زبان سے پُر درد شعر نکل رہے ہیں۔

غزل

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ میری ہر بات کو سُن کر آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تیری کیا حقیقت ہے۔ یعنی مجھ کو آپ بہت ہی حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ میں آپ ہی سے دریافت کرتا ہوں، آپ یہ تو بتائیے کہ یہ گفتگو کا طریقہ کیا ہے۔

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خُو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ اگر اس کی تند خوئی کی وجہ سے اس کو شعلہ کہوں تو شعلہ میں یہ کرشمہ و ناز کہاں ہے اور اگر شوخی کے سبب سے اس کو بجلی قرار دوں تو بجلی میں یہ انداز و ادا کہاں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شوخ تند خُو در حقیقت ہے کیا۔ کوئی اگر بتا سکتا ہے تو مجھے بتائے کہ وہ کیا ہے۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ میں تو اس رشک کی وجہ سے پریشان اور فکرمند رہتا ہوں کہ وہ تم سے ہمکلام ہوتا ہے وگرنہ مجھے بد آموزیِ عدو کی کچھ پروا نہیں ہے۔ وہ میری طرف سے تم کو خواہ کتنا ہی بھڑکائے میں اِس بات سے نہیں ڈرتا۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ ہمارے سینے پر لہو کی وجہ سے گریباں چاک ہونے کے بعد چپک کر مل گیا ہے۔ اب اس کو رفو کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اِس شعر میں یہ خوبی پیدا ہو گئی ہے کہ لہو نکلنے کا سبب دیوانگی کی وجہ سے خود میرزا صاحب کو معلوم نہیں ہے اِس لئے اس کو بیان نہیں کر سکتے۔ خبر نہیں گریباں چاک کرتے وقت ناخن سے سینہ پر خراش آئی ہے یا لڑکوں کا کوئی پتھر خراش کا باعث ہوا ہے یا بے خیالی میں خارِ مغیلاں جا پڑے ہیں یا خون کے آنسوؤں سے روئے ہیں۔ یہ سب احتمال تعین نہ کرنے سے زیادہ لطف دے رہے ہیں۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کُریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ جہاں جسم جلا ہے وہاں دل بھی جل گیا ہو گا۔ اب جو بیٹھے ہوئے راکھ کُرید رہے ہو

تو نہیں کیا جستجو ہے۔ کس بات کی تلاش کر رہے ہو۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ ہم اس کو لہو نہیں سمجھتے جو انسان کی رگوں میں دوڑتا پھرے اور باعثِ حیات سمجھا جائے ہم تو اس کو لہو جانتے ہیں جو کسی پر عاشق ہونے کے بعد آنکھوں سے بہتا ہے وہ لہو ہے۔

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ بہشت میں سب سے بڑی نعمت شراب ہے۔ اور شراب ہی کے لئے ہم بہشت کو عزیز رکھتے ہیں۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ شراب پینے میں میں اس قدر عالی ظرف واقع ہوا ہوں کہ شیشہ و قدح و کوزہ اور سبو سے تو مجھ کو سرور ہونا ناممکن ہے۔ ہاں اگر دو چار خُم موجود ہوں تو میں شراب پیوں۔

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی تو کس اُمید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ میں اِس ضبط کا انسان تھا کہ آرزو ہی آرزو میں جان دیدی اور کبھی حرفِ آرزو کو لب پر نہ لایا۔ اب تو طاقتِ گفتار ہی باقی نہ رہی۔ مگر جب قوتِ گویائی پر قبضہ حاصل تھا اس وقت بھی نااُمیدی کے حرف شوق کو کبھی زبان تک نہ آنے دیا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کی مصاحبت نے غالبؔ کو چار چاند لگا دیئے ہیں اب اِتراتا پھرتا ہے ورنہ اِس سے پہلے شہر میں اس کو کون جانتا تھا۔ کیا خوب مقطع کہا ہے اور کیسی مرصع غزل لکھی ہے۔

غزل

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ میں ان کو چھیڑوں اور وہ اس کے جواب میں مجھ کو بُرا بھلا نہ کہیں یہ بڑے تعجب

کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت شراب پیے ہوئے نہ تھے اس لئے وہ سمجھ گئے کہ
ان کو چھیڑ رہا ہوں۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو   کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ میں تو قہر و بلا کے لئے مخصوص ہوگیا ہوں اور تم بھی سراپا غصہ اور سراپا شوخی ہو۔ کاش میری قسمت میں تم کو لکھدیا جاتا اور خصوصیت کے ساتھ تم میرے ہوجاتے معشوق کی شوخی اور بدمزاجی کی تصویر اپنے شوق و حسرت کے خاکہ کے ساتھ اس خوبی سے کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ اس کثرت سے اگر میری قسمت میں رنج و غم لکھا گیا تھا تو یارب دل بھی ایک کے بدلے دس بیس عطا فرمادیئے ہوتے۔ ایک دل میں اتنا غم سما نہیں سکتا۔ ندرت بیان قابل داد ہے۔

آہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ   کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ وہ رفتہ رفتہ ہمارا کہنا مان لیتا، تم جلدی کرکے مرگئے تمہیں اور کچھ دن زندہ رہ کر اس کی التجا کرنی تھی۔

غزل

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے   ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

فرماتے ہیں۔ روز محفل منعقد ہوتی ہے۔ روز غیروں کے ساتھ گلچھرے اڑائے جاتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے بھر بھر کے جام غیروں کو دیئے جاتے ہیں۔ ہم پیغام طلب سے تشنہ لب یعنی محروم رہتے ہیں، کبھی ہم کو بھول کر بھی بزم ناز میں نہیں بلایا جاتا۔ الفاظ سے حسرت ٹپکتی ہے۔

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ   ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

فرماتے ہیں۔ اپنی تباہی اور بربادی کا گلہ ہم کو تم سے نہیں ہے۔ یہ تو اس منحوس آسمان کے

ستم و جور کے ڈھنگ ہیں۔ یہ ظالم رات دن نئے نئے حیلے بہانے تراشتا رہتا ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو　　ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

فرماتے ہیں۔ اگر خط لکھنے کے لئے کوئی نیا مضمون ہاتھ نہ آئے نہ سہی۔ ہم تمہارے نام کے عاشق ہیں۔ تمہارا نام عنوانِ خط پر لکھتے ہیں اور مطلب اگر نہیں ہے تو نہ ہو۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم　　دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

فرماتے ہیں۔ رات کو چاہِ زمزم پر بیٹھ کر شراب پی اور وہ بھی احرام باندھنے کی حالت میں۔ کہ جب تمام معاصی کا ترک کر دینا لازمی اور ضروری سمجھا جاتا ہے پھر صبح کے وقت جامۂ احرام کے دھبے جو شراب کے گرنے سے پڑ گئے تھے دھو کر پاک و صاف ہو گئے۔ اس شعر میں رندی اور شوخی کی تصویر کھینچ دی ہے۔

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر　　یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

فرماتے ہیں۔ ہماری آنکھوں نے کیا ہمارے دل کو پھنسایا مگر ایسا ثابت ہوتا ہے کہ ہماری آنکھیں بھی تمہارے دام کے حلقے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کی آنکھیں عشاق کو مبتلائے حُسن معشوق کرتی ہیں۔ اِس لئے ثابت ہوتا ہے کہ آنکھیں عشاق کی حلقۂ دام معشوق ہیں۔

شاہ کی ہے غسلِ صحت کی خبر　　دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کے غسلِ صحت کی خبر گرم ہو رہی ہے۔ دیکھئے کب حمام کی قسمت جاگتی ہے۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

صاف اور سیدھا شعر ہے اور پھر لطف سے خالی نہیں۔

غزل

پھر اس انداز سے بہار آئی　　کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

فرماتے ہیں۔ پھر دوبارہ موسم بہار اس خوش ادائی کے ساتھ آیا ہے کہ مہر و ماہ اس کے

تماشائی بن گئے ہیں۔

قطعہ

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک　　اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

فرماتے ہیں۔ اے خطۂ خاک کے رہنے والو یہ تماشہ دیکھو، تمام عالم کا آراستہ کر دینا اسکو کہتے ہیں،

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر　　روکشِ سطحِ چرخ مینائی

یعنی زمین پر اس کثرت سے سبزہ و گل پیدا ہو گئے ہیں کہ زمین سطحِ چرخ مینا رنگ کی مدمقابل بن گئی ہے۔

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی　　بن گیا روئے آب پر کائی

فرماتے ہیں۔ سبزہ نے کثرت سے پیدا ہو کر جب ساری زمین کو گھیر لیا اور اب کہیں اسکی روئیدگی کے لئے زمین پر جگہ باقی نہ رہی تو مجبوری سے پانی کے اوپر کائی کی شکل میں ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔

سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے　　چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

فرماتے ہیں۔ چشمِ نرگس کور سمجھی جاتی تھی مگر اب اس کو باغبانِ عالم نے بینائی عطا فرمائی ہے تاکہ وہ سبزہ و گل کی کثرت کا تماشہ دیکھے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر　　بادہ نوشی ہے باد پیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے اس میں بادہ پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ بادہ پیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔ پس ایک معنی تو اِس کے یہ ہیں کہ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی فضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہو گا اور باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اِسی طرح بادہ پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اِس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ

آج کل ہوا کھانی بھی شراب پینی ہے (از یادگارِ غالب)

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ　　شاہِ دیندار نے شفا پائی

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ دنیا یعنی سارے زمانے کو خوشی کیونکر حاصل نہ ہو، دیندار بادشاہ نے مرض سے شفا پائی ہے۔

غزل

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے　　اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

فرماتے ہیں۔ میں تغافل پسند آدمی ہوں میری طینت میں عجز و انکسار کا مادہ اس قدر زیادہ پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے حق میں بے التفاتی اور بے توجہی کو بہ نسبت التفات و توجہ کے زیادہ پسند کرتا ہوں مجھ سے پہلو تہی کرنا گویا میرے واسطے پہلو میں جگہ خالی کرنی ہے۔ میں اغماض کو اکرام سمجھتا ہوں۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے　　بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہلِ ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ جاننا چاہیئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح میخانہ میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانہ میں کوئی میخوار نہیں ہے، اسی طرح عالم کا آباد و معمور ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہلِ ہمت معدوم ہیں (از یادگارِ غالب)

غزل

کب وہ سنتا ہے کہانی میری　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

فرماتے ہیں۔ پہلی دشواری اور مصیبت تو یہی ہے کہ وہ میری کہانی یعنی میری مصیبت کا حال سنتا ہی نہیں اور پھر اس کے ساتھ دشواری پر دشواری اور مصیبت پر مصیبت یہ ہے

کہ میری زبانی کب سنتا ہے۔ الفاظ کی نشست بندش کی چستی۔ بیان کی خوش اسلوبی، خیال کی بلندی یہ ساری باتیں اس مطلع میں باحسن الوجوہ واقع ہوئی ہیں۔ تعریف سے مستثنیٰ ہے۔

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ　　　دیکھ خونابہ فشانی میری

فرماتے ہیں۔ غمزۂ خونریز کی کاوشوں کا حال مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ میں کب اس کی خلشوں کو بیان کر سکتا ہوں۔ دل میں زخم کلیجہ میں ناسور ڈال دیئے ہیں۔ یہ دیکھ لے لہو کے آنسوؤں سے رو رہا ہوں۔

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار　　　مگر آشفتہ بیانی میری

فرماتے ہیں۔ مجھ میں کیا وصف ہے کہ جس کو بیان کر کے میرے دوست میرے مرجانے کے بعد روئیں گے۔ مگر میری آشفتہ بیانی ہے، شاید اسی کو یاد کر کے روئیں۔ آشفتہ بیانی انکسار کی وجہ سے یہاں کہی گئی ہے۔ حق یہ ہے کہ میرزا صاحب کے بیان کی شوخیاں ایسی اچھوتی اور نرالی ہوتی ہیں کہ کسی شاعر کا بیان ان کے بیان کی خصوصیت کو نہیں پہنچ سکتا۔

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال　　　بھول جانا ہے نشانی میری

بیدا۔ بالفتح۔ بمعنی بیاباں و دشت۔ فرماتے ہیں۔ صحرائے خیال کا از خود رفتہ ہوں مطلب یہ ہے کہ دوستوں کے خیال سے نکل جاتا ہوں اور احباب کا مجھے بھول جانا ہی میری نشانی ہے۔

متقابل ہے مقابل میرا　　　رُک گیا دیکھ روانی میری

میرزا صاحب نے اس شعر کی شرح عود ہندی میں تحریر کی ہے۔ فرماتے ہیں تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت۔ شادی و غم۔ راحت و رنج، وجود و عدم لفظ متقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہیں جیسے حریف بمعنی دوست بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روئے خوئے و عادت ضد ہمدگر ہیں وہ میری روانی دیکھ کر رُک گیا۔

قدر سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں　　　سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے کہ میری قدر اس پتھر

کی سی ہے جو راہ کے بیچ میں پڑا ہو اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر گزرے یعنی ہوں
گرانقدر مگر اس پتھر کی طرح بے قدر ہوں، پس میری گرانی کس قدر ارزاں ہے (از یادگار غالب)

گردبادِ رہِ بیتابی ہوں   صرصرِ شوق ہے بانی میری

فرماتے ہیں۔ میں بگولے کی طرح سے بیقرار ہوں اور رہگزر بیتابی کا گردباد ہوں میری بیتابیوں
کی بانی مبانی صرصرِ شوق ہے۔

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا   کھل گئی ہیچمدانی میری

فرماتے ہیں۔ اس کا دہن ہیچ ہے اِس لئے مجھ پر ظاہر نہ ہوا اور میں اس کو نہیں جانتا اور جو
شخص اس کے دہن کو نہ جانے وہ ہیچمداں ہے۔ پس میری ہیچمدانی سب پر ظاہر ہوگئی۔

کر دیا ضعف نے عاجز غالب   ننگِ پیری ہے جوانی میری

فرماتے ہیں۔ اے غالب میں جوانی میں اس درجہ ضعیف و ناتواں ہوگیا ہوں کہ بوڑھے بھی
اتنے کمزور اور نحیف نہیں ہوتے۔ میری جوانی ننگِ پیری سی ہے۔

غزل

نقش نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب   پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

فرماتے ہیں۔ آغوشِ رقیب میں اُس بتِ طناز کی تصویر اس قدر بدنما اور بے جوڑ معلوم ہوتی
ہے کہ اس کے کھینچنے کے لئے بجائے موقلم پائے طاؤس دستِ مانی میں چاہیئے۔ مطلب یہ ہے
کہ جس طرح طاؤس کے پر و بال اور اعضائے جسم حسین و خوبصورت مایۂ فخر و ناز واقع ہوئے ہیں،
اِسی طرح اس کے پاؤں بدرنگ اور بدصورت اُس کے حُسن و جمال کے لئے موجبِ ننگ و عار
پیدا ہوئے ہیں اِسی طرح رقیب سے ہم آغوشی کی حالت میں اس کی ناز کرنے والی تصویر کی
کیفیت ہے۔

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے   غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

فرماتے ہیں۔ تحیر میں خاموشی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے اور تو ایسا بدخو ہے کہ میری حیرت

اور میری خاموشی کو تماشہ سمجھتا ہے اور غم وہ افسانہ ہے کہ اس کے لئے آشفتہ بیانی اور پریشان گوئی درکار ہے۔ اگر میں حیرت و خاموشی کو دُور کر کے غمِ دل زبان پر لاتا ہوں تو تو بے لطف و بے مزہ ہوتا ہے۔

وہ تپِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو ایسی تپِ عشق کی تمنّا اور آرزو ہے کہ جس کا شعلہ شمع کی طرح جگر تک دوڑ جانے والا ہو۔

قطعہ

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گُل ہونا آغوش کشائی ہے

فرماتے ہیں۔ باغ کو تیری صحبت سے سرور و فیضیاب ہونا اس قدر پسند آیا ہے کہ ہر غنچۂ گل کا کھلنا تیرے شوق میں آغوش کشائی ہے یعنی تجھ سے بغلگیر ہونے کا تمنّائی ہے۔

واں کنگرۂ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالہ کو اور اُلٹا دعوئ رسائی ہے

فرماتے ہیں۔ ان کا کنگرۂ استغنا دن دونا رات چوگنا بلند ہوتا چلا جاتا ہے اور ہمارا نالہ دن بدن پست ہوتا جاتا ہے یعنی اب وہ دل سے چل کر لب تک بھی نہیں آتا۔ سینہ ہی میں ہمت ہار کر رہ جاتا ہے۔

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

فرماتے ہیں۔ غمِ عشق مجھ کو ضبط کی تعلیم کر رہا ہے۔ دل میں جو نیا داغ پڑتا ہے وہ اس استاد یعنی غمِ عشق کی چشم نمائی کا کام دیتا ہے۔

غزل

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

فرماتے ہیں کہ ایسا زخم جس میں ٹانکے دیئے جا سکیں اور جس کے مندمل ہونے کی اُمید کیجا سکے وہ مجھ کو درکار نہیں ہے۔ دشمن کی قسمت میں اس زخم کو لکھ دینا میں تو ایسے زخم کا خواہش مند ہوں کہ جسے دیکھ کر چارہ گر بھی علاج سے دست بردار ہو جائے۔

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور　　دل میں نظر آتی تو ہے اِک بوند لہو کی

لفظ تو نے جو دوسرے مصرعہ میں ہے یہ معنی پیدا کر دیئے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں، اس لئے دوست کے سرِ انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ [illegible] یہی لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے (از یادگارِ غالب)

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے　　یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یاں سے مراد دنیا۔ معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے ظلم و جور سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کرینگے کس لئے کہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا (از یادگارِ غالب)

دشنہ نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو　　خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

فرماتے ہیں۔ چھری نے کبھی جگر کو منہ نہ لگایا ہو یعنی اس پر التفات نہ کیا ہو اور خنجر نے کبھی گلو کی بات بھی نہ پوچھی ہو، یعنی توجہ نہ کی ہو۔ دشنہ و خنجر سے ناز و انداز و ظلم و بیدادِ معشوق مراد ہے۔

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالبؔ　　حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ اس ناکام تمنا کی حالت قابلِ افسوس ہے کہ جو برسوں سے ایک بتِ عربدہ جو کی تمنا میں زندگی بسر کر رہا ہو۔

قطعہ

سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے ہم　　حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے

پشت گرمی بمعنی پشتبانی و اعانت۔ فرماتے ہیں۔ جس طرح سیماب یعنی پارے کی قلعی سے آئینہ روشن ہو کر صورت حیرت پیدا کر لیتا ہے اسی طرح ہم کو دلِ بیتاب نے سراپا حیرت بنا رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آئینہ پارے کی قلعی سے عکس پذیر ہونے کی قابلیت پیدا کر لیتا ہے اسی طرح عشاق دلِ بیتاب کے ذریعے سے معشوق کے جلوہ سے فیضیاب ہونے کی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

فرماتے ہیں۔ پھول کا کھِلنا گلے ملنے کے لئے ہاتھ کو پھیلانا ہے۔ اے بلبل جلد آ کہ معانقہ کریں بہار کے دن صبح شام ہی میں جانے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عیش و راحت کا زمانہ دنیا میں بہت ہی قلیل ہے جس طرح بہار اِدھر آتی ہے اُدھر رخصت ہو جاتی ہے۔

قطعہ

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں معشوق شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیئے

فرماتے ہیں۔ اگر معشوق کے مزاج میں خودداری اور تمکنت ہے اور عاشق کی طبیعت میں صبر و ضبط کا مادّہ ہے تو عین وصل میں بھی فراق کی طرح بے لطفی نصیب ہوگی۔ مزا اس میں یہ ہے کہ معشوق شوخ و بیباک اور عاشق دیوانہ و گستاخ، کہ وصل میں کامیابی کے ساتھ لطف زندگی حاصل کر سکے۔

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں شوقِ فضول و جراُتِ رندانہ چاہیئے

فرماتے ہیں۔ کبھی تو اس کے لبوں کا بوسہ مل ہی جائے گا۔ ہاں اس کے واسطے شوق حد سے بڑھا ہوا اور جراُتِ رندانہ درکار ہے۔

غزل

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ اگر دنیا میں کسی سے محبت ہو تو وہ حسینوں سے ہو۔ اور اگر یہ لوگ خود بھی کسی کو چاہیں تو پھر کسی اور نعمت کی ضرورت ہی باقی نہیں ہے۔

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ رندوں کی صحبت سے حذر واجب اور لازم ہے بجائے شراب کھینچنے کے شراب سے اپنے کو کھینچنا چاہیئے۔ یعنی رندوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیئے، اور مے پینے سے احتراز لازم ہے۔

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل　　بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ تیرے چاہنے کو دل نے کیا سمجھا تھا، یعنی کھیل سمجھا تھا سہل سمجھا تھا۔ کیا سمجھا تھا۔ اب اس نابکار دل سے ذرا تجھ کو اس چاہت کا بدلہ لینا چاہیئے مطلب یہ ہے کہ ضبط عشق اور صدمۂ فراق کی تاب و طاقت نہ تھی تو کیا سمجھ کر عشق کیا تھا۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل　　کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

پھول کے کھلنے کو چاک گریباں سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیئے۔ پس جب تک پھول اپنا گریباں چاک نہ کرے تو بھی گریباں چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوشِ جنوں زیادہ ہوتا ہے۔ (از یادگار غالب)

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ تم جو ہم سے بیگانہ وار پردہ کرتے ہو اور منہ چھپا لیتے ہو اس پردہ میں لگاوٹ جھلک دکھاتی ہے اور دیکھنے والوں کو شبہ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم سے منہ چھپانا چھوڑ دینا چاہیئے۔ میرزا صاحب اس چال سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو　　کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ میری دشمنی میں غیر نے اپنے کو مٹا دیا۔ یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ وہ میرا کس درجہ دشمن ہے۔

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی　　یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ ہم اپنی سعی کوشش سے اپنے کو رسوا بھی نہیں کر سکتے ہماری بدنامی بھی اُسی کی ہنگامہ آرائی پر منحصر ہے یعنی وہ جس کو چاہے ذرا سی اپنی جھلک دکھا کر مضطرب و بیتاب بنا دے اور یہ اضطراب و بیتابی و بدنامی و رسوائی کا باعث بن جائے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　نا اُمیدی اُسکی دیکھا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ جس شخص کی اُمید کا حصر مرنے پر ہو اس کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس درجہ کس حد تک نا اُمید ہو چکا ہے، بالکل نیا اور اچھوتا مضمون ہے اور اس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ توصیف سے مستغنی ہے۔

غافل ان مہ طلعتوں کیواسطے   چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ اے غافل ان مہ جبینوں کے لئے چاہنے والا بھی خوبصورت اور وضعدار ہونا چاہیئے۔

چاہتے ہیں خوبرُویوں کو اسدؔ   آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

فرماتے ہیں۔ اور تماشہ دیکھئے۔ حضرت آسد بھی حسینوں کی چاہت کا دعویٰ کرتے ہیں، ذرا آپ کی صورت تو ملاحظہ فرمائیے یعنی ایسی بھونڈی صورت پر کوئی خوش رو معشوق کب التفات کرتا ہے۔

غزل

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے   میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ میں جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہوں اتنی ہی منزل مجھ سے دور ہوتی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جس چال سے بیاباں طے کر رہا ہوں اسی چال سے بیاباں بھی میرے آگے آگے بھاگا جاتا ہے۔

درس عنوان تماشا بتغافل خوش تر   ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ دنیا کے تماشے سے عبرت کا سبق حاصل کرنا بھی تغافل کے ساتھ بہتر ہے، یعنی اچٹتی ہوئی نگاہ سے آغاز تماشہ کو دیکھ لینا نتیجہ نکال لینے کے لئے کافی ہے، اس لئے میری نگاہ شیرازۂ مژگاں کا رشتہ بن گئی ہے۔ مطلب یہ ہے میں ایسا تغافل پسند ہوں کہ میری نگاہ بھی آنکھ کے پردہ سے باہر نہیں نکلتی اور دنیا کی نیرنگیوں سے سبق حاصل نہیں کرتی۔

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں   صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ فراق کی راتوں میں میرا سایہ میری آتش دل سے رم کرکے اس طرح بھاگ جاتا تھا جس طرح آگ سے دھواں بھاگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شب تنہائی میں میرا سایہ بھی میرا ساتھ نہ دیتا تھا وہ بھی مجھ کو تنہا چھوڑ جاتا تھا۔

غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ خدا ایسا نہ کرے کہ عاشقوں کا غم خوبرو معشوقوں کو سادگی کی تعلیم دے اور یہ لوگ ان کے سوگ میں زینت و آرائش ترک کر دیں۔ ایک میرے ہی مرجانے سے کس قدر خانہ آئینہ ویران ہو گیا ہے اب اس میں حُسن کا جلوہ نظر ہی نہیں آتا۔ یعنی میرے ماتم میں معشوقوں نے آئینہ دیکھنا اور بناؤ سنگھار کرنا بالکل ترک کر دیا ہے۔

اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں صورت رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ صحرا نوردی میں میرے پاؤں کے چھالے پھوٹ گئے ہیں۔ خون ان سے جادۂ صحرائے جنوں پر ٹپکا ہے۔ وہ جادہ رشتہ گوہر کی طرح چراغاں بن گیا ہے۔

بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جو پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ خدا ایسا کرے کہ میری بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جائے۔ سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے بھرا ہوا ہے۔ مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ بیخودی کے عالم میں راحت و آرام سے میں اپنے گھر میں اپنے بستر پر پڑا رہوں۔ کہیں خدا ایسا کرے۔

شوق دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے ہو نگہ مثل گل شمع پریشاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ تو اگر شوق دیدار کی حالت میں میرا سر کاٹ بھی ڈالے تو میری نگاہیں اسی طرح نکل کر چاروں طرف تیری جستجو میں پھیل جائیں گی جس طرح شمع کا گل کتر دینے کے بعد اس کا شعلہ زیادہ روشن ہو کر روشنی کو بڑھا دیتا ہے۔

بیکسی ہائے شب ہجر کی وحشت ہے ہے سایہ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ شب غم کی اُداسی اور بیکسی سے میرا سایہ مجھ سے وحشت کر کے ایسا بھاگا اور اس قدر

ڈرا کہ آفتابِ قیامت میں جا کر چھپ گیا۔ باوجودیکہ آفتاب سے سایہ بھاگ جاتا ہے لیکن میرا سایہ مجھ سے ایسا گریزاں ہوا کہ آفتاب حشر میں جا کر پنہاں ہو گیا۔

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے　　آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ تیرا جلوۂ رنگیں اس بزم میں ساغرِ شراب کی گردش کا کام دے رہا ہے، یعنی وہ بھی شرابِ تند کی طرح ہوش ربا ثابت ہوا ہے اور میرا دیدۂ حیران آئینہ داری کا نمونہ دکھا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے حُسن سے لوگ مدہوش ہو رہے ہیں اور میرے عشق کو دیکھ کر انسان حیرت میں مبتلا ہے۔

نگہِ گرم سے اِک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ　　ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ میں جو فراقِ یار میں باغ کی سیر کو گیا ہوں تو میرے جسم میں آگ لگ گئی ہے اور پھولوں کو دیکھ کر میری آنکھوں سے ایسے شعلے نکلے ہیں کہ جن سے جل کر خس و خاشاکِ گلستان چراغاں بن گئے۔

غزل

[**نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سُنائے نہ بنے　　کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے**

فرماتے ہیں۔ وہ شوخ نکتہ چیں ہے۔ بن نہیں پڑتی کہ غمِ دل اس کو سنایا جائے یعنی وہ ایک ایک لفظ کی گرفت کرے گا اور پھر اعتراض جڑے گا۔ بات کیا بنے جہاں بات بنائے نہ بنے۔ بات بنانی جھوٹ بولنا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی نکتہ چینی کی وجہ سے ہمارا جھوٹ اس پر ظاہر ہو جائیگا، اور بات بگڑ جائے گی۔

میں بلاتا تو ہوں اُسکو مگر اے جذبۂ دل　　اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ میں اس کو بلاتا تو ہوں لیکن یہ اُمید نہیں ہے کہ میرے بلانے سے چلا آئیگا اے جذبۂ دل تو اگر کچھ مدد کرے اور ایسی کشش اس پر ڈالے کہ بغیر آئے اس کو بن نہ پڑے تو وہ آسکتا ہے۔

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے　　کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ وہ ستم و جور کو بھی کھیل سمجھ کر برتتا ہے۔ اس سے مجھ کو یہ خوف ہے کہ وہ ظلم کو چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے۔ کاش ایسا ہی ہو کہ بغیر میرے ستائے اس کو چین نہ آئے اور ہر روز پابندی کے ساتھ ستاتا رہے۔

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر　　کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ میرا رقیب اس طرح تیرے خط کو ہر جگہ لئے پھرتا ہے کہ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ یہ کیا چیز تیرے ہاتھ میں ہے تو وہ اس کو چھپا بھی نہیں سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ رقیب ایک نہ ایک دن تجھ کو رسوا کر کے رہے گا۔

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا　　ہات آئیں تو انھیں ہات لگائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ ان کو کمال نازکی نے اس قابل نہیں رکھا کہ اگر وہ کسی مشتاق کے ہتھے چڑھ جائیں تو کوئی مشتاق وصل کامیابی حاصل کر سکے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ یہ کون بتا سکتا ہے کہ یہ کس کی جلوہ گری ہے۔ عالمِ امکان کو اس نے پیدا کر کے ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ یہ پردہ کسی کے اٹھانے سے اٹھ ہی نہیں سکتا۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے　　تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ موت کی میں کیوں راہ دیکھوں اس کا آنا تو لازمی ہے۔ وہ بغیر انتظار کے بھی اپنے وقتِ معین پر آ کر رہے گی۔ تم کو چاہوں کہ اگر تم نہ آؤ تو تمہارا بلانا بھی ممکن نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا بلانا موت کے آنے سے دشوار تر ہے۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے　　کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

دونوں مصرعوں میں اپنی مشکلات کا بیان کیا ہے۔ شعر صاف اور سیدھا ہے اور نہایت بلیغ۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ عشق پر کسی کا قابو نہیں چل سکتا۔ اے غالب یہ وہ آگ ہے کہ نہ ارادہ کے ساتھ لگائی جا سکتی ہے۔ یعنی اگر ہم یہ چاہیں کہ معشوق کے دل میں بھی اس عشق کی آگ کو بھڑکا دیں تو یہ بھی ممکن نہیں۔ اور اگر یہ چاہیں کہ اپنی لگی کو بجھا دیں تو یہ بھی بن نہیں پڑتا۔

غزل

چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے
صبح کی مانند زخم دل گریبانی کرے

فرماتے ہیں۔ اگر وحشتِ دل عریانی کی حالت میں گریباں چاک کرنے کی خواہش کرے تو یقین کامل ہے کہ صبح کی طرح میرا زخم دل بھی گریباں بن کر چاک ہو جائے۔

جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجیے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے

فرماتے ہیں۔ تیرے جلوہ کا وہ عالم ہے کہ اس کا خیال بھی آ جائے تو دیدۂ دل کو حیرانی پیدا ہو جائے۔ اسی مقام کی بابت حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم
کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرض گراں جانی کرے

فرماتے ہیں۔ ہم کب تک بیٹھے ہوئے اس آرزو میں خیالی پلاؤ پکایا کریں کہ ہمارا معشوق سنگدل ایک نہ ایک دن ضرور ہمارے شیشۂ دل کو سنگِ جفا سے توڑے گا۔ ہمیں اس سے بھی نا امیدی ہے کہ وہ ہماری دل شکنی پر متوجہ ہو گا۔

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

فرماتے ہیں اگر میکدہ کو اس کی چشم مست ناز توڑ بھی ڈالے تو شیشۂ شراب میں جو بال پڑ جائیں وہ دیدۂ ساغر کے واسطے پلکیں بن جائیں اور ساغر شراب اس آنکھ سے اس چشم مستِ شرابِ ناز کو دیکھ کر حیران ہو جائے۔

خط عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

فرماتے ہیں۔ خط عارض جو اس کے رخساروں پر ظاہر ہوا ہے یہ دراصل خطِ عارض نہیں ہے بلکہ

میری محبت نے اس کی زلفوں کو یہ عہد نامہ لکھ دیا ہے کہ جو کچھ میرے بارے میں پریشانی کو کرنا ہو کرے۔ سر تا سر مجھے منظور ہے۔

غزل

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے ۔ ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

فرماتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ خواب میں آکر تسکین اضطراب دے جائے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ میری تپش دل مجھ کو سونے کی اجازت دیدے۔ یہ ظالم یعنی میری تپش دل اس ستمگر سے زیادہ ظلم ڈھانے والی ہے۔

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا ۔ تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

فرماتے ہیں۔ لگاوٹ سے تیرا رو دینا قتل کر دیتا ہے۔ تیری آنکھوں کے آنسو شمشیر نظر میں وہ آبداری پیدا کر دیتے ہیں کہ میں تو ان کو دیکھتے ہی قتل ہو جاتا ہوں۔ لفظ (تو) نے یہاں یہ معنی پیدا کر دیئے ہیں کہ تیری طرح دوسرے معشوقان ستمگر تیغ نگاہ کو اس طرح کی آبداری دینی جانتے ہی نہیں۔

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو ۔ نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

فرماتے ہیں۔ جنبشِ لب ہی سے تلوار کا کام لے اور ہم کو قتل کر دے۔ ہم طالبِ بوسہ ہیں۔ اگر بوسہ دینا منظور نہیں ہے تو صاف جواب دیدے یعنی بوسہ دینے سے انکار کرنے سے ہم قتل ہو جائیں گے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ۔ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

فرماتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر تجھ کو یہ خیال ہے کہ میرا پیالہ نجس ہو جائے گا تو نہ دے۔ ہم شراب کے طالب ہیں۔ ہم کو اوک سے پلا دے۔ شعر رندانہ ہے مگر کیا خوب کہا ہے۔

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

فرماتے ہیں اے اسد فرطِ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے جب میں نے اس کی زبان سے یہ سنا کہ ذرا میرے پاؤں دبا دے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے قدموں تک میرے ہاتھوں کا پہنچنا اِس بات کی دلیل ہے کہ خوش نصیبی سے تمنا پوری ہونے کا زمانہ قریب آگیا۔

غزل

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

فرماتے ہیں: میرے تڑپنے سے بچھونے کا ایک ایک تار تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے۔ میرا سر تکیہ کے واسطے ایک عذاب بن گیا ہے اور میرا جسم بستر کے لئے آفت ہو گیا ہے۔

سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ میرا ہر آنسو دامن کی آنکھ کا تارا ہے اور میرا دلِ بیمار بسترِ مرض کا فرزند دلبند ہے۔ مطلب یہ ہے کثرتِ گریہ کی وجہ سے دامن کو آنسو سے انس پیدا ہو گیا ہے اور بسترِ رنجوری کو میرے دلِ بیمار سے دل بستگی پیدا ہو گئی ہے۔

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ میرا مرض بڑا اقبال مند ہے کہ تم سا پری پیکر اور مغرور میری عیادت کے لئے آیا ہے تمہارے قدم رنجہ کرنے سے شمعِ بالیں کی روشنی طالعِ بیدارِ بستر بن گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری بیماری ذریعہ خوش نصیبی ہے کہ تم میری عیادت کے لئے آئے ہو۔

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ شبِ فراق میں اس قدر اضطراب اور اس درجہ تاریکی ہے کہ ہر ایک تارِ بستر آفتاب صبحِ حشر کی کرن بن گیا ہے۔ یعنی ہر ایک سفید تار اس اندھیری رات میں اس طرح چمک رہا ہے جس طرح سورج کی کرنیں چمکتی ہیں مگر یہ شعاعِ آفتابِ حشر کی شعاع ہے اس لئے کہ جوشِ اضطراب واقع ہوا ہے۔

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ ابھی تک تکیہ سے اس کی زلفِ مشکیں کی بو آ رہی ہے یعنی رات ہی کا تو واقعہ ہے کہ اس سے وصل نصیب ہوا تھا۔ زلیخا کی طرح حضرت یوسف کا دیدار خواب میں ہونا ہمارے لئے باعثِ ننگ اور ہمارے بستر کے واسطے موجبِ عار ہے۔

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ میں کیا بیان کروں کہ ہجرِ یار میں میرے دل کی کیا حالت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ تڑپتے تڑپتے میرے بستر میں اس قدر سلوٹیں پڑ گئی ہیں کہ ایک ایک تارِ بستر پر چبھ جانے کے لئے خارِ بستر بن گیا ہے۔

قطعہ

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

رگِ گردن۔ کبر و غرور اور غیظ و غضب کی حالت میں پھول جایا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ معشوق کو میری دوستی پر اس قدر غرور ہے کہ مجھ کو اب یہ خوف پیدا ہو گیا ہے، کہیں خدانخواستہ رشتۂ محبت رگِ گردن نہ ہو جائے یعنی محبت دشمنی سے بدل جائے۔

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالبؔ اگر گُل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ فصلِ بہار میں نشو و نما کی کوتاہی سمجھنی چاہیئے۔ اگر گلاب کی بیلیں بڑھ کر اور پھیل کر سرو کے قامت پر پھولوں کا پیراہن نہ پہنا دیں۔ ندرتِ خیال اور بندشِ الفاظ قابلِ داد ہے۔

غزل

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ فریاد کے لئے کسی لَے کی احتیاج نہیں ہے۔ یعنی بے ساختگی میں تصنع کا دخل نہیں ہے۔ نالۂ دل نَے کا پابند نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آہِ دل میں جو اثر ہوتا ہے وہ بناوٹ کی فریاد و زاری میں نہیں ہوتا۔

کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے گر باغ گدائے مَے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ باغباں تونبوں کی بیلیں کس لئے باغ میں بوتے ہیں۔ اگر ان سے کشکولِ گدائی بنانا مقصود نہیں ہوتا۔ اس کوشش سے ثابت ہے کہ باغ بھی گدائے شراب ہے۔

مطلب یہ ہے کہ سبزہ و گل کی سیر کا لطف شراب پی کر خوب حاصل ہوتا ہے۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے　　　پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ ہر شے میں تیرا ظہور قدرت جلوہ نما ہے مگر تیری مانند کوئی چیز دنیا میں پیدا نہیں ہوئی۔ یعنی تو جسمانی تشبیہ سے منزّہ ہے۔ شعر تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور بہت خوب ہے۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی!　　　ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ ہاں خبردار کہیں ہستی کا دھوکا نہ کھانا۔ ہر چند لوگ کہیں ہستی ہے، مگر تو یہی سمجھنا کہ نہیں ہے۔

شادی سے گزر کہ غم نہ ہوئے　　　اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ خوشی سے دست کش ہو جا۔ پھر تجھے غم نہ ہوگا۔ یعنی اگر تو بہار کے موسم سے لطفِ نشاط حاصل نہ کرے گا تو غمِ خزاں سے کیوں ملول و رنجیدہ ہوگا۔ اُردی بہار کا مہینہ ہے اور دے خزاں کا۔

کیوں رد قدح کرے ہے زاہد　　　مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مگس کی قے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد پینے کو موجب ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اس کو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کی قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے (از یادگار غالب) شعر رندانہ ہے اور خوب ہے۔

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ　　　آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالب۔ تو جو یہ کہتا ہے کہ نہ کچھ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے۔ یہ تو ہمیں بتا آخر تو کیا (اے نہیں ہے) مطلب یہ ہے کہ لفظ (نہیں ہے) کو اسم قرار دے لیا ہے۔ کہتے ہیں، اے حضرت نہیں ہے۔ نہ تو آپ ہستی محض ہیں واجب الوجود کی مانند نہ آپ عدم ہی ہیں، ممتنع کی طرح، اس صورت میں لازم ہے کہ جناب کا اسم گرامی (نہیں ہے) رکھ دینا چاہیئے۔

غزل

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا — کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

فرماتے ہیں۔ زخم دل کے لئے جو مرہم کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے وہ نہ پوچھو۔ اس لئے کہ اس نسخہ میں دواؤں کا جزو اعظم ہیرے کی کنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زخم دل کے واسطے اس مرہم کا استعمال لازم ہے جس سے زخم دل دونا رات چوگنا بڑھتا چلا جائے۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

فرماتے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد تیرے تغافل نے ایک نگاہ پیدا کی ہے جو دیکھنے میں نگاہ سے کم ہے مطلب یہ ہے کہ پہلے تو صرف تغافل یعنی ارادتاً چشم پوشی کرتے تھے مگر اب اس ادا کو چھوڑ کر ادائے التفات برتنی شروع کی ہے یعنی پہلے تو میری طرف دیکھتے ہی نہ تھے اب دیکھ لیتے ہیں مگر ایک اُچٹتی ہوئی نظر سے۔

قطعہ

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے — مرتے ہیں مگر اُن کی تمنا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ ہم کو ان کے عشق میں اپنی ذات سے بھی رشک پیدا ہو گیا ہے اِس لئے جان دینی قبول کر لی ہے مگر ان کی تمنا سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ یعنی تمنا کریں گے تو وہ آئیں گے یا ہم کو وہاں بُلائیں گے اور ان دونوں صورتوں میں آنکھیں ان کو دیکھیں گی، ہم کو رشک آئے گا ہاتھ اُن کے ہاتھ سے ملے گا ہم جلیں گے۔ قدم ان کے کوچے کی زمین پر پڑیں گے، ہم کو حسد پیدا ہو جائے گا اِس لئے ہم نے ان کی تمنا ہی کو چھوڑ دیا۔

در پردہ اُنہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ انھیں تو غیر سے پردہ میں محبت دلی ہے۔ یہ جو انھوں نے اس سے پردہ کی رسم موقوف کر دی ہے یہ اس دلی محبت کے چھپانے کی غرض سے ہے یعنی اگر وہ پردہ کرنے کی حالت میں چھپ چھپ کر اس سے ملتے تو رسوا اور بدنام ہو جاتے اب اس کے سامنے ہوتے ہیں

دلی محبت پر پردہ ڈالنے کی غرض سے۔

یہ باعثِ نو اُمیدیٔ اربابِ ہوس ہے　　غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ غالب تمہارا عاشق صادق تھا۔ جب تم اس کو بُرا کہتے ہو تو رقیب بوالہوس ان باتوں سے شکستہ دل ہو کر نااُمید ہو جائے گا۔

غزل

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ　　خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

فرماتے ہیں۔ شراب تیرے سُرخ ہونٹوں سے شوخیٔ رنگ حاصل کرنی چاہتی ہے جام پر جو خط پڑا ہوا ہے یہ گویا گلچیں کا تارِ نظر ہے جو تیرے پھول سے لبوں کو چُن رہا ہے۔

کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے　　کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

قاعدہ ہے سودا اور جنون کی حالت میں نیند آنی موقوف ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کبھی تو میرے سرِ شوریدہ کا بھی انصاف ہو جائے کہ یہ برسوں سے تکیہ کی حسرت میں مبتلا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وصل میں سودائے عشق میں کمی ہو کر سر تکیہ سے آشنا ہو جائے گا اور نیند بھی آ جائے گی۔

بجا ہے گر نہ سُنے نالہ ہائے بُلبلِ زار　　کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

فرماتے ہیں۔ اگر پھول بلبلِ زار کے نالے نہیں سُن سکتا تو معذور ہے اِس لئے کہ گوشِ گل شبنم کے قطروں سے بند ہو گیا ہے گویا اس نے کان میں روئی ٹھونس لی ہے، اب کیا خاک نالہ بلبل سُن سکتا ہے۔

اسدؔ ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا　　مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

فرماتے ہیں۔ اسدؔ نزع کی تکلیف میں مبتلا ہے اے بے وفا خدا کے واسطے اس کے پاس چل، یہ ایسا ہی وقت ہے کہ جب شرم و حجاب کو ترک کر دینا اور تمکین و وقار کو رخصت کر دینا چاہیئے۔

غزل

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو　　یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

فرماتے ہیں۔ حسینوں کی آنکھ محو تغافل کیوں نہ ہو۔ ضرور محو تغافل ہونی چاہیئے اس بیمار یعنی حسینوں کی آنکھ کو نظارہ سے پرہیز ہے۔ چشم بیمار چشم معشوق کی صفت ہے۔

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی — وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

فرماتے ہیں۔ دم نکلتے نکلتے بھی حسرت دیدار پوری نہ ہوسکیگی۔ ہائے ناکامی کاش ایسا ہوتا کہ اس کافر کا خنجر کند ہوتا۔ دشواری سے رُک رُک کر گلا کٹتا اور حسرت دیدار تمام و کمال پوری ہو جاتی۔

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ — جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

فرماتے ہیں۔ پھولوں کو کھلا ہوا دیکھ کر اے اسدؔ ہم کو اپنے دوست کے عارض گل رنگ یاد آگئے فصل بہاراں جوشش اشتیاق پیدا کرنے والی ہے۔

غزل

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیئے — ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیئے

فرماتے ہیں۔ اگر نامہ بر بھی اُس کے حُسن دلکش پر فریفتہ ہو گیا اور بوجہ بشریت کے اپنا دل ہمارے معشوق کو دے بیٹھا تو اس میں وہ بے خطا ہے اس کو الزام نہ دینا چاہیئے، ہمارے معشوق کا حُسن دلکش ہی اس غضب کا ہے کہ جو شخص اسکو دیکھ لیتا ہمارا رقیب بن جاتا ہے۔ اس امر میں نامہ بر کی کوئی خطا نہیں، عجب دلکش مطلع لکھا ہے۔

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے — قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیئے

فرماتے ہیں۔ موت کا آنا تو لازمی اور ضروری امر ہے کسی نہ کسی روز کمبخت بے بُلائے آدھمکے گی مگر اس کو ہم سے یہ ضد آپڑی ہے کہ آج شب فراق میں ہمارے بُلانے سے نہیں آئی۔ زندگی بھر ہم کو اس سے یہ شکایت رہے گی۔

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب — اگر نہ کہیئے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیئے

فرماتے ہیں۔ وقت بے وقت جب ہم نے رقیب کو دیکھا ہے کوچۂ یار ہی میں پایا ہے اب ہم کیونکر نہ کہیں کہ کوئے دوست اس کا گھر بن گیا ہے، اندھیرے اُجالے وہیں پڑا ہوا ملتا ہے۔

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہمکو فریب — کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیئے

فرماتے ہیں۔ اس کے ہر انداز ہر ایک ادا سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے دل کے حال سے وہ خبردار اور واقف ہے پھر اس سے حال دل کہنے کی کیا ضرورت باقی رہی۔

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال　　کہ یہ کہے کہ سرِ رہگزر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں۔ وہ اداشناس یہ بات سمجھ لیتا ہے کہ میرزا صاحب اپنی وضعداری کے سبب سے رستے میں مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے جھیپیں گے اور جواب میں فرمائیں گے کہ یہاں بات چیت کرنے کا موقع نہیں ہے۔ سربازار مجھ سے دریافت کرتا ہے فرمائیے آپ کا کیا حال ہے۔

تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال　　ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں۔ تم کو رشتۂ وفا کا مطلق خیال نہیں ہے تم اس کے راز کو بالکل بھولے بیٹھے ہو، بھلا بتاؤ تو ہماری مٹھی میں کیا چیز ہے۔ ندرتِ بیان اور طرفگی خیال اس شعر میں یہ واقع ہوئی ہے کہ غیر محسوس کو محسوس قرار دیا ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ پہلے اس کا نام بھی لے دیا ہے اور باوجود نام لے دینے کے پھر یہ کہتے ہیں ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر تم بتاؤ کیا ہے، تم کو تو رشتۂ وفا کا کچھ خیال ہی نہیں ہے۔

انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے　　ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں۔ وہ شوخ مجھ پر اور میرے سوال پر نظر کرکے یہ سمجھا ہے کہ یہ شخص دیوانہ ہوگیا ہے جو مجھ سے ایسا دور از عقل سوال کرتا ہے اور مجھ کو جواب سے قطع امید ہے۔ میں سوال کے بعد ان سے یہ خواہش ہی نہیں رکھتا کہ مجھے میرے سوال کا جواب عنایت فرمائیے یہ بندشیں اور ترکیب بیان اور بے ساختگی کے ساتھ دونوں مصرعوں کا دولخت ہونا کس کو نصیب ہوتا ہے۔

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے　　ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کمال سخن کے لئے حسد کا پیدا ہوجانا لازمی ہے۔ مجبوری ہے کیا کیا جائے اور متاعِ ہنر کی قیمت ستم روزگار ہے کیا شکایت کی جاسکے۔

دونوں شعر بیت الغزل ہیں۔

کہاہی کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن   سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

کسی کا اشارہ معشوق کی طرف ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس نے یہ ارشاد کیا ہے کہ غالبؔ آدمی بُرا نہیں ہے مگر افسوس یہ ہے کہ دیوانہ ہے اور اس کی نسبت کیا کہا جا سکتا ہے۔

غزل

دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے   کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

یہ شعر تصوف میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں مجرد تھا۔ مجھ کو جسمانیت سے تعلق ہی نہ تھا، مگر سرگرم دامن افشانی دیکھ کر مجھ کو میرے تجرد نے قید جسم میں پھنسا دیا اور خود رخصت ہو گیا۔ عریانی سے مراد یہاں بے تعلقی ہے۔

بن گیا تیغ نگاہِ یار کا سنگِ فساں   مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

فرماتے ہیں۔ میں ایسا سخت جان واقع ہوا ہوں کہ تیغ نگاہِ یار کے زخم کھاتا ہوں اور زندہ ہوں گویا سنگ فساں ہوں کہ اس پر خواہ کتنا ہی تلوار کو آبدار کرنے کے لئے رگڑو، مگر وہ گھٹتا نہیں۔ مصرعہ ثانی میں طنزاً کہتے ہیں کہ میری سخت جانی میری جان کے لئے بہت مبارک ہو گئی ہے کہ اس نے مجھ کو تیغ نگاہِ یار کا سنگ فساں بنا دیا ہے۔

کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے   جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

فرماتے ہیں۔ اس کی طرف سے بے التفاتی کا اظہار کیوں کر نہ ہو۔ اس ظالم کی خاطر جمع ہے۔ یعنی وہ مجھ کو یہ جانتا ہے کہ یہ شخص میرے تصور سے باتیں کیا کرتا ہے اور خیالی پرسشہائے پنہانی سے مست ہو رہا ہے۔

میرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی   لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

فرماتے ہیں۔ روزِ ازل میں کاتبِ تقدیر نے میرے غمخانے کی قسمت رقم کی تھی اس وقت مجھ کو اپنے گھر کی ویرانی کا سبب قرار دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے گھر کی ویرانی میری ہی ذات سے علاقہ رکھتی ہے۔

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے　　اس قدر ذوق نوائے مرغ بستانی مجھے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو خوشنوایان چمن کے زمزمے سُننے کا شوق ہے، اور وہ کافر میرے اس شوق سے بدگماں ہوتا ہے۔ اے کاش مجھ کو یہ شوق نہ ہوتا۔

وائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا　　لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

فرماتے ہیں۔ افسوس ہے قبر میں بھی مجھ کو شورِ قیامت نے جگا دیا۔ میں تو نیند بھر سونے کی غرض سے اور راحت حاصِل کرنے کی غرض سے گور میں گیا تھا۔ بے مثل شعر کہا ہے۔

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے　　تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے (از یادگار غالب) بے نظیر شعر لکھا ہے۔

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ　　پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

فرماتے ہیں۔ ہاں اے نشاطِ فصلِ بہاری تیری کیا بات ہے۔ تیری آمد آمد دیکھ کر پھر مجھ کو سودائے غزلخوانی تازہ ہو گیا ہے۔ یعنی تیری مدد سے سرگرم غزلخوانی ہو گیا ہوں۔

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی　　میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

میرزا یوسف میرزا صاحب کے بڑے بھائی تھے جو عنفوان شباب میں دیوانے ہو گئے تھے۔ یہ مقطع اُن کی صحت یابی کی مبارک باد میں لکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی دوبارہ پانے سے دوسرا یوسف مل گیا ہے۔

غزل

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے　　سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

فارسی محاورہ میں یارب کے معنی خدا سے فریاد کرنے کے ہیں اور سبحۂ زاہد سے ذکرِ خفی مراد ہے فرماتے ہیں مجھ کو شادی میں بھی شور یارب یاد ہے۔ میرا مسکرانا بھی گویا زاہد کا ذکرِ خفی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ میں کسی حال میں یادِ الٰہی سے غافل نہیں رہتا۔

تھا طلسم قفل ابجد خانۂ مکتب مجھے ہے کشادہ خاطر وابستہ در رہن سخن

فرماتے ہیں. جس طرح قفل ابجد حرفوں کے مل جانے سے وا ہو جاتا ہے یعنی جب تک پھر کیوں کو پھرا کر حرفوں سے وہ فقرہ نہ بن جائے جس کی ترتیب قائم ہونے سے قفل کھلتا ہے، قفل کھل نہیں سکتا۔ اسی طرح سخن سے میری طبیعت کھل جاتی ہے۔ یعنی شعر کہتے وقت یا اچھا شعر سننے کے وقت میرا غنچۂ خاطر کھلتا ہے۔

رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے

فرماتے ہیں۔ یارب میں اپنی صحرا نوردی کی داد کس سے چاہوں۔ جب میں قید خانہ میں تھا تو بیاباں گردی کا شوق مجھ کو پریشان رکھتا تھا اور اب صحرا میں آوارہ گرد ہوں تو اہل زنداں پر مجھ کو رشک آتا ہے۔

آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے طبع ہے مشتاق لذتہائے حسرت کیا کروں

فرماتے ہیں. میری طبیعت حسرت و حرماں کی مشتاق ہے یعنی مجھ کو حسرت و حرماں میں لطفِ زندگی حاصل ہوتا ہے۔ میں امید اسی غرض سے کرتا ہوں کہ وہ ٹوٹ جائے اور مجھکو لذتِ حرماں حسب دلخواہ حاصل ہو جائے۔

عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے

فرماتے ہیں۔ دل لگا کر غالبؔ بھی مجھی جیسے عاشق بن گئے کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ میرزا صاحب آپ تو مجھے ترکِ عشق کی نصیحتیں کیا کرتے تھے، آپ نے کیوں دامِ عشق کا پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا۔ یہاں (آپ) کا لفظ خطاب کے لئے نہیں ہے۔

غزل

چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے حضور شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کے دربار میں شاعروں کا امتحان ہو رہا ہے اور یہ ایسی بات۔ ہے گویا باغ میں خوشنوایانِ چمن کا امتحان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دربار کے تمام و کمال شعرا نغز گو ہیں، ان کا

امتحان ایسا ہی امتحان ہے جیسا باغ میں خوش الحان جانوروں کا۔ جس مشاعرہ میں میرزا صاحب نے یہ غزل پڑھی تھی بادشاہ رونق افروز تھے۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ مجنوں اور کوہکن کے لئے جو مصیبتیں تھیں وہ صرف لیلیٰ و شیریں کے قد و گیسو ہی تک محدود تھیں لیکن ہم کو ایسے ظالم سے پالا پڑا ہے جو عشق قامت کی سزا میں دار پر کھینچتا ہے اور سودائے زلف کی سزا پھانسی تجویز کرتا ہے۔

کریں گے کوہکن کے حوصلہ کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ ابھی تو صرف کوہکن کی طاقت دست و بازو کا امتحان لیا جا رہا ہے کہ اس کو جوئے شیر نکالنے اور کوہ بے ستون کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صبر و ضبط کی طاقت آزمائی کا امتحان تو اُس وقت ہو گا جب ایک پیر زن مرگِ شیریں کی دلخراش خبر لے کر اس عاشق نامراد کے پاس پہنچے گی اور وہ کم حوصلہ تیشے سے سر پھوڑ کر مر جائے گا۔ گویا کوہکن پر طعن ہے کہ وہ کم حوصلہ جان دے کر میدان عشق سے بھاگ نکلا۔

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ نسیم مصر کو پیر کنعاں یعنی حضرت یعقوبؑ کی کچھ ہوا خواہی نہیں ہے۔ اسے تو حضرت یوسفؑ کی خوشبوئے پیرہن کا امتحان منظور ہے۔ وہ مصر سے کنعاں کی طرف اس خوشبو کو دیکھنے چلی ہے کہ یہ خوشبو ہوا میں پھیل کر کتنی دُور تک قائم رہ سکتی ہے اور کیا اثر پیدا کرتی ہے۔

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبر اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ صبر و شکیب لوٹ لے جانے والا معشوق وہ سامنے بزم کے اندر آ گیا ہے، دیکھو خبردار ہو جاؤ پھر یہ عذر کرنا کہ ہم غافل تھے۔ غفلت کی حالت میں ہم پر اس کا وار چل گیا اور یہ بھی ظاہر کئے دیتے ہیں کہ اسے صبر و قرار اہلِ بزم کا امتحان منظور ہے، اِس لئے اس نے یہاں قدم رنجہ فرمایا ہے حُسنِ بیان اور بندشِ الفاظ تعریف سے مستغنی ہے۔

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر — غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں. تیر خواہ دل میں رہ جائے، خواہ دل و جگر کو توڑ کر سینہ سے پار ہو جائے دونوں صورتوں میں غرض یہ ہے کہ بتِ ناوک فگن کا نشانہ دیکھا جائے کہ وہ قادر انداز ہے یا نہیں۔ امادے گے [illegible] اس کا تیر نشانہ پر بیٹھا یا خطا کر کے آنگا۔ بیان کی خوبی کا کیا پوچھنا ہے۔

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی — وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں. سبحہ و زنار کے پھندوں میں جو شیخ و برہمن گزرتے ہیں اس میں سبحہ و زنار کے پھندوں کی مضبوطی نہ دیکھو بلکہ یہ امتحان کرو کہ میدان وفاداری میں ان دونوں میں سے کون سا شخص پورا اُترتا ہے۔ یعنی زندگی بھر پابندی کے ساتھ اس وضع کو کون نباہتا ہے۔ شیخ یا برہمن۔

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل — مگر پھر تابِ زُلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ اے دل اسی طرح بندھا ہوا پڑا رہ، تڑپ نہیں۔ اگر تو تڑپے پھڑکے گا تو زلف کے پھندے اور زیادہ کس جائیں گے، تو بیتابی سے زلف پرشکن کے پھندوں کا کیا امتحان لیتا ہے۔ بھلا تیری بیتابی سے کہیں وہ کھلنے والے ہیں۔

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو — ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ زہر عشق رگ و پے میں جس وقت سرایت کرے وہ انجام دیکھنے کے قابل ہوگا ابھی تو آغاز عشق ہے صرف اس کی تلخی سے منہ کا مزہ کڑوا ہو گیا ہے۔ کام و دہن کا امتحان ہو رہا ہے انجام بہت سخت ہونے والا ہے۔

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ — نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ وہ میرے گھر آئیں گے نہیں۔ قیامت تک نہ آئیں گے۔ اے غالبؔ ان کو اپنے وعدہ کا کب خیال ہے وہ تو اس کو بھول بھی گئے ہوں گے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آسمان کس کس نئی نئی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے، یعنی ان کی وعدہ خلافی سے اور نہ آنے سے یہ دیکھنا ہے کہ آسمان ہم پر ان کی جدائی میں کیا مصیبت توڑتا ہے۔

غزل

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے   جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں، اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اس کی کیا تلافی ہو سکتی ہے، نیکی نہیں کر سکتا۔ (از یادگار غالب)

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے   کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں۔ الٰہی کیا میرے جذب دل میں اُلٹا اثر پیدا کر دیا ہے کہ جس قدر میں اس کو اپنے جذب دل سے کھینچتا ہوں اسی قدر وہ مجھ سے آزردہ خاطر اور برہم مزاج ہوتا جاتا ہے۔

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی   عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں، مجھ کو دو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ شوخ بہت بدخو اور بد مزاج ہے دوسرے یہ کہ میری داستانِ عشق اس قدر طولانی ہے کہ کسی طرح ختم ہونے ہی نہیں آتی، قصہ مختصر یہ ہے کہ قاصد بھی میرے پیام سنتے سنتے گھبرا جاتا ہے تو پھر بھلا معشوق بدخو اتنی لمبی چوڑی داستان سُننی کب گوارہ کرے گا۔

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے   نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں۔ وہ تو میری جانب سے ایسا بدگمان ہے کہ اس کو کسی طرح میری محبت کا یقین ہی نہیں آتا جب میں اس سے کہتا ہوں، وہ کہہ دیتا ہے تو جھوٹا ہے اور میں اس قدر ناتوان ہو گیا ہوں کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ وہ بدگمانی کی حالت میں میرا حال مجھ سے کیوں پوچھے اور میں ناتوانی کی صورت میں اپنی مصیبتیں کیونکر اس سے مفصل بیان کر سکوں، ندرت بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی کیا قیامت ہے   کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں۔ اے نا اُمیدی کیوں مجھ کو گرائے دیتی ہے، ذرا تو سنبھلنے دے دیکھ دامن خیال یار میرے ہاتھ سے اب چھوٹ جائے گا مطلب یہ ہے نا اُمیدی کی وجہ سے اس کا خیال دل سے نکلا جاتا ہے،

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن   وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں۔ یہ میں نے مانا کہ اس کے دیکھنے والوں میں بھی شامل ہوں۔ مگر یہ ظلم مجھ سے کبھی دیکھا جائے گا کہ اس کو لوگ دیکھیں۔ بھلا یہ رشک مجھ سے کیونکر گوارہ ہو سکتا ہے۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی   نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قوی جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی۔ ابتدائے عشق میں انھیں کو صدمہ پہنچا۔ بس نہ اب عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے (از یادگار غالب)

قیامت ہے، کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب   وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں۔ قیامت کی بات ہے کہ اس کافر کو رخصت کرنے کے وقت میں یہ کہوں کہ جاؤ خدا کو سونپا خدا حافظ۔ تم کو خدا کی حفظ و امان میں دیا۔ بھلا یہ رشک تو مجھ سے گوارہ ہی نہیں ہوتا۔ پھر یہ ستم دیکھو کہ وہ مدعی کا ہمسفر ہو۔

غزل

زبسکہ عشقِ تماشا جنوں علامت ہے،   کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

فرماتے ہیں۔ اس دنیا کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھنا ایک دیوانگی کی علامت ہے۔ تماشہ دیکھنے کی حالت میں آنکھوں کا کھلنا اور جھکنا گویا ندامت کے طمانچے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیائے ناپائدار اس قابل نہیں ہے کہ کوئی اہلِ دل اس کا تماشائی بن کر اپنا وقت ضائع کرے اور انجام کار نادم و خجل ہو۔

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعن بد عہدی   تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے،

فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں تیری بد عہدی کے دھبے کس پانی سے چھوٹیں گے۔ تیرے واسطے تو اب آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے یعنی تو دیکھ کر غیروں کے دکھانے کو بناؤ سنگھار کیا کرتا ہے جو حقیقتاً بد عہدی میں داخل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے ساتھ جو جھوٹے وعدے کئے جاتے ہیں وہ بھی غیروں سے وفا ہوتے ہیں۔

یہ پیچ و تاب ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

فرماتے ہیں۔ ہوس کے پیچ و تاب میں پھنس کر سلکِ عافیت کو نہ توڑ۔ اگر سلکِ عافیت ٹوٹ جائیگی تو پھر عافیت کا کہیں پتہ بھی نہ ملے گا۔ نگاہِ عجز یعنی ترک ہوا و ہوس ایک سر رشتہ ہے، سلامتی کا مطلب یہ ہے کہ ہوس رانی سے دونوں جہان کی راحت و آسائش برباد ہو جاتی ہے۔

وفا مقابل و دعویٔ عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

اِس شعر میں رقیب بوالہوس پر طعن کی ہے۔ فرماتے ہیں معشوق وفادار تو وفا کرنے پر آمادہ ہو اور عشق کا دعویٰ جھوٹا کیا جائے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے سچ مچ موسم بہار آگیا ہو اور جنون بناوٹی ہو اِس سے زیادہ شرمناک اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

غزل

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ تو رقیب کے خوف سے مجھ سے ملنا کیوں ترک کرتا ہے، میں تو اس قدر لاغر ہو گیا ہوں کہ اگر تو مجھے اپنی محفل میں بلائے اور اپنے پاس بٹھائے تو میں کسی کو نظر بھی نہ آؤں۔

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ میرا حال ایسا زار و نزار ہو گیا ہے کہ اگر ان کے کوچہ تک کوئی شخص سہارا دے کر مجھ کو پہنچا دے اور ان سے میرا سامنا ہو جائے تو عجب نہیں کہ آنکھ ملتے ہی ان کو بھی مجھ پر رحم آجائے۔

مُنہ نہ دکھلائے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ اگر تو مجھ سے حجاب کرتا ہے۔ سامنے ہونے اور منہ دکھانے میں شرماتا ہے تو منہ نہ دکھا لیکن غصہ کے انداز سے پردہ ہٹا کر آنکھیں تو مجھے دکھا دے (آنکھ دکھانا خفا ہونے کے موقع پر بولا جاتا ہے) میں دیکھوں تو سہی تیری آنکھوں میں کس قدر غصہ ہے اور غصہ کی حالت میں تیری آنکھ کا کیا رنگ ہوتا ہے۔

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے

فرماتے ہیں میں اس قدر وہ میری گرفتاری سے خوش ہوتا ہے کہ اگر بالفرض محال میں اس کی زلف بن جاؤں جو گرفتاری کا ایک آلہ ہے تو اس زلف کو بھی وہ شانہ میں الجھا دے اور گرفتار کر دے۔

غزل

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ دنیا میری نگاہ میں ایک بازیچۂ اطفال ہے۔ ان دنیا کے حادثوں کا مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوتا رات دن یہ واقعات دیکھتا ہوں اور ان کو ایک بھان متی کا تماشا جانتا ہوں، بے مثل مطلع لکھا ہے۔

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ میں اللہ تعالےٰ کی قدرت کاملہ کا دیکھنے والا ہوں۔ تختِ سلیمان میرے نزدیک ایک کھیل ہے۔ یعنی ایک معمولی شے ہے اور اعجاز مسیحا میری نگاہ میں ایک معمولی درجہ کی بات ہے، بات کے لفظ نے اعجاز مسیحا کے مقابلہ میں عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔

جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جُز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

اس شعر میں فلسفہ اور تصوف کا ایک عجیب مسئلہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ عالم کا نام ہی نام ہے اس کی صورت نظر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہستیِ اشیا میرے روبرو سوائے وہم کے اور کچھ نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا میں کسی شے کو موجود نہیں سمجھتا۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ میں دیوانگی کے عالم میں اس قدر خاک اُڑاتا ہوں کہ جنگل گرد میں پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ اور آنکھوں سے اس قدر اشک بہاتا ہوں کہ دریا میرے آگے بہہ نکلتا ہے۔ پانی کے زور کو جبین رگڑنے سے تعبیر کیا ہے۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ مجھ سے یہ نہ پوچھ کہ تیری جدائی میں میرا کیا حال ہوتا ہے۔ بلکہ تو یہ دیکھ کہ تیرا میرے روبرو کیا رنگ ہے۔ یعنی تو میرے سامنے آ کر کس قدر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی

حال میرا تیرے ہجر میں ہو جاتا ہے۔

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں — بیٹھا ہے بُتِ آئینہ سیما مرے آگے

فرماتے ہیں۔ یہ تو سچ کہتے ہو کہ میں خود بین و خود آرا ہوں، لیکن جب تم سا آئینہ جبیں میرے آگے بیٹھا ہو تو میں کیوں نہ خود بینی و خود آرائی کروں۔

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ پھر دیکھئے میری زبان سے کیسے پھول جھڑتے ہیں۔ میرے آگے ایک گلاس اور شیشہ شراب کا بھر کر کوئی رکھ دے۔ سنا گیا ہے کہ میرزا صاحب شام کے وقت پیا کرتے تھے اور شب کو سرخوشی کے عالم میں عجب پُر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص معشوق کا نام میرے سامنے لیتا ہے تو میں بوجہ رشک کے بے لطف ہو جاتا ہوں۔ لوگ اس کو نفرت پر محمول کرتے ہیں۔ اِس سے بہتر ہے کہ میں رشک کرنا چھوڑ دوں۔ یہ تو کسی سے کہہ نہیں سکتا کہ اس کا نام میرے آگے نہ لو۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ ایمان مجھ کو روکتا ہے۔ یعنی کعبہ میری پشت کی جانب ہے۔ جب آگے قدم بڑھاتا ہوں تو کعبہ کی طرف سے کشش پیدا ہوتی ہے اور کفر مجھ کو کھینچتا ہے یعنی گرجا میرے مُنہ کے سامنے ہے اور وہ کھینچ رہا ہے کہ اِدھر چلا آ۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

فرماتے ہیں۔ ہوں تو میں عاشق، مگر معشوق فریب عاشق ہوں یعنی ساری دنیا کے معشوق مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ لیلےٰ میرے مقابلہ میں مجنوں کو بُرا کہتی ہے اور میری تعریف کرتی ہے۔

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے — آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ سب عاشق وصل میں خوش ہوا کرتے ہیں مگر شادی مرگ نہیں ہو جاتے معلوم ایسا

ہوتا ہے کہ شبِ فراق میں جو میں نے مرنے کی تمنا اور آرزو کی تھی وہ وصل میں میرے سامنے آئی۔ یہ شعر مرزا کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔

ہے موجزن اِک قلزمِ خوں کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ یہ جو اک اشکِ خونی کا دریا میری آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ کاش ایسا ہو کہ اسی مصیبت پر خاتمہ ہو جائے، مگر نہیں۔ دیکھئے ابھی کیا کیا آفتیں اور مصیبتیں میرے آگے آتی ہیں۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ شعر بھی میرزا کے مشہور نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔ فرماتے ہیں۔ اگرچہ اب ہاتھ حرکت نہیں کرتا اور جام اٹھا کر منہ سے لگانے کی طاقت باقی نہیں رہی ہے لیکن ابھی تک آنکھوں میں جان باقی ہے۔ شیشہ و ساغر کو ابھی میرے آگے سے نہ اُٹھاؤ۔ میں دیکھ ہی کر مست ہو رہا ہوں۔

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا — غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ غالب میری طرح سے عاشق بھی ہے اور میرا ہم مذہب بھی ہے اور رازدار بھی ہے تم اس کو بُرا کیوں کہتے ہو مطلب یہ ہے کہ معشوق ابھی حضرتِ غالب کو پہچانتا نہیں ہے، خود بدولت ہی اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ عجب پُرلطف مقطع لکھا ہے۔

غزل

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے — تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

فرماتے ہیں۔ میں اگر اپنا حال بیتابیِ شوق کہتا ہوں تو تم کہہ دیتے ہو کہ مدعا کہئے۔ حالانکہ تم میرے مدعائے دل سے بخوبی واقف و آگاہ ہو اور پھر تجاہلِ عارفانہ کرتے ہو۔ اب میں تم ہی سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے اس پوچھنے کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیئے۔

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں — مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

فرماتے ہیں۔ تم میری عادت سے بخوبی آگاہ ہو کہ میری یہ عادت ہے کہ تمہاری ہر بات پر میں درست اور بجا کہہ دیا کرتا ہوں۔ پھر تم نے طعن سے کیوں کہا کہ ہم ستمگر ہیں۔ عادت کے موافق میری زبان

سے نکل گیا کہ بجا درست ارشاد ہوا۔ اب مجھ سے بے وجہ آزردہ کیوں ہوتے ہو، پھر کبھی طنزاً اپنے کو ستمگر نہ کہنا ورنہ میں تو پھر بھی بغیر سوچے سمجھے، بجا کہدوں گا۔

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے　　نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

فرماتے ہیں۔ یہ ہم نے مان لیا کہ نگاہِ ناز بھی نشتر ہے۔ مگر جب دل میں اُتر جائے یعنی دلنشیں ہو جائے اور دل اس کو قبول کرلے، پھر نگاہِ ناز کے آشنا کہنے میں کیا تردد ہے۔

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں　　وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

فرماتے ہیں۔ زخم پیکاں یتر انشراح خاطر کا سبب نہیں ہو سکتا۔ جس زخم کو دلکشا کہنا چاہیئے وہ تلوار کا زخم دامن دار ہے، اس سے دل بشاش ہو جاتا ہے۔

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنئے　　جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے

فرماتے ہیں۔ دشمنی کے مقابلہ میں دشمنی کرنی حُسن اخلاق سے بعید اور اہلِ ظرف کا کام نہیں ہے اگر کوئی شخص تم کو بُرا کہے تو تم اس کے جواب میں اس کو برا نہ کہو۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے بہتر ہے تم دشمنی کے مقابلہ میں احسان کرو۔

کہیں حقیقتِ جانکاہئِ مرض لکھیے　　کہیں مصیبتِ ناسازئِ دوا کہیے

فرماتے ہیں۔ کہیں تو جانکاہئِ مرضِ عشق کی حقیقت لکھئے، یعنی فراق و ہجر میں دل پر جو کچھ صدمے گزرتے ہیں اس کی مفصل حالت اور کہیں ناسازئِ دوا کی مصیبت بیان کیجئے یعنی وصل بھی دردِ عشق کے لئے ناموافق دوا ثابت ہوتی ہے، یعنی معشوق سے تکرار۔ شوق کی بیتابیاں سحر وصل کا کھٹکا رشکِ رقیب کی خلش یہ سب باتیں وصل میں بے چین رکھنے والی ہیں۔

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجئے　　کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

فرماتے ہیں۔ ہماری عمر اسی غم و آلام میں گزر رہی ہے۔ کبھی مصائبِ ہجر کا دکھڑا رونے بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی صبر گریز پا کی شکایتیں زبان پر آتی ہیں، سننے والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ دشمن ہنستے ہیں۔ احباب طعنہ زنی کرتے ہیں۔ ایک محبت کے ساتھ ہزار ایذائیں ہیں۔

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے — کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

فرماتے ہیں۔ محبت میں دست تہ سنگ آمد و پیمان وفا کا معاملہ ہے۔ جان نکلتے وقت قاتل کو خونبہا معاف کر دینا چاہیئے اور زبان کٹ جائے تو خنجر کی مدحت سرائی کرنی چاہیئے۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے — روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے

فرماتے ہیں۔ معشوق کی عیب جوئی کرنی مذہب عشق میں گناہ عظیم ہے۔ اگر اس کو محبت نہیں ہے نہ ہو لیکن معشوق تو ہے اس کی خوبیاں بیان کرنی چاہئیں۔ اس کے ناز و انداز و ادا و حُسن کی تعریف بیان کرنی مناسب و اولیٰ ہے۔

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے — طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

فرماتے ہیں۔ بہار کو فرصتِ قیام نہیں ہے نہ ہو۔ مگر پھر بھی موسم بہار تو ہے۔ یہ شکایت چھوڑ کر طراوت چمن کی تعریف اور ٹھنڈی ہوا کی مسرت و خوشگواری بیان کرنی چاہیئے۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

فرماتے ہیں اے غالب مصیبت اور تکلیف کا وقت گزر جانے کے بعد اس کو بھول جانا چاہیئے دل میں گرہ نہ باندھنی چاہیئے بلکہ پھر کسی سے شکایت بھی نہ کرنی چاہیئے۔ لقمان نے چار باتوں پر حکمت و اخلاق کا حصر رکھا ہے ان میں سے دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں اور دو باتیں بھول جانے کی۔ موت کا آنا اور خدا کا حاضر و ناظر جاننا۔ یہ دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں۔ اور کسی شخص پر احسان کر کے اور کسی شخص کی بُرائی برداشت کر کے یہ دو باتیں بھول جانی چاہئیں۔

غزل

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا۔ بے شرم و بیباک۔ پاک، آزاد یا شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ

ردنے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے۔ بلاغت اور حُسن بیان کی انتہا ہے (از یادگار غالب)

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی　　تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ ظروفِ مے کی ایک فہرست بنا رکھی تھی۔ ہر روز پڑتال کرنی پڑتی تھی۔ برتنوں کا گِنتا سنبھالنا قیمتی سامان کا قفل میں بند کرنا۔ ان کی حفاظت کرنی۔ غرض یہ کہ جان غضب میں آگئی تھی۔ اکثر گلاس چاندی سونے کے تھے۔ ان سب کو بیچ کر ان کے داموں کی شراب نوش فرمالی نہ کلال کے قرضدار رہے نہ برتنوں کی حفاظت اور ان کے لکھنے پڑھنے کا جھگڑا باقی رہا۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم　　بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ آوارگی کے سبب سے تم زمانہ بھر میں بدنام و رسوا ہو گئے لیکن پھر بھی اتنا فائدہ حاصل ہوا کہ شوخ طبیعت اور حاضر جواب بن گئے۔ طبیعتوں کا چالاک ہونا محاورہ ہے۔ جمع و مفرد دونوں طرح سے بولا جاتا ہے۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر　　پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ نالۂ بلبل کو بے اثر کون کہتا ہے، وہ کہنے والا ہمارے سامنے تو آئے۔ گُل کے لباس میں لاکھوں جگر چاک ہو گئے۔ پھولوں کے کھلنے کو جگر چاک ہونے سے تعبیر کیا ہے، غرض یہ ہے کہ عاشق کی فریاد میں اثر کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا　　آپ اپنی آگ سے خس و خاشاک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ اہلِ شوق کا وجود و عدم یکساں ہے اپنی آتشِ شوق میں خود ہی گھاس پھوس کی طرح سے جل گئے۔ اہلِ شوق سے یہاں عاشقانِ الٰہی مراد ہیں جو شب و روز کسب فنا فی اللہ میں مصروف رہ کر اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں۔

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گِلہ　　کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہدِ حقیقی کا جو معاملہ عشاق کے ساتھ ہے اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملہ کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے:۔

۵ اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ — دور تو و بنزدیک ترا حال تباہ
کس نیست کہ جان از تو سلامت ببرد — آں را بہ تغافل کشی ایں را بہ نگاہ

پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اسکی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے۔ جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔ (از یادگار غالب)

اِس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش — دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ اس نے خلاف توقع اس توقیر و عزت کے ساتھ میرزا اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ کی میت اُٹھائی کہ جس کو دیکھ کر دشمنوں کے کلیجے میں رشک کی آگ بھڑک اُٹھی۔

غزل

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب — شیشہ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

فرماتے ہیں نشے راگ رنگ سے شاداب ہو گئے ہیں۔ اور ساز نشہ طرب سے سرشار نظر آتے ہیں۔ یعنی شراب نے نغمہ میں اور نغمہ نے شراب میں اس درجہ سرایت کر لی ہے کہ مینائے شراب سرو جوئبار نغمہ بن گیا ہے۔

ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست — واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

فرماتے ہیں۔ اے ہمنشیں تو مجھے نالہ کرنے سے کیوں روکتا ہے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اس کی صحبتِ عیش کو میرا نالہ درہم برہم کر دے گا۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ میرا نالہ تو اس کی محفل میں پہنچ کر نغمہ کا کام دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ میرے نالہ کو سُن کر اور خوش ہوتا ہے۔ میری فریاد سے اس کا عیش کیوں منغص ہو گا۔

غزل

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے — دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

فرماتے ہیں۔ دانتوں کو اپنی شوخی و خوبی پر جس قدر ناز ہے اس کا اظہار کرنا صرف ہنسی کے واسطے ہوا کرتا ہے۔ یعنی ہنسنے کے وقت دانت نظر آ جاتے ہیں۔ احباب کی جمعیت و اتفاق کا دعویٰ کرنا

اور اُس پر بھروسہ کرنا ہنسی کے قابل بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح بڑھاپے میں دانت ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اسی طرح دوستوں میں بھی جُدائی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل — یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

فرماتے ہیں۔ غنچہ کھل جانے کے بعد معدوم ہو گیا ہے، یعنی گُل بن گیا ہے اور گل بن کر اس سوچ میں مبتلا ہو گیا کہ دیکھئے گل بن جانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لیکن اس فکر و تامل کی مقدار مہلت زانو بدلنے تک کی مدت ہے۔ یعنی فکر اور سوچ کے وقت انسان سر بہ زانو ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں تھک جانے کے بعد زانو بدل لیتا ہے۔ یا سر کو زانو پر سے اٹھا لیتا ہے۔ گویا اتنی سی دیر میں پھول کو اپنا انجام نظر آ جاتا ہے اور وہ کُملا جاتا ہے یا جھڑ جاتا ہے۔

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام — ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

فرماتے ہیں۔ افسردگی دل کے وقت بیتاب و بے صبر ہو جانا حرام ہے ورنہ بیتاب ہو کر دل کو دانتوں سے چبا ڈالنا۔ افسردگی اور انقباض کو فوراً مٹا سکتا ہے۔ یعنی جب دل کو زخمی کر دیا تو زخم خندہ اس سے حاصل ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ افسردگی خاطر ایسی مصیبت ہے کہ جس کے مقابلہ میں بیتابی و بے صبری گویا عیش کا حکم رکھتی ہے۔

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں — دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

فرماتے ہیں۔ ہمارے احباب ہماری سوزش باطن یعنی خضوع و خشوع کے منکر ہیں ورنہ ہمارا دل درد و سوز سے بھرا ہوا ہے اور ہمارے لب آشنائے خندہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر میں زندانہ حالت رکھتے ہیں۔ اور باطن میں صاحب وجد و حال ہیں

غزل

حُسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے — آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ حُسن بے نیاز اور بے پروا ہے لیکن پھر بھی اس کو ظاہری آرائش اور جلوہ گری کی خواہش و آرزو رہتی ہے اور آئینہ اس کے واسطے زانوئے فکر کا کام دیتا ہے۔ یعنی آرائش حُسن میں

نئے نئے ایجاد کرنے کی فکر آئینہ ہی دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔ فکر کے وقت سر بہ زانو ہو جانا عادت میں داخل ہو گیا ہے۔

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن   چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

فارسی میں رنگ باختن اور رنگ شکستن رنگ بدلنے کے معنی پر استعمال ہوتا ہے اور یہاں تماشا سے مراد تماشائے عالم ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے آگاہی تو کب تک رنگ تماشا کو بدلتی رہیگی اور کس وقت تک تماشائے عالم کی موجودہ کیفیت میں مشغول و محو رہیگی۔ کھلی ہوئی آنکھ یعنی چشم تماشائی جلوہ کے رخصت کرنے کے لئے گویا آغوش وداع ہے۔ یعنی عالم بے ثبات پر چشم تماشا واکرنا گویا اس کے رخصت کرنے کے لئے آغوش کشائی ہے۔

غزل

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی   مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن واکرے کوئی

صوفیا کی اصطلاح میں محادثت اور مسافرت (یعنی عبد و معبود کے درمیان گفتگو ہونی، دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ شاہد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے لئے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہیئے، جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو، یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر   کب تک خیالِ طرۂ لیلےٰ کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ہستیٔ عالم ایک نمائش سراب ہے کب تک دھوکہ میں پڑ کر اس کو موج دریا سمجھتے رہیں گے۔

افسردگی نہیں طرب افزائے التفات   ہاں دردبن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ افسردہ خاطری ایسی چیز نہیں ہے جس کو دیکھ کر معشوق اپنے عاشق پر نظر التفات ڈال کر خوشی پیدا کر دے۔ البتہ عاشق کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ سراپا درد بن جائے، اسوقت معشوق ملتفت ہوسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کی افسردہ خاطری دیکھ کر معشوق یہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص بوالہوس ہے جو عشق کی سختی سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اس خیال سے وہ بھی بے پرواہی

اور کم توجہی ظاہر کرتا ہے۔ ہاں سراپا درد بن کر معشوق کے سامنے اگر عاشق پیش ہو تو معشوق اسکو نظرِ التفات سے دیکھے۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے　　آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اے ندیم مجھ کو دل کھول کر رونے سے نہ روک اور برا بھلا نہ کہہ، انصاف شرط ہے کبھی تو دل کی گرہ کھلنی چاہیئے۔

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی　　کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ عشق میں ہم نے اپنے جگر کو اس لئے چاک کیا تھا کہ وہ ہمارا حال دیکھ کر ہمارے حال کی پرسش فرماتے۔ یہ بات نہ ہوئی۔ اب گریباں پھاڑ کر اپنے کو رسوا اور بدنام کرنے سے کیا فائدہ ہے۔

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل　　تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ صحرا نوردی کے عالم میں میرے جگر کے ٹکڑے، جو آنسوؤں میں میری آنکھوں سے ٹپکے اور ان سے جنگل کا ایک ایک کانٹا شاخ گل بن گیا۔ اب صحرا کی بہار میں اور کونسی بات باقی رہی جو کوئی باغبان بن کر جنگل کی آراستگی بڑھاتا رہے۔

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز　　تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ طور پر جس صاعقہ نے گر کر نگاہ میں خیرگی پیدا کر دی تھی وہ تیرا جلوہ نہ تھا بلکہ ہماری ناکامیِ نگاہ برق بن کر طور پر گری تھی۔ تو اور تیرا جلوہ ایسا نہیں ہے کہ کسی مشتاق جمال کے دیکھنے میں آسکے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ موسیٰ نے تیرا جلوہ دیکھا نہ اور کوئی تجھ کو دیکھ سکتا ہے۔

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست　　نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ لڑکے جو ڈھیلے اور پتھر سر پر مارتے ہیں۔ وہ گویا ایک صدف ہے جس کا موتی زخم سر سمجھا جاتا ہے۔ اس سلئے جنوں کا سودا اپنے سر لینے میں کسی قسم کا نقصان واقع نہیں ہوتا۔

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر　　فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گزر گئی، پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کی جاتی

(از یادگارِ غالب)

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز — یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ معنی آفرینی اور اخلاقی مضامین اور ایجاد ندرت بیان اور اختراع بندشِ الفاظ کچھ ایسا وحشی فن ہے جس سے ہمیشہ یاس پیدا ہوتی ہے۔ بایں ہمہ سب لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ گویا یہ درد ایسا نہیں ہے کہ اس کو کوئی پیدا نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعری ایک بہت دشوار کام ہے لیکن اس میں مزا بھی ایسا ہے کہ ہر شخص اس کی طرف رغبت رکھتا ہے۔

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ جنون کے لئے ایک نہ ایک شغل لازمی اور ضروری ہے۔ جب تک جسم پر لباس رہا گریباں چاک کرتے رہے۔ جب تار تار جُدا ہو گئے سر پیٹنے کا شغل مل گیا بیکار بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا گئی۔ دامن و گریباں کی دھجیاں اُڑ چکیں۔ شغل کے لئے سر پیٹنا شروع کر دیا۔ اب دیکھنے کی یہ بات ہے کہ اگر ہاتھ بھی ٹوٹ جائیں تو کوئی کیا کرے۔

حُسن فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ پہلے شمع کی طرح دلِ گداختہ کوئی پیدا کرلے تو اس کے بعد فروغ شعلہ سخن کی تمنا اور آرزو کرلے۔

غزل

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے زمانے کا مسیحا ہے تو میری بلا سے ہوا کرے۔ میں تو جب اس کا قائل ہوں کہ میرے دردِ محبت کی کوئی دوا کرے۔

شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ہم نے یہ مانا کہ آج کل زمانہ میں شرع کی پابندی بھی ہے اور قانون گورنمنٹ بھی

جاری ہے جس کے ذریعہ سے قاتل کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ مگر ایسے قاتل کا کوئی کیا کر سکتا ہے جو بغیر تلوار کے عشاق کو قتل کر دیتا ہے، یعنی تیغ نگاہ یا تیر نظر سے۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ایسے معشوق کے دل میں جگہ پیدا نہیں کی جا سکتی جس کی بے اعتنائی کی چال کڑی کمان کے تیر سے مشابہت رکھتی ہے۔ مصرعہ اولی تمام کمال محاورہ ہے۔ کمان جس قدر سخت ہو گی اتنا ہی تیر تیز پرواز ہو گا۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ان کے خلاف اگر کچھ کہا جاتا ہے تو اس جرم میں وہ زبان کاٹ لیتے ہیں اس لئے ان کی بات خواہ درست ہو یا نادرست خاموشی کے ساتھ سننی پڑتی ہے، یہ کسی کی طاقت نہیں ہے کہ ان سے یہ کہہ سکے کہ تم یہ بات غلط کہتے ہو۔ بے مثل شعر کہا ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ جوشش کے عالم میں بڑے بڑے راز بیان کر رہا ہوں۔ خدا کرے میرے کہنے کو کوئی سمجھے نہیں۔ جس طرح مجذوب اپنی بڑ میں بہت سی کام کی باتیں بیان کر جاتے ہیں اور عام لوگ ان باتوں سے کچھ مطلب نہیں نکال سکتے۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اخلاق کی یہ خوبی ہے کہ اگر کوئی شخص تم کو برا بھلا کہے تو اس کے کہنے پر توجہ نہ کرو اور اگر کوئی برا کام کرے تو تم اس کو مطعون خلایق نہ کرو۔

روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص غلط رستے پر چل رہا ہو تو تم اسے فوراً روک دو اور اس کی غلطی اس کے ذہن نشیں کر دو۔ اور اگر کوئی شخص تمہاری کچھ خطا کرے تو تم فوراً اسے بخش دو۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ زمانے میں ہر شخص حاجت مند ہے۔ اگر وقت پر کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے تو اس سے گلہ مند نہ ہونا چاہیئے بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ دوسرا بھی ہماری طرح سے کوئی ضرورت رکھتا ہوگا۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　　اب کسے رہنما کرے کوئی

اِس شعر میں خضر و سکندر کے مشہور قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ حضرتِ خضر سکندر کو چشمۂ آبِ حیوان پر لے گئے تھے۔ سکندر نے یہ دیکھ کر کہ چشمہ کے گرد بہت سے آدمی چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے سے معذور مثلِ گوشت کی طرح زمین پر پڑے ہوئے تھے، آبِ حیات نہ پیا۔ فرماتے ہیں۔ حضرت خضر نے سکندر کی کیا مدد کی۔ باوجود رہنمائی کے سکندر آبِ حیات سے محروم واپس آگیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دنیا سے چل بسا۔ اب کوئی کسی کو کیا رہنما بنائے۔

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ　　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ توقع کی صورت میں گلہ شکوہ بھی اے غالبؔ زیبا ہے، مایوسی کی حالت میں کیوں کسی کا گلہ کیا جائے۔

غزل

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے　　　غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ یہ میں نے مانا کہ دنیا میں غم و رنج بہت ہیں مگر غم کے مقابلہ میں شراب بھی مقدار میں کم نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم دنیا بھلانے والی چیز شراب ہے اور میں چونکہ ساقیِ کوثر کا غلام ہوں اِس لئے مجھ کو شراب کے حاصل کرنے کی فکر نہیں ہے، ابدالآباد تک برابر ملے جائے گی۔ یہاں بھی پیتا رہا اور وہاں بھی پیتا رہوں گا۔

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے　　　تمہاری طرزِ روش جانتے ہیں ہم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ تمہاری عادت سے ہم خوب آگاہ ہیں کہ تم رشک کی آگ عاشق کے دل میں بھڑکا دیا کرتے ہو۔ رقیب پر تمہارا لطف کرنا ہمارے لئے ستم کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی یہ لطف جو تم رقیب کے حق میں برتتے ہو وہ ہمارے واسطے ستم بن جاتا ہے۔

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بہ خم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ تمہاری زلف خم بہ خم کی یہ دونوں صفتیں ہیں۔ یعنی درازی میں وہ شبِ فرقت کے برابر ہے اور اس کی محبت ایسی زہریلی ہے کہ اس میں سانپ کے کاٹنے کا اثر ہے۔ اب کون بتا سکتا ہے کہ وہ درحقیقت ہے کیا چیز۔

لکھا کرے کوئی احکام طالعِ مولود کسے خبر ہے کہ واں جنبش قلم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ یہ جو اہلِ تنجیم بچّہ کی پیدائش کے وقت اس کا زائچہ بنا کر احکام لکھتے ہیں یہ بے فائدہ ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ کاتبِ قسمت نے اس کی تقدیر میں کیا لکھ دیا ہے۔

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملّت کا خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ وہ کافر بدکیش شرطِ اسلام کے موافق نہ قیامت کے آنے کا قائل ہے اور نہ کسی مذہب و ملّت کا ماننے والا ہے۔ پھر خدا کے واسطے ایسے شخص کی قسم کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔

وہ دادودید گرانمایہ شرط ہے ہمدم وگرنہ مہرِ سلیمان جام و جم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ اے ہمدم اس بخشش الٰہی اور اس تماشائے عالم کا دیکھنا عجائبات کی قدر و قیمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ وگرنہ بے دیکھے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مُہرِ سلیمان اور جامِ جم کیا چیز ہیں۔

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ فنِ سخن میں خامۂ غالبؔ کی جادو نگاری کے ہم قائل تو ضرور ہیں لیکن اب اس میں بڈھے ہو جانے کی وجہ سے کچھ دم نہیں رہا ہے۔

غـزل

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ باغ نے جو مجھ کو خفقانی مزاج پایا ہے تو وہ اب مجھے ڈرا رہا ہے۔ گویا سایۂ شاخِ گل افعی بن کر مجھ کو نظر آتا ہے۔ خفقانی آدمی اکثر اپنے وہم کی وجہ سے ڈر جایا کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ باغ میں پھولوں کی تر و تازگی دل کشی کا اثر رکھتی ہے اور انجامِ محبت جاں گسل ہوا کرتا ہے۔

جوہر تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم   میں وہ سبزہ ہوں کہ زہر آب اُگاتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ جوہر شمشیر جس طرح زہر آب کے چھڑکنے سے اُبھر آتا ہے اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں جس کی نشو و نما غم و غصہ سے ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری سرشت میں غم و غصہ ہے۔

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے   آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ میرے مدعا کی دشواریوں اور سختیوں نے میرے دل کو توڑ دیا ہے اور میرا مدعا میرے دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا تماشائی بن گیا ہے۔ دل جب ثابت تھا تو آئینہ تھا، آئینہ ٹوٹ کر بہت سے آئینے پیدا ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے میرا پہلو آئینہ خانہ بن گیا ہے۔

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک   آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ سارے عالم کا سرمایہ صرف نالہ ہے اور خود عالم ایک مشتِ خاک ہے اور آسمان بیضۂ قمری یعنی حاصل دنیا نالہ کشی کے سوا کچھ نہیں ہے گویا دنیا وار خن ہے اور آسمان نالہ کا پیدا کرنیوالا جس قدر تکلیفیں اور مصیبتیں دنیا میں پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان سب کو آسمان پیدا کرتا رہتا ہے۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے   دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ زندگی میں تو وہ مجھ کو اپنی محفل سے اٹھا دیا کرتے تھے، اب مر جانے کے بعد مجھ کو دیکھنا ہے کہ کون اٹھاتا ہے۔ یہاں اُٹھانے کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ دیکھوں اب ان کی محفل سے کیونکر میں اٹھایا جا سکتا ہوں اور دوسرے یہ کہ اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے۔

قطعہ

رونق ہی ہوئی ہے کوکبۂ شہر یار کی   اِترائے کیوں نہ خاک سر رہگذار کی

کوکبہ خادمان شاہی جو اردلی میں رہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

جب اُس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ   لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بہار کے موسم میں سیر لالہ زار کے واسطے اکثر بادشاہ تشریف لایا کرتے تھے۔

بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے   کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

فرماتے ہیں۔ ہم کچھ سیر گلستاں کے بھوکے نہیں ہیں، یعنی لذات دنیا کی خواہش نہیں رکھتے لیکن بہار کا موسم بھی ایک نعمت اللہ تعالےٰ کی بخشی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی سیر ضرور کر لینی چاہیئے۔

غزل

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پہ دم نکلنا۔ اس کے پورے ہونے کے لئے جلدی کرنی چنانچہ کہتے ہیں، کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو۔ یعنی کیوں جلدی کرتے ہو، پہلے مصرعہ میں مقتضائے مقام یہ الفاظ "کہ دل میں باقی ہیں" مقدر ماننے چاہئیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔ (از یادگار غالب)

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اسکی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

فرماتے ہیں۔ میرا قاتل مجھے قتل کر کے ڈرتا کیوں ہے۔ میرا خون میرے جسم میں تو رہا ہی نہیں، آنسوؤں کے ساتھ آنکھوں سے ہمیشہ نکلتا رہا ہے۔ قاتل کی گردن پر کیا رہ سکتا ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

دوسرے مصرعہ میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہیئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔ بہت خوب شعر لکھا ہے۔

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

فرماتے ہیں۔ اے ظالم لوگ تجھ کو سرو قامت اسی وقت تک سمجھے ہوئے ہیں جب تک تیری زلفیں خمدار ہیں۔ اگر ان کے گھونگھر کھول دیئے جائیں گے تو تیرا قد چھوٹا نظر آنے لگے گا۔

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

فرماتے ہیں۔ ہمارا معشوق عالم آشنا ہے۔ اکثر لوگوں سے اور اس سے خط و کتابت ہوتی ہے مضامین خطوط معلوم کرنے کی تدبیر اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہے کہ ہم نامہ نویسی کریں اور ہر شخص کے مدعائے دلی سے خبردار ہوتے رہیں۔

ہوئی اِس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی — پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

فرماتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں شراب خوری کے واسطے جمشید اور اس کا جام مخصوص تھا جو آج تک چلا آتا ہے۔ اس زمانہ میں حریف جم میں ہوں۔ اب میرے جم سے جام جم کی شہرت ہوگی۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

فرماتے ہیں۔ ہم جن لوگوں کو اپنی کاربراری کا ذریعہ سمجھتے تھے جب ان کو ٹٹول کر دیکھا تو وہ لوگ ہم سے زیادہ ظلم فلک کے ستائے نظر آئے۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

محبت میں مرنے جینے کا امتیاز باقی نہیں رہا ہے جس کو دیکھ کر روح تازہ ہوتی ہے اسی کافر پر ہمارا دم بھی نکلتا ہے۔ حاصل زمین شعر لکھا ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یہ مقطع میرزا صاحب کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔ بیان میں ایک عجیب شوخی برتی ہے، فرماتے ہیں۔ اس بات سے تو ہم کو بھی تعجب ہے کہ میخانہ کے دروازہ سے اے غالبؔ واعظ کو کیا تعلق۔ مگر اتنی بات ضرور ہے، کل کے روز ہم میخانہ سے باہر نکلے تو ہم نے یہ دیکھا کہ واعظ بھی اُدھر سے گزر رہا ہے۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ صاف صاف یہ نہیں بتایا گیا کہ واعظ کہاں جاتا تھا۔ آیا میخانہ میں یا میخانہ کے سامنے سے گزر کر کسی اور طرف۔

قطعہ

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے — بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

فرماتے ہیں۔ اگر ہم آواز کی طرح سُبک اور لطیف ہو کر تڑپتے ہیں تو بھی کوہ کے بار خاطر ہو جاتے ہیں۔ یعنی پہاڑ آواز کو رد کر دیتا ہے، جس سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ ہم پہاڑ کے بار خاطر تھے اس نے ہم کو قبول نہ کیا اور واپس کر دیا۔ اے شرار جستہ اگر ہم تیری طرح خود رفتہ و بے تکلف ہو کر تڑپتے تو خبر نہیں ہمارا کیا حشر ہوتا۔ مطلب یہ ہے، جہاں تک ممکن ہو حالت اضطراری کو

ضبط کرنا چاہیئے۔ شرار پتھر سے نکلتا ہے۔ اور صدا پہاڑ سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنج قفس   از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

فرماتے ہیں۔ جس طرح بیضہ سے پرند پیدا ہو کر زندگی کا آغاز کرتا ہے، اسی طرح اس کنج قفس یعنی بیضۂ ملک سے رہا ہو جانے کے بعد نئی زندگی شروع ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ مر جانے کے بعد عالمِ ارواح میں از سرِ نو زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

غزل

مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہے   موجِ شراب یک مژہ خوابناک ہے

فرماتے ہیں۔ ساقی کی غفلت شعاریوں کی ادائیں مستی کو بھی ہلاک کر رہی ہیں اور موجِ شراب اس ذوق و شوق میں بیخود و مدہوش ہو کر ساغر کی مژہ خواب آلود بن گئی ہے۔

جُز زخمِ تیغ ناز نہیں دل میں آرزو   جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

فرماتے ہیں۔ آرزوئے دل نے زخمِ تیغ ناز کی صورت پیدا کر لی ہے۔ جیبِ خیال یعنی دل ترے ہاتھوں سے چاک ہے۔ اور جب دل چاک ہو گیا تو اس میں آرزو کا قیام ناممکن ہے۔

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ   صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے

فرماتے ہیں۔ تماشائے صحرا سے اس قدر جنون میں جوش پیدا ہو گیا ہے کہ اب کچھ نظر نہیں آتا گویا صحرا ہماری آنکھ کے واسطے ایک خاک کی چٹکی بن گیا ہے۔ یعنی جس آنکھ میں خاک کے ذرے پڑ جائیں اس کو کیا دکھائی دے سکتا ہے۔

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی   قیامت کشتۂ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے

لعلِ بتاں۔ لبِ لعلِ بتاں۔ فرماتے ہیں۔ کشتۂ لب لعلین کی نیند کس قیامت کی نیند ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا اعجاز لب بھی اس کو زندہ نہیں کر سکتا۔ جب وہ قم کہتے ہیں تو اس کی نیند اور گہری ہو جاتی ہے۔

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے — نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

فرماتے ہیں۔ دنیا میں ہر شے کو فنا کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔ چنانچہ نقشِ پا بھی جادہ راہ کی انگلیاں کانوں میں دیئے ہوئے پڑا ہے۔ اس کو بھی یہ خوف پیدا ہو گیا ہے کہ ایسا نہ ہو سیلاب آجائے آبشاروں کی آواز سننی نہیں چاہتا۔ اس لئے اس نے کانوں میں انگلیاں ڈے لی ہیں اور سمجھتا ہے کہ فصلِ گل میں مینہ برس کر مجھ کو فنا کر دے گا۔

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا — شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

فرماتے ہیں۔ بزمِ مے کو کس معشوق کی چشمِ مست نے وحشت کدہ بنا دیا ہے کہ موجِ شراب نبضِ پری پیکر شیشے میں پوشیدہ ہو گئی ہے۔ گویا پری انسان سے وحشت کر کے شیشے میں بند ہو گئی ہے۔

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا — مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

فرماتے ہیں۔ میں تو صرف نیرنگِ تمنا کا تماشائی ہوں۔ یعنی یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمنا کیسا کیا رنگ بدلتی ہے اور دل کو کس قسم کی لذت بخشتی ہے۔ میری مراد یہ نہیں ہے کہ میری مراد ہی پوری ہو۔

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر — مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

فرماتے ہیں۔ جس طرح لکھنے کے وقت سیاہی گر کر حرفوں کو چھپا لیتی ہے اِسی طرح میرے نوشتہ قسمت میں شبہائے ہجراں کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جدائی کی راتوں نے میری نوشتہ قسمت کو ایسا چھپا لیا ہے کہ مجھے یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ آئندہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔

غزل

ہجوم نالہ حیرت عاجز عرضِ یک افغاں ہے خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بہ دنداں ہے

فرماتے ہیں۔ باوجود ہجوم نالہ کے حیرت نے عرض فغاں سے عاجز کر دیا ہے۔ گویا خاموشی نے نیستاں کو جس میں سینکڑوں بانسریاں موجود ہیں، خس بدنداں کر رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود قوتِ گویائی کے رازداری کے لحاظ نے لب سی دیئے ہیں۔

تکلف برطرف ہے جانستاں تر لطف بدخویاں نگاہِ بے حجابِ ناز تیغ تیز عریاں ہے

فرماتے ہیں معشوقوں کا لطف ستم سے بھی زیادہ جانستاں ہے۔ گویا نگاہِ ناز ایک شمشیر آبدار ہے اور جب وہ بے حجاب ہوگئی تو تیغ عریاں بن گئی۔ اب اس کو قتل کرنے میں کیا حجاب باقی رہا۔

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیت شادی کہ صبح عید مجھ کو بدتر از چاک گریباں ہے

فرماتے ہیں۔ کثرتِ غم سے اِس قدر کیفیتِ شادی مٹ گئی ہے کہ میری نگاہ میں صبح عید چاک گریباں سے بھی زیادہ بدتر ہے۔

دل و دین نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے

دست گرداں اس چیز کو کہتے ہیں جو نقد قیمت پر بکتی ہو۔ فرماتے ہیں۔ اگر ساقی میخانہ عشق سے شراب محبت کی خریداری منظور ہے تو دل و دین کو فوراً دے کر اس سے سودا پٹا لے اس بازار میں یعنی بازار عشق میں ساغر محبت کی قیمت پہلے وصول کر لی جاتی ہے۔

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

فرماتے ہیں۔ غم عشق آغوش بلا میں عاشق کو پرورش کیا کرتا ہے۔ قاعدہ ہے ہوا سے چراغ گل ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن طوفان اب دریا میں مرجان کا چراغ نہیں بجھا کرتا ہے، اسی طرح عاشق کا چراغ بھی صرصر کے طوفان میں روشن رہا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کا تکلیف اور مصیبت سے کچھ نہیں بگڑتا۔

قطعہ

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہ دل سے ترے سُرمہ سا نکلتی ہے

سُرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جایا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ تیری خاموشیوں میں بھی ایک ادائے اظہار پائی جاتی ہے۔ گویا تیرے دل کے ارادے سے جو نگاہ نکلتی ہے وہ سُرمہ سا نکلتی ہے۔ یعنی آواز بے صورت ہوتی ہے۔ ؏ خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم صبا جو غنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے

فرماتے ہیں۔ اگر صبا خلوتِ غنچہ میں بھولی بھٹکی جاتی ہے تو غنچہ اس کو آغوش میں لے کر ایسا بھینچتا ہے کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو کر شبنم بن جاتی ہے۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ کہ زخمِ روزنِ در سے ہَوا نکلتی ہے

فرماتے ہیں۔ دل عاشق سے تیغ نگاہ کی آبداری کا حال نہ پوچھو۔ یہ دیکھو کہ جس روزنِ در سے وہ جھانکتے ہیں اس روزن کو تیغ نگاہ نے ایسا زخم بنا دیا ہے جس میں سے ہَوا نکلنے لگی ہے۔ ہوا جس زخم میں سے نکلتی ہے وہ زخم بہت مہلک سمجھا جاتا ہے۔

غزل

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے نافہ دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے

فرماتے ہیں۔ جس سرزمین پر نسیم زلف یار کی خوشبو پھیلا دیتی ہے وہاں آہوئے دشت تتار کا دماغ بھی مشک نافہ بن جاتا ہے۔

کس کا سُراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا آئینہ فرشِ ششش جہت انتظار ہے

فرماتے ہیں اے خدا یہ تو مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ حیرت کس کے جلوہ کا پتہ لگانا چاہتی ہے جو اس نے شش جہت انتظار کو آئینہ بند کر دیا ہے اور یہ چاہتی ہے کہ کہیں تو اس کا عکس جلوہ نظر آجائے۔

ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق! گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

فرماتے ہیں۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے غبار شوق ذرہ ذرہ ہو کر پھیل گیا ہے اور بہت سے ذرّے پریشان ہو کر دام بن گئے ہیں۔ فضائے صحرا جن کا شکار ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غبار شوق صحرا

پر جال کی طرح پھیل گیا ہے۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

فرماتے ہیں۔ دل نے آنکھوں پر یہ دعویٰ دائر کر دیا ہے کہ ان کی نظارہ بازیوں کے فتور سے میں مبتلائے رنج و بلا ہو گیا ہوں۔ میری دادرسی پیشگاہ سرکار عشق سے ہونی لازم و واجب ہے۔

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پہ آب اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

اِس شعر میں میرزا صاحب نے ایران کی رسم کو بیان کیا ہے۔ وہاں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص سفر کرتا ہے تو مسافر کی پشت پر آئینہ رکھ کر اُس آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صحت وعافیت سے عزت و آبرو کے ساتھ واپس آنا نصیب ہو۔ فرماتے ہیں۔ شبنم آئینۂ برگِ گل پر پانی چھڑک رہی ہے اے بلبل وداعِ بہار کا زمانہ قریب آگیا ہے۔

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

فرماتے ہیں۔ ہم کو اپنی بات کا نباہنا منظور ہے۔ یعنی معشوق سے جو آنے کا وعدہ لیا ہے وہ اِس امر کا متقاضی ہے کہ وہ وعدہ فراموش اپنے اقرار پر نہ آئے مگر ہم کو اس کے انتظار میں رات بھر جاگتے رہنا لازمی ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر ہر ذرہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

فرماتے ہیں۔ وادیٔ مجنوں کا ذرہ ذرہ دلِ بیتاب کا حکم رکھتا ہے، ایسے مقام پر مجھ کو بے پردہ سفر کرنا نہ چاہیئے۔

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں طوفان آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

فرماتے ہیں۔ اے بلبل اگر گل میں تجھ کو باغبان کی نظر سے چھپ کر لطف بہار اُٹھانا منظور ہے تو ابھی سے دو چار تنکے لے کر آشیانہ بنا رکھ ورنہ فصلِ بہار کے جوش و خروش میں سُوکھے ہوئے تنکوں کو ترسے گی۔ بہار آکر سارے باغ کو سبزہ زار کر دے گی۔

دل مت گنوا خبر نہ سہی سَیر ہی سہی اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

فرماتے ہیں۔ دل کو برباد مت کر اگر وہ معرفتِ الٰہی سے باخبر نہ ہوا نہ سہی۔ سیر کا لطف تو حاصل ہو جائے گا۔ اے بے دماغ آئینہ دل میں بتوں کی تصویریں تو نظر آ رہی ہیں۔ اگر بُت خانہ ٹوٹ کر کعبہ نہیں بن سکا نہ سہی بُت خانہ میں بھی ایک کیفیت موجود ہے۔

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط   اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

فرماتے ہیں۔ غفلت نے تو عمر اسد کی کفالت پر کمر باندھ لی ہے۔ اور اسد نے دائمی نشاط کی ضمانت کر لی یعنی یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمیشہ عیش و راحت میں زندگی بسر ہو گی اس صورت میں کبھی انجام کا خیال بھی نہیں آنے پاتا۔ اے ناگہانی موت تو کیوں نہیں آ جاتی۔ تجھے کس بات کا انتظار ہے۔ میرے خیال میں جو شخص غفلت میں عمر بسر کرے اور اپنی موت کو بھولا رہے انجام کی دُور اندیشی کے خیال کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دے اس کو ناگہانی موت آ جانی چاہیئے۔

غزل

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے   ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ میں آئینہ کو تیرے روبرو کیوں نہ پیش کر دوں کہ اس کو دیکھ کر تو حیران ہو جائے اور لوگوں کو تیری حیرانی تماشا بن جائے۔ ایسا حسین دوسرا کہاں سے پیدا کروں کہ جس کو دیکھ کر لوگ تجھ سا کہیں۔

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں   گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ حسرت نے میرے دل میں کہ وہ تیری بزمِ خیال ہے ایک گلدستۂ نگاہ لا کر رکھ دیا ہے جس کو سویدا کہتے ہیں (سویدا اس سیاہ داغ کو کہتے ہیں جو دل کے اوپر ہے) مطلب یہ ہے گویا سویدا او دل ایک گلدستہ ہے حسرت بھری نگاہوں کا۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا   افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

فرماتے ہیں اے خدا کس نے گوشِ محبت میں ایسا افسون انتظار پھونک دیا ہے کہ جس کو تمنا کہتے ہیں۔ تعجب اس بات پر آتا ہے کہ محبت ہوتے دیر نہ ہوئی تمنا بھی پیدا ہو گئی۔

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے　　وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ بے وطنی کی تکلیفوں نے مجھ کو ایسا دیوانہ کر دیا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے دیوانوں کی طرح اپنے سر پر خاک ڈالوں مگر وہ خاک ایک مٹھی سے زیادہ نہ ہو مگر ایسی ہو کہ جس کو صحرا کہیں۔ یعنی لوگ یہ سمجھیں کہ اس نے سارے جنگل کی خاک اُٹھا کر سر پر ڈال لی ہے۔

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں　　شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ میری چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے پوشیدہ ایسا آنسوؤں کا جوش بھرا ہوا ہے کہ جس کو بے مبالغہ دریا کہہ سکتے ہیں۔

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو　　صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ معمولی صبحِ بہار سے تو باغ کے پھول کھلا کرتے ہیں۔ ہم ایسی صبحِ بہار کے طالب نہیں ہیں۔ ہم کو تو ایسی صبحِ بہار کی ضرورت ہے جس سے گلشنِ عیش و نشاط کے پھول کھل جائیں اور اس صبحِ بہار کو پنبۂ مینا کہتے ہیں۔

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے　　ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

فرماتے ہیں اے غالبؔ تجھ کو رند سمجھ کر اگر واعظ برا کہتا ہے تو تو کیوں برا مانتا ہے، ایسا آدمی تو دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا جس کو سارا زمانہ اچھا کہے۔ زمانہ کا دستور یہی ہے کہ دس آدمی کسی کو اچھا کہتے ہیں تو ایک بُرا بھی کہتا ہے۔

غزل

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی زِ ادا ہے
داغِ دلِ بے درد نظرگاہِ حیا ہے

فرماتے ہیں۔ گلِ لالہ پر جو اوس کے قطرے نظر آ رہے ہیں یہ بھی انداز و ادا سے خالی نہیں ہیں، وہ گویا اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ دل میں داغ تو ہے لیکن درد و سوز نہیں ہے اِس لئے اوس کی بوندیں عرقِ انفعال کا کام دے رہی ہیں۔ گویا گلِ لالہ اس شرم سے پسینے پسینے ہو گیا ہے۔

دل خوں شدہ کشمکش حسرتِ دیدار　　آئینہ بدستِ بُتِ بدستِ حنا ہے

فرماتے ہیں حسرتِ دیدار کی کشمکش نے دل کو خون کر دیا تھا اب گویا وہ آئینہ بن کر بتِ بدست حنا کے ہتھے چڑھ گیا ہے مگر اس کے ہاتھوں میں بھی اس کے تغافل کا اظہار کر رہا ہے۔ بدمست حنا سے مراد ایسا معشوق ہے جو مہندی رچانے کے شوق میں از خود رفتہ ہو گیا ہو۔

شعلہ سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی　　جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

فرماتے ہیں۔ وہ بات شعلۂ آتش سے بھی نہیں ہو سکتی جو ہوسِ شعلہ نے دل کے ساتھ کی ہے یہاں شعلہ سے مراد شعلۂ عشق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب دل میں شعلۂ عشق اس حد تک نہ بھڑک سکا کہ دل جل کر خاک ہو جاتا تو دل کی ناکامی پر جی جل گیا۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق　　آئینہ بانداز گل آغوش کُشا ہے

فرماتے ہیں۔ تیری تصویر میں بھی ایسی شوخی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے کہ اس پر جو آئینہ لگایا گیا ہے وہ پھول کی طرح شوق ہم آغوشی میں آغوش کُشا ہو گیا ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ　　اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

فرماتے ہیں۔ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ ہستی نہیں رکھتی اور بلبل جو ایک قفسِ رنگ کے سوا وقعت نہیں پا سکتی مگر ان کے بولنے اور چہکنے سے عالم میں ایک دھوم مچ گئی ہے اور سب نے جان لیا ہے کہ قمری سرو کی شیدا ہے اور بلبل پھول کی عاشق، گویا جگر سوختہ یعنی عشق کا نشان ان کے ناموں سے ملا ہے۔ میرزا صاحب نے اس شعر میں لفظ (اے) کو (جز) کی جگہ استعمال کیا ہے۔

خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو　　معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

فرماتے ہیں۔ لگاوٹ کے موقع پر تیری کم توجہی اور اغماض کی عادت نے جوشِ عشق کو کم کر دیا معشوق بن کر ایسا کم حوصلہ ہونا ایک نئی مصیبت کا سامنا ہے۔

مجبوری و دعوئ گرفتاریِ الفت　　دستِ تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

فرماتے ہیں۔ عشق بے اختیاری شے ہے۔ یعنی ارادے کے ساتھ پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ عشق پیدا ہو جانے کے بعد گرفتاریٔ عشق کا دعویٰ کرنا ایک ایسی بات ہے جیسے کسی کا ہاتھ ایک بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہو اور وہ یہ کہے کہ میں نے اس پتھر سے وفا کا عہد باندھا ہے۔ میں کبھی اپنا ہاتھ پتھر کے نیچے سے نہ کھینچوں گا، حالانکہ پتھر کے نیچے سے ہاتھ کھینچ لینا امکان سے باہر ہے۔

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ — تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

فرماتے ہیں۔ تیرے تلوار کھینچنے اور قتل پر آمادہ ہو جانے سے ہم کو شہیدانِ گزشتہ کا حال معلوم ہو گیا تیری تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے یعنی جس طرح بیکسی کے عالم میں تو ہم کو قتل کرنا چاہتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو نے اسی طرح اور مظلوموں کے بھی گلے کاٹے ہوں گے۔

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی — سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

یہ شعر میرزا صاحب کے نشتروں کا ایک آبدار نشتر ہے۔ خدا بخشے حضرت استاذی مولانا حالی اس شعر کی شرح میں خود تحریر فرماتے ہیں۔ یہ خطاب ہے آفتابِ حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ مہتم بوجود ہے اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں۔ اگر آفتابِ حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ افگن ہو جائے تو یہ دھوکہ جاتا رہے اور ہم فنا فی الشمس ہو جائیں اس لئے کہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یا رب اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہم نے کئے ہیں اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی داد بھی ملنی چاہئیے (از یادگار غالب)

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ — کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ لوگوں کی کم توجہی سے تو بیدل کیوں ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی تیرا معاون و مددگار نہیں ہے تو نہ ہو خدا تو ہے۔

غزل

منظور تھی یہ تشکیل تجلّی کو نور کی　　قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

نعت میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ تجلّی الٰہی کو تیری نورانی صورت ظاہر ہونا منظور تھا۔ گویا ترے قد و رخ کے حسن دلکش سے ظہور کی قسمت کھُل گئی۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں　　پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے۔

(از یادگار غالب) میرزا کے نشتروں میں کا ایک نشتر یہ شعر بھی ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو　　کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

فرماتے ہیں۔ اے واعظ نہ تم خود پی سکتے ہو اور نہ کسی کو پلا سکتے ہو اور تعریف اس شد و مد کے ساتھ کرتے ہو تو معلوم ہوا تمہاری شراب طہور صرف خیالی شراب ہے جس کے بیان سے اپنا دل خوش کر لیتے ہو۔ نئی قسم کی شوخی برتی ہے اور بہت ہی مزے کا شعر کہا ہے۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا　　گویا ابھی سُنی نہیں آواز صور کی

فرماتے ہیں۔ مجھ سے میرا قاتل حشر میں لڑتا ہے کہ تو بغیر میرے حکم کے کیوں زندہ ہو گیا یعنی میں نے تجھ کو قتل کیا تھا۔ میں اٹھاتا تو اٹھتا۔ اور سلامتی سے تغافل کا یہ حال ہے گویا ابھی تک صور کی آواز بھی نہیں سُنی ہے۔

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج　　اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

فرماتے ہیں۔ بلبل کی نغمہ سنجی بے سبب نہیں ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بہار اب آنیوالی ہے، اگرچہ کامل یقین تو ہو نہیں سکتا اس لئے کہ ایک اُڑتی سی خبر سُنی گئی ہے اور وہ بھی کسی معتبر کی زبان سے نہیں بلکہ طیور کی زبان سے ہے۔

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں　　کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم نے مانا کہ اب خانہ کعبہ میں بت نہیں ہیں مگر کبھی پہلے تو وہاں تھے اور وہاں سے نکال دیئے گئے ہیں اِس لئے ان بتوں کو کعبہ سے ایک دُور کی نسبت ہے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

کیا خوب شعر کہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ یہ تو کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ہر شخص کو حضرت موسیٰ کی طرح جواب صاف ہی مل جائے۔ ممکن ہے کہ ہماری درخواست منظور ہو اور جلوۂ دیدار دکھا دیا جائے، پھر کیوں نہ ہم کوہِ طور کی سیر کریں۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

فرماتے ہیں۔ شوخ زبانی اور حاضر جوابی کوئی بُری بات نہیں ہے اگر حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے۔ وہاں تو یہ حال ہے کہ وہ جس سے بات کرتے ہیں وہ ان کی شوخ زبانی کی ضرور شکایت کرتا ہے۔ عجب گرم شعر کہا ہے۔

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اس شعر سے میرزا کی کمال شوخیٔ طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانہ میں لکھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ میرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لئے منّت مانتے ہیں۔ مگر منّت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا اور سفرِ حج کا وہ اشتیاق اور ادھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری (از یادگارِ غالبؔ)

غزل

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

فرماتے ہیں۔ رنج و غم سہنے میں دل ناکام اس قدر بودا اور کمزور ثابت ہوا ہے کہ اس معمولی سی بات کا افسوس کہ آج شراب گلرنگ تھوڑی مقدار میں باقی رہ گئی ہے۔ اس کے حق میں غم کا ایک پہاڑ بن گیا ہے۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لئے کافی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع نہ سمجھے۔ اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ (از یادگارِ غالبؔ)

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا ساری خرابیاں شہرت اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔ (از یادگار غالب)

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ میں اس زہد و تقویٰ اور عبادت کا قائل نہیں ہوں جس کے انعام میں جنت کی اُمید اور حور کے ملنے کی توقع شامل ہو۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں — پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ کونسی رسم و راہ خاص ہے جس پر عقلمند لوگ ناز کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ عامیانہ رسموں کی پابندی سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ پھر روشِ خاص برتنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے — آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو تو چاہِ زمزم ہی پر چھوڑ دو کہ میں بیٹھا ہوا اپنے دامن سے شراب کے دھبے دھوتا رہوں مجھ کو طوافِ خانۂ کعبہ سے کیا ثواب حاصل ہو سکتا ہے جبکہ میرا جامۂ احرام شراب میں آلودہ ہے۔

ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو — انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ اگر اب بھی میری مراد پوری نہ ہو تو ستم ہے۔ ان کو وصل سے انکار نہیں اور مجھ کو بے انتہا اصرار ہے۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ — رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ اے اجل ابتدائے عشق میں کیوں مجھ سے مرنے کا تقاضا کرتی ہے ابھی مجھ کو محبت کے کوچہ میں پڑا رہنے دے جگر کا خون ہونا آنکھوں سے بہنا، میرا کوچہ و بازار میں رسوا ہونا اور اسی قسم کی بہت سی ذلتیں اور مصیبتیں مجھ کو اٹھانی باقی ہیں۔ ان سب کاموں کو انجام

دے لوں تو پھر مرنے کا ارادہ کروں۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ کوئی ایسا ہی بدنصیب شخص ہوگا جو غالب کو نہ پہچانتا ہو۔ جس قدر وہ اچھا شاعر ہے اتنا ہی مشہور بھی ہے۔

غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ بہت ہی دن ہو گئے یار کی مہمانداری نہیں کی اور شراب آتشیں پیالوں میں بھر کر اپنے عزیز مہمان کے سامنے نہیں رکھی جس سے بزم چراغاں کا لطف حاصل ہو۔ یعنی ایک ایک جام ایک ایک چراغ کا کام دے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر بیٹھا ہوا ان جگر کے ٹکڑوں کو چن رہا ہوں جن کو پہلے بھی مژگانِ یار کے روبرو پیش کر چکا ہوں۔

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر ضبط جنوں سے دم گھٹنے لگا ہے۔ برسوں ہو گئے کہ گریباں کو چاک ہی نہیں کیا۔

پھر گرم نالہائے شرر بار ہے نفس مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر یہی جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح ایسے نالے کروں کہ جن سے شرر برسنے لگیں مدت ہو گئی چراغاں کا تماشا دیکھے ہوئے۔

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر شور عشق زخم دل پر نمک چھڑکنے کے لئے سامان بہم پہنچا رہا ہے۔

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ میں نے خامۂ مژگاں کو پھر خونِ دل میں اِس غرض سے ڈبو دیا ہے کہ صفحۂ دامن پر

گلکاریاں کردوں۔

یا ہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ آپس میں پھر دل و دیدہ رقیب بن گئے ہیں۔ دل نے جمالِ یار کی خیالی تصویر کھینچی ہے اور آنکھ نے نظارۂ روئے نگار کی حسرت ظاہر کی ہے۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر دل نے کوچۂ ملامت کے طواف کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ غرور خودداری کے بُت خانہ کو توڑ ڈالا ہے۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر شوق کسی خریدار معشوق کو ڈھونڈھ رہا ہے اور اس نے یعنی شوق دل نے متاعِ عقل و دل وجاں کی دوکان لگالی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر کوئی معشوق خریدار بن کر ہم سے عقل و دل وجان کا سودا کرلے۔

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر خیال حسینوں کی طرف دوڑنے لگا ہے۔ نگاہ میں سینکڑوں باغوں کا سامان فراہم کئے ہوئے۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ میں پھر یار کا خط کھولنا چاہتا ہوں۔ اس نے جو لفافہ پر میرا نام و پتہ لکھا ہے وہ دلفریب ہے کہ میں اس کو جان نذر کرنی چاہتا ہوں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر میری آرزو ہے کہ کوئی معشوق سیاہ زلفیں چہرے پر پریشان کئے ہوئے کوٹھے پر سے مجھ کو جھانک رہا ہو۔

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو آرزو ہے کہ پھر کوئی میرے مقابلہ میں مژگاں کی چھری کو سُرمہ سے تیز کیے ہوئے آجائے۔

اِک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر ایک نو بہار ناز کو نظر تاک رہی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ چہرہ کو فروغ مے سے باغ کا ہمسر بنا کر سامنے آجائے۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیر بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر جی میں یہ بات سمائی ہے کہ کسی معشوق کے دروازہ پر دربان کا احسان سر پر لیے ہوئے پڑے ہیں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر یہ جی چاہتا ہے کہ گزرے ہوئے زمانہ کی طرح ایسی فرصت مل جائے کہ رات دن تصوّر یار کیے خاموش بیٹھے رہیں۔

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ ہم کو نہ ستا کہ ہم پھر جوشِ اشک سے طوفاں برپا کرنیکا ارادہ کیے ہوئے بیٹھے ہیں۔

غزل

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے — رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

فرماتے ہیں۔ ظلم دوست ہمارے حق میں بہت مبارک ثابت ہوا، اس لئے کہ ظلم وستم کے جتنے طریقے تھے وہ سب برت لئے گئے۔ گویا جتنے ظلم تھے وہ ختم ہو گئے، اب نئی طرز ستم آسماں ایجاد نہیں کر سکتا، پھر ظلم کرے تو کیونکر کرے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ستم سہہ کر آسمان کے ظلم سے عمر بھر کے لئے محفوظ ہو گئے۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں چکاں کیلئے

فرماتے ہیں۔ میں کیا کروں، اگر مژۂ یار ابھی اور خون کی پیاسی ہے، میں اس کے حصہ کے موافق خون دل اس کو پلا چکا۔ اب جس قدر خون دل میں باقی ہے وہ میری مژہ خوں فشاں کا حصہ ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر ‏ ‏ نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

نئی طرح کی شوخی ہے حضرت خضر علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ دیکھئے زندگی اس کا نام ہے کہ ہم دنیا میں رہ کر لوگوں سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ آپ نے اگر عمر جاوداں حاصل کر بھی لی تو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ لوگوں کی نگاہوں سے تو آپ پوشیدہ رہتے ہیں۔ ایسی حیاتِ جاوداں کس کام کی جس کی بدولت چشم خلایق سے پوشیدہ رہنا پڑے۔

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک ‏ ‏ بلائے جاں ہے ادا تیری اِک جہاں کیلئے

فرماتے ہیں۔ کاش میں اکیلا مبتلائے بلا ہوتا۔ تیری ادا اگر بلا تھی تو صرف میرے واسطے ہوتی۔ بلائے رشک سے تو چھٹکارا حاصل ہوتا۔ ستم یہ ہے کہ تیری ادا ساری دنیا کی بلائے جان قرار پا گئی ہے۔

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں ‏ ‏ درازدستی قاتل کے امتحاں کے لئے

فرماتے ہیں۔ اے فلک تو نے مجھ کو اس قاتل سے کیوں دور رکھ چھوڑا ہے۔ ایک میں ہی تو اس کے ستم و جور کے لئے مخصوص نہیں ہو گیا ہوں۔ اوروں پر بھی تو اس کی درازدستی کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ وہ مجھ کو دیکھتے ہی قتل کر ڈالے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر ‏ ‏ کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرایہ میں بیان نہیں ہو سکتی (از یادگار غالب)

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے ‏ ‏ اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

اُردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آرزو جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر پروانہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر پر مارک کیا ہے

یہاں اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ میرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا۔ سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں، صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صرف دلالت کرتا ہے اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔ (از یادگار غالب)

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل   کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

فرماتے ہیں۔ غزل کا میدانِ تنگ میرے شوق بیان کے واسطے کافی نہیں ہے۔ مجھ کو اس سے بہت زیادہ وسیع میدان درکار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں سے غزل سرائی چھوڑ کر مدح سرائی شروع کرتا ہوں۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے   بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

یہ چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنھوں نے میرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا۔ مگر غالباً میرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں۔ عیش اور مخلوق کو بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اور وہ صرف اس غرض سے کہ میرے ممدوح کو نظر نہ لگ جائے ورنہ حقیقت میں تو عیش صرف تجمل حسین خاں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا   کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

فرماتے ہیں۔ الٰہی میری زبان پر کس با اقبال شخص کا نام آگیا ہے کہ جس کے اثر سے میرے نطق نے میری زبان کو چوم لیا ہے۔

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک   بنا ہے چرخِ بریں جس کی آستاں کے لئے

فرماتے ہیں۔ وہ نصیر دولت و دیں بھی ہے اور معین ملت و ملک بھی اور وہ ایسا شخص ہے کہ

چرخ بریں اس کے آستانہ کے واسطے بنایا گیا ہے۔

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

فرماتے ہیں۔ اس کے وقت میں زمانہ محو آرائش ہو گیا ہے۔ یہ موجودہ ستارے آرائش فلک کے لئے کافی نہیں تھے۔ اس لئے اور ستارے بننے کی ضرورت واقع ہوتی ہے اس سلئے کہ وہ ہر شے کو کامل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

فرماتے ہیں۔ ورق ختم ہو گیا اور تعریف ابھی باقی ہے۔ ایک دفتر درکار ہے اس دریائے اوصاف کے لئے۔

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

فرماتے ہیں۔ غزل میں مدح لکھنی غالب کی ادائے خاص ہے۔ دوستوں کو چاہیئے کہ وہ بھی یہ طریقہ اختیار کریں۔

قصائد

سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار   سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

فرماتے ہیں۔ چمن میں ایک خاک کا ذرہ بھی ایسا نہیں ہے جو حُسنِ بہار سے فیضیاب نہ ہوا ہو۔ یہاں تک کہ سایۂ لالۂ بے داغ بھی دل بہار کے لئے سویدا کا حکم رکھتا ہے اگر لالہ کو داغدار کہا جاتا تو اس کا داغ سویدا سمجھا جاتا۔ اس لئے لالۂ بے داغ کہا ہے کہ اس کا سایہ سویدا کا کام دے سکے۔

مستیِ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ   ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

تیغِ کوہ۔ قلّۂ کوہ کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ بادِ صبا اس قدر مست ہوگئی ہے کہ اس کی تاثیر سے وہ سبزہ جو جوہرِ تیغِ کہسار سمجھا جاتا تھا، ریزۂ مینائے مے بن گیا ہے۔ شیشہ کی کرچیں شکل و رنگ میں ہری گھاس سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سبزۂ کہسار یہ مطلب ظاہر کر رہا ہے کہ بادِ صبا کی کشتی سے جوہرِ تیغِ کہسار ریزۂ مینائے مے بن گیا ہے۔

سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ   تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

فرماتے ہیں۔ چیتے کے داغ جو سیاہ ہوا کرتے ہیں، بہار کے اثر سے جامِ زمرد کی طرح سبز ہوگئے ہیں اور شرار ریشۂ نارنج کی طرح تر و تازہ ہوگیا ہے۔ دونوں تشبیہیں نہایت بدیع و نادر واقع ہوئی ہیں۔

مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت   کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

فرماتے ہیں۔ ابر کی مستانہ خرامی سے حسرت بھی گلچینِ طرب ہے یعنی اس طرب اندوز کیفیت سے دونوں جہان کے غموں کا خاتمہ نظر آ رہا ہے۔

کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل   راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

راہ خوابیدہ: وہ رستہ جس پر لوگوں کی آمد و رفت مدت سے نہ تھی اور سنسان پڑا ہوا تھا۔ فرماتے ہیں۔ کوہ وصحرا تمام عندلیبان خوشنوا کے چہچہوں سے معمور ہو گئے ہیں اور غنچوں کے چٹکنے کی آوازوں سے سوئے ہوئے رستے بیدار ہو گئے ہیں۔ یعنی ان پر لوگ تماشائے بہار کے لئے چلنے پھرنے لگے۔

سوپنے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم سرنوشت دوجہاں ابر بیک سطر غبار

فرماتے ہیں۔ بادِ بہاری سے ہر چیز کو ایسی سیرابی حاصل ہو گئی ہے کہ ایک سطر جو خطِ غبار میں لکھی ہوئی ہو، سرنوشت ابر بلکہ دو صد ابر سمجھی جاتی ہے۔ پھر اس سطرِ غبار کو مژگانِ یتیم سے تشبیہ دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ جس طرح کسی یتیم بچے کی مژگان خاک آلود ایک سطر بخطِ غبار ہو یعنی جس کی سرنوشت میں سالہا سال کا رونا لکھا ہو، وہ بھی فیضِ بادِ بہاراں سے سرور اندوز ہو گئی ہے۔

کاٹ کر پھینکئے ناخن تو بانداز ہلال قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

فرماتے ہیں۔ آج کل ناخن بھی اگر تراش کر پھینک دیا جائے تو اس کو بھی قوتِ نمو ہلال کی طرح بڑھاتے بڑھاتے بدرِ کامل بنا دے۔

کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز دامِ ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار

فرماتے ہیں۔ بہار نے ہر چیز میں جان ڈال دی ہے یہاں تک کہ مٹھی بھر خاک قمری بن گئی ہے اور ہر شعلہ آتش طاؤس بن گیا ہے۔ قمری کا رنگ خاکی واقع ہوا ہے اس لئے کفِ خاک سے قمری کا بن جانا ثابت کیا ہے اور کاغذ جو جل کر مشتبک ہو جاتا ہے اس واسطے اس کو دامِ طاؤس سے تشبیہ دی ہے۔

میکدہ میں ہو اگر آرزوئے گل چینی بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار

فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو یہ تمنا ہے کہ میکدے میں بیٹھا ہوا پھول چنا کرے تو ایک کام کر اور وہ کام یہ ہے کہ ایک جام شراب طاق گلزار پر رکھ کر بھول جا۔ تھوڑے دن کے بعد باغ میں

اسی طرح ایک شراب خانہ پیدا ہو جائے گا۔ جس طرح ایک بیج سے ایک درخت پیدا ہوکر سینکڑوں شاخیں نکال لاتا ہے۔ گویا ایک جامِ شراب شراب خانہ کا تخم ہے جو دیوار باغ کے طاق پر رکھ دینے سے باغ میں میخانہ پیدا کر دے گا۔

موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوتکدۂ غنچہ باغ　　گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

فرماتے ہیں۔ اگر تو نشہ کی حالت میں شراب خانہ کے کسی کونے میں اپنی پگڑی رکھ کر بھول جائے تو غنچۂ باغ کے خلوت خانہ میں اس کو جاکر ڈھونڈھ وہ موجِ گل بن گئی ہے تجھ کو مل جائیگی۔ اور تجھ پر ہوائے بہاراں کی اعجاز نمائی ظاہر ہو جائے گی۔

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر　　سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

فرماتے ہیں۔ اگر مصورِ فکر چمن کی تصویر کھینچے تو سبزہ خط کی طرح پرکار کی کھینچی ہوئی لکیر سبز ہو جائے۔

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ　　طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

فرماتے ہیں، منقبت سرائی کے لئے لعل سے طوطیِ سبزۂ کہسار نے زبان پیدا کر لی ہے۔ لعل بھی پہاڑ میں پیدا ہوتا ہے اور سبزہ زار بھی پہاڑ پر۔

وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا　　چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فرماتے ہیں۔ وہ شہنشاہ جس کی تعمیرِ محل کے لئے حضرت جبریل کی آنکھ اینٹیں بنانے کا سانچہ بن گئی ہے۔

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور　　رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

فرماتے ہیں۔ اس کے قصر کی تعمیر کے واسطے آسمان ہفتم دوشِ مزدور کی طرح خم ہوگیا ہے اور فیضِ ازل اس کے معمار کا وہ سوت ہے جس سے معمار دیوار کا سیدھا پن دیکھتا ہے۔

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام　　رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

سبزۂ نو چمن۔ نو آسمانوں سے مراد ہے۔ فرماتے ہیں۔ نو آسمانوں کی بلندی اور اس کا بامِ قصر برابر ہے۔ دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں۔ سو عارفوں کی بلند ہمت اور اس کے قصر کی

چار دیواری مساوات کا درجہ رکھتی ہے۔

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ — وہ رہے مروحۂ بال پری سے بیزار

فرماتے ہیں۔ وہاں کی خس و خاشاک سے جس کو ایک پرِ کاہ بھی میسر آجائے وہ تمام عمر بالِ پری کے پنکھے سے بیزار رہے۔

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا — چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

فرماتے ہیں۔ صحرائے نجف کی خاک عارفوں کی سیر کا جوہر ہے اور چشمِ نقشِ قدم بختِ بیدار کا آئینہ ہے۔ مطلب یہ ہے اہلِ عرفان خاکِ نجف کو موجبِ فخر سمجھتے ہیں اور سفرِ نجف کے وقت اپنے نقشِ پا میں بختِ بیدار کی صورت مشاہدہ کر لیتے ہیں۔

ذرّہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز — گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

فرماتے ہیں۔ وہاں کی خاک کا ذرّہ آفتاب کے لئے فخر و ناز کے آئینہ کا حکم رکھتا ہے۔ آئینۂ ناز وہ آئینہ جس میں مُنہ دیکھنا باعثِ فخر و ناز ہو۔ اور وہاں کے جنگل کی خاک امید کے لئے فصلِ بہار کا جامۂ احرام ہے۔

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز — عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

فرماتے ہیں۔ وہاں سے آفرینش کو مستی و ناز و فخر کی طلب ہے۔ گویا موجِ غبار انگڑائی ہے ایجاد کی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح نشہ کے اُتار کے وقت انگڑائی آتی ہے اسی طرح وہاں کی موجِ غبار بلند ہو کر بتاتی ہے کہ شرابِ فخر و ناز کا نشہ اُتر گیا ہے۔ پھر اس کی طلب میں انگڑائیاں لی جا رہی ہیں۔ گویا وہ سرزمین ایسی ہے کہ پیدا کرکے آفرینش کو بھی بار بار اس پر فخر و ناز ہوتا ہے۔

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار — دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

فرماتے ہیں۔ اے شمعِ شبستانِ بہار تیرے فیض سے پروانہ کا دل چراغاں بن گیا ہے اور

پر بلبل گلزار ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی دلی مرادیں تجھی سے حاصل ہوتی ہیں۔

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار

فرماتے ہیں۔ طاؤس کی طرح سارا آئینہ خانہ اڑنے لگے تو کیا عجب ہے تیرے جلوہ کے ذوق اور تیرے دیدار کے شوق نے اس کو پر لگا دیئے ہیں۔

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار

فرماتے ہیں۔ تیری اولاد کے غم سے آسمان پر سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس غم میں رونے سے آنسوؤں کو موتیوں کا رتبہ مل جاتا ہے۔

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

فرماتے ہیں۔ تیرا نقشِ قدم عبادت کے واسطے سجدہ گاہ کا حکم رکھتا ہے اور ریاضت کے لئے تیرا حوصلہ پشت پناہ کا کام دیتا ہے۔

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

فرماتے ہیں۔ تیری مدح میں زمزمۂ نعتِ نبی پوشیدہ ہے۔ گویا جس نے تیری مدح لکھی اس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح لکھی۔ اور جس نے تیرا جام محبت پی لیا وہ گویا بادۂ اسرار سے بیخود و سرشار ہو گیا۔

جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار

فرماتے ہیں۔ تیرے دستِ دعا کا ایک ادنیٰ جوہر یہ ہے کہ وہ تاثیر کا آئینہ ہے، یعنی ادھر ہاتھ دعا کے لئے اٹھے اور ادھر دست بستہ اثر سامنے آموجود ہوا۔ ایک طرف تو مژگان کو بوجہ اشک ریز ہونے کے جو دعا قبول ہونے کا ذریعہ ہے فخر و ناز ہے۔ دوسری طرف جوہر تاثیر خارِ حسرت کے واسطے موجبِ رنج و ملال ہے، یعنی جب دعا قبول ہو گئی تو حسرت پامال ہو گئی۔

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

فرماتے ہیں۔ جو آنکھ تیرے خاک در کی آئینہ دار نہ ہو، یعنی خادم و فرمانبردار نہ ہو۔ اس کی نظر سعادت و اقبال کا عزاخانہ بن جائے اور اس کی مردمک سیاہ سوگ نشینوں میں شمار کی جائے۔

دشمنِ آلِ نبیؐ کو بہ طرب خانۂ دہر　　عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

فرماتے ہیں۔ آل نبیؐ کے دشمن کو اس طرب خانۂ دنیا کی ایک ایک محراب اور ایک ایک طاق موج سیلاب بن کر ڈبو دے۔

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتو شوق　　فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

فرماتے ہیں۔ آنکھ سے لگاتار دل تک اے اسدؔ پرتو شوق کا آئینہ دار بن جائے۔ اور فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار ہو جائے۔

قصیدہ دیگر

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

فرماتے ہیں۔ اس دنیا کا وجود جلوۂ یکتائیِ معشوق کا آئینہ ہے۔ اگر حُسن کو اپنے دیدار کی طلب نہ ہوتی تو ہم کہاں سے ہوتے۔ گویا ہم کو آئینہ بنا کر جمال بے مثال دیکھا ہے۔ یہ شعر تمام و کمال تصوّف کے ایک مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے۔

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق　　بیکسی ہائے تمنّا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

فرماتے ہیں۔ افسوس ہے ہم نے ایسی بے دلی کے ساتھ اس دنیائے ناپائدار کے تماشے دیکھے کہ جس سے نہ عبرت حاصل ہوئی نہ لذّت ملی۔ اور تمنّا ایسی بیکسی کی حالت میں رہی کہ جس سے نہ دین ہی ملا نہ کچھ دنیا کا ہی فائدہ حاصل ہو سکا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تماشے سے اگر انسان کو عبرت حاصل ہو تو دین کا فائدہ ہے اور اگر اس کے دیکھنے سے لطف ہو تو دنیا کے مزے ہیں۔ ہماری بے دلی نے اور ہماری بے دماغی نے ان دونوں فائدوں

سے ہم کو محروم رکھا۔

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم و ہستی و عدم لغو ہے آئینۂ فرق جنون و تمکیں

فرماتے ہیں۔ وجود باری تعالیٰ کے سوا کسی دوسری شے کے وجود و عدم کی نسبت گفتگو کرنی یا جنون و تمکین کے متعلق کوئی فرق ثابت کرنا لغو و بے فائدہ ہے۔

نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

فرماتے ہیں۔ جو لوگ معنی شناسی کے مدعی ہیں، ان کو صرف ظاہرداری منظور ہے اور جو لوگ حق گوئی کے دعویدار ہیں ان کو فقط اپنی تحسین و ستائش سننی مقصود ہے معنی شناسی ایسی ہونی چاہیئے جس میں ظاہرداری کا میل نہ پایا جائے اور حق گوئی اُس کا نام ہے جس میں اپنی کوئی غرض مخفی نہ ہو۔

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

فرماتے ہیں۔ جو آدمی دنیاوی معاملات میں عقلمندی کا دعویٰ کرتا ہے وہ غلطی پر ہے اور جو کوئی دین کے معاملات میں عبادت سے نفع کی اُمید رکھتا ہے اس کا خیال بیجا ہے، واقعی بات تو یہ ہے کہ دین و دنیا دونوں غفلت کی بدولت خراب ہیں۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح شراب کی تلچھٹ اعتبار کے قابل نہیں ہوتی اسی طرح سے دین و دنیا ساغر غفلت میں تہ نشیں ہیں۔

مثل مضمون وفا باد بدست تسلیم صورتِ نقش قدم خاک بفرقِ تمکیں

فرماتے ہیں۔ دنیا ایسی جگہ ہے کہ یہاں تسلیم و رضا جیسی قابل قدر دولت بیکار اور بے فائدہ ثابت ہوتی ہے اور اسی طرح وقار و تمکین سے مثل نقش قدم ذلت و رسوائی حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح نقش قدم خاک بسر ہوتا ہے۔

عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزاء حواس وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حُسنِ یقیں

فرماتے ہیں۔ ہوشیار لوگوں کے نزدیک اس زمانہ میں دیوانگی و بیخودی کا نام عشق رکھ لیا

گیا ہے۔ اور اصحاب اہل یقین کی نظروں میں آئینہ یقین کا زنگار وصل معشوق ہے۔ اگر آئینۂ یقین مجلی ہوتا تو معشوق کا جلوہ خود اپنی ذات میں نظر آتا اور پھر اس سے کبھی مفارقت نہ ہوتی۔

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب   بے ستوں آئینۂ خواب گراں شیریں

فرماتے ہیں۔ فرہاد کے عشق کو ہم عشق کامل تسلیم نہیں کرتے وہ صرف خسرو کے محل کا ایک مزدور تھا۔ اس کے جذب محبت کا شیریں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ گویا کوہ بے ستوں شیریں کے خواب غفلت کی ایک تصویر سایہ دار ہے جس پر پتھر کاٹتے کاٹتے کوہکن تیشہ سے اپنا سر پھوڑ کر مر گیا۔

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز   کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں

فرماتے ہیں۔ اس زمانہ میں نفس اہل وفا کو آگ لگا دیتے ہوئے کس نے دیکھا ہے اور کس نے دردمندوں کی فریاد میں اثر پایا ہے۔ مطلب یہ ہے نہ اب اہل وفا کی آہ میں گرمی ہے نہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے نالہ میں اثر ہے۔

سامع زمزمۂ اہل جہاں ہوں لیکن   نہ سر و برگ ستائش نہ دماغ نفریں

یہاں زمزمہ کا لفظ طنزاً بجائے ہرزہ سرائی استعمال ہوا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اہل جہاں جو کچھ ہرزہ سرائی کرتے ہیں، مجبوریں بھی سُن لیتا ہوں۔ مجھ سے نہ تو ان کی تعریف کی جا سکتی ہے اور نہ ان کی مذمت کرتا ہوں۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ   یک قلم خارج آدابِ وقار و تمکیں

یہ شعر گریز کا ہے۔ اہل دنیا کی نافہمی کی نسبت لکھتے لکھتے فرماتے ہیں کہ خدا کی پناہ میں کس قدر ہرزہ سرا ہو گیا ہوں۔ میں نے جو باتیں اوپر بیان کی ہیں وہ یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں تھیں۔

نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر   یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

فرماتے ہیں۔ اے قلم ہذیان کے رفع کرنے کو لاحول کا تعویذ لکھ اور فطرت وسواس کے رفع کرنے کو یا علی کا وظیفہ پڑھ۔

مظہرِ فیضِ خدا جانِ دلِ ختمِ رُسل قبلۂ آلِ نبیؐ کعبۂ ایجادِ یقیں

فرماتے ہیں۔ وہ فیضِ خدا کا ظاہر کرنے والا ہے اور خاتم رسل کا جان و دل ہے اور وہ قبلۂ آلِ نبیؐ ہے اور کعبہ ایجادِ یقین۔

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام ہر کفِ خاک ہو واں گردِ تصویرِ زمیں

فرماتے ہیں۔ وہ باعثِ نازشِ ایجادِ عالم جہاں سرگرم خرام ہوا، وہاں کی ہر کفِ خاک کرۂ زمیں بن جائے۔

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

فرماتے ہیں۔ اس کا نقشِ قدم جس جگہ جلوہ پرداز ہو جائے ان کے قدموں کے اثر سے اِس کفِ خاک سے دونوں جہان کو عزت و آبرو حاصل ہو۔

نسبتِ نام سے اسکی ہے یہ رتبہ کہ رہے ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فرماتے ہیں۔ اس کے نام کی نسبت سے زمین کو یہ رتبہ حاصل ہو گیا ہے کہ ابد تک پشتِ فلک نازشِ زمین سے خم رہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت علی رض کی کنیت ابو تراب ہے، اور تراب مٹی کو کہتے ہیں۔ اس سبب سے زمین نازاں ہے۔

فیضِ خلق اسکا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

فرماتے ہیں۔ بوئے گل سے جو بادِ صبا معطر ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پھولوں کو میرے ممدوح نے خلق کا فیض پہنچایا ہے۔

برشِ تیغ کا اسکی ہے جہاں میں چرچا قطع ہو جائے نہ سررشتۂ ایجاد کہیں

فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کی برشِ شمشیر کا سارے جہان میں شہرہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رشتۂ ایجاد اس کی شہرت کے خوف سے قطع ہو جائے۔

کفر سوز اسکا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں

فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کا جلوہ ایسا کفر سوز واقع ہوا ہے کہ جس سے رنگ عاشق کی طرح

بت خانۂ چین بھی شکستہ ہو جاتا ہے۔

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا   وصیِ ختمِ رُسل تو ہے بفتوائے یقیں

فرماتے ہیں۔ اے جان کے پناہ دینے والے اور دل و جاں کو فیض پہنچانے والے ختم رسل کا وصی تو ہی ہے اور اس کا فتویٰ یقین تک پہنچ گیا ہے۔

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر   نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

فرماتے ہیں۔ تیرے جسم اطہر کے لئے دوش پیمبر منبر ہے اور تیرے نام نامی کا نگین عرش کی پیشانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے دوشِ پیمبر پر چڑھ کر کعبہ کے بُت توڑے ہیں اور تیرا نام عرش معلیٰ کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔

کس سے ممکن ہو تری مدح بغیر از واجب   شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

فرماتے ہیں۔ تیری مدح خدا تعالیٰ کے سوا کون کر سکتا ہے اِس لئے کہ تیری ذات کو فنا فی اللہ ہو جانے کے سبب سے ایسا ربط حاصل ہو گیا ہے جیسا شمع کو شعلہ سے حاصل ہے یعنی شعلہ ہی سے شمع کو زینت حاصل ہوتی ہے۔

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ   رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریل امیں

فرماتے ہیں۔ تیرے آستان پر جبریلؑ امین نے جو سجدے کئے ہیں وہ سنگ آستاں پر اسی طرح ہویدا ہو گئے ہیں جس طرح آئینہ میں جوہر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گویا حضرت جبریلؑ کے سجدوں کے نشان تیرے سنگِ آستان پر جوہر آئینہ کا کام دیتے ہیں۔

تیرے در کے لئے اسباب نثار آمادہ   خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں

فرماتے ہیں۔ تیرے دروازے پر تصدق ہونے کے لئے یہ سب آمادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو جان و دل و دین بخشے ہیں۔

تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں   تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

فرماتے ہیں۔ تیری مدح سرائی کے لئے دل و جان کام و زبان بن گئے ہیں۔ اور تیرے آداب بجا

لانے کو لوح و قلم دست و جبیں ہو گئے ہیں۔

کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا   کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں

فرماتے ہیں۔ اس کی مداحی کس سے ہو سکتی ہے جو ممدوح خدا ہو اور سوا خدا کے فردوس بریں کی آرائش کس سے ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے مداح کے واسطے بہشت بریں آراستہ کی جاتی ہے۔

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد   کہ سوا تیرے کوئی اسکا خریدار نہیں

فرماتے ہیں۔ جس کا نام اسد اللہ اور تخلص آسد ہے وہ بازار معاصی کی ایک جنس ہے اور گنہگار کا حامی اور خریدار تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔

شوخی عرض مطالب میں ہو گستاخ طلب   ہے ترے حوصلہ فضل پر از بسکہ یقیں

فرماتے ہیں۔ مطالب مدح کا بیان جو اس قدر شوخ واقع ہوا ہے وہ تیرے حوصلے اور بخشش کے یقین کی وجہ سے ہے۔

دے دعا کو مری وہ مرتبہ حسن قبول   کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

فرماتے ہیں۔ میری دعا کو ایسا حسن قبول کا مرتبہ عطا فرمائے کہ میرے ایک ایک حرف پر سو سو بار اجابت آمین کہے۔

غم شبیر سے ہو سینہ یہانتک لبریز   کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں

فرماتے ہیں۔ حضرت شبیر کے غم سے میرے دل کو اس قدر لبریز کر دے کہ خون جگر کے اثر سے میری آنکھیں سرخ رہنے لگیں۔

طبع کو الفت دلدل میں یہ سرگرمی شوق   کہ جہانتک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

فرماتے ہیں۔ تیرے دلدل کی محبت میں مجھ کو یہ شوق پیدا ہو جائے کہ جہاں وہ زمین پر قدم رکھے ہیں اپنی جبیں اس کے سم کے نیچے فرش کر دوں۔

دل الفت نسب و سینہ توحید فضا   نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں

فرماتے ہیں۔ دل میں جوشش محبت ہو اور سینے میں نور عرفاں نگاہ جلوہ پرست ہو اور نفس صدق گزیں ہو۔

صرف اعدا اثر شعلۂ دود دوزخ　　وقف احباب گل و سنبل فردوس بریں

فرماتے ہیں۔ تیرے اعدا کے لئے آگ کا شعلہ اور دوزخ کا دھواں مخصوص ہو جائے اور احباب کے واسطے فردوس بریں کے گل و سنبل وقف کر دیئے جائیں۔

قصیدہ

ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام　　جس کو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام

فرماتے ہیں۔ اے ہلال عید ہم کو اس کا نام بتا دے جس کو تو جُھک کے سلام کر رہا ہے۔

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح　　یہی انداز اور یہی اندام

فرماتے ہیں۔ بچیس اور چھبیس کی شب کو صبح کے وقت ہم نے تجھ کو دیکھا تھا، ایسا ہی نازک اندام اور اسی انداز سے ایک جانب جھکا ہوا تھا۔

بارے دو دن کہاں رہا غائب　　بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

یہ تو بتا دو دن تک کہاں چھپا رہا اور کہاں غائب ہو گیا تھا۔ بندہ عاجز ہے دنوں کی گردش سے ایسا ہوا کرتا ہے۔ بندہ عاجز ہے گردشِ ایام۔ یہ سارا مصرعہ تمثیل ہے۔

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا　　آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تو اُڑ کے کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ آسماں نے تاروں کا جال بچھا رکھا تھا۔

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص　　حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

فرماتے ہیں۔ مرحبا اے خاص الخاص لوگوں کے سرور پہنچانے والے، اور حبذا اے تمام دکمال لوگوں کو نشاط بخشنے والے۔

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

فرماتے ہیں۔ تین دن نظر نہ آنے کے عذر میں عید کا پیغام لے کر آیا ہے تاکہ تجھ سے غیر حاضر رہنے کی باز پُرس نہ ہو۔

اُس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

فرماتے ہیں۔ اُس کو بھولا نہیں کہتے جو صبح کا بھولا شام کو آ جائے یعنی چھبیسویں ستائیسویں کی صبح کو چاند نکل کر پھر اُنتیس یا تیس کی شام کو نظر آتا ہے۔

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

فرماتے ہیں۔ ایک میں ہی نہیں۔ یہ تو سارے زمانے کو معلوم ہو گیا ہے کہ تو بدر سے گھٹتے گھٹتے بالکل مٹ جاتا ہے اور پھر نئے سر سے تیرا آغاز ہو کر تو کمال کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے یعنی بدر بن جاتا ہے۔

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

فرماتے ہیں۔ تو مجھ سے اپنا رازِ دل کیوں چھپاتا ہے۔ کیا تو نے مجھ کو کوئی غمّاز سمجھا ہے۔

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام

فرماتے ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ آج سارے جہان میں ایک ہی بارگاہ ایسی ہے کہ جہاں سے لوگ مرادیں پاتے ہیں۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام

فرماتے ہیں۔ یہ میں نے مان لیا کہ تو اُس کا حلقہ بگوش غلام ہے، تو کیا غالبؔ اُس کا غلام نہیں ہے۔

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

فرماتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تو بھی اِس بات سے واقف ہے کہ مجھ کو بھی اس کی غلامی کا فخر حاصل ہے۔ اِسی وجہ سے میں نے بطور استفہام انکاری تجھ سے دریافت کیا ہے۔

مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ قُرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام

فرماتے ہیں مہر تاباں کو ممدوح کی بارگاہ سے قُرب ہر روزہ ہمیشہ کے لئے حاصل ہو، تو ہو، لیکن اسے ماہ۔

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

تجھ کو یہ رتبہ بجز عید کے کس دن حاصل ہو سکتا ہے۔

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

فرماتے ہیں۔ تو تو اپنے بخل سے میرے ممدوح کا نام بھی مجھ کو نہ بتاتا تھا۔ میں تجھ کو یہ بتائے دیتا ہوں کہ تو پھر اس کے فیض سے ماہ کامل بنا چاہتا ہے۔ اب تو سمجھ گیا ہوگا کہ تجھ سے زیادہ میری وہاں رسائی ہے۔

ماہ بن ماہتاب بن میں کون مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

فرماتے ہیں۔ ماہ بن۔ ماہتاب بن۔ میں کون ہوں جو تجھ پر رشک کروں۔ مجھ کو کیا تو اپنا انعام بانٹ دے گا۔ جو تجھ کو تیری قسمت سے ملے گا وہ تیرے ہی پاس رہے گا۔ اِس شعر کا بیان ندرت سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سارا قصیدہ میرزا صاحب نے ایسی زبان میں لکھا ہے کہ جس پر قیامت تک اُردو زبان فخر کرے گی۔

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے اور کے لین دین سے کیا کام

فرماتے ہیں۔ کہیں یہ خیال نہ کرنا کہ مجھ کو تجھ پر رشک آتا ہے اور میں عید کے انعام سے محروم ہی رہ جاؤں گا۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تجھ کو تیری حیثیت سے موافق انعام ملے گا اور مجھ کو میرے رتبے کے قابل خلعت و جواہر عطا ہوگا۔

ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

فرماتے ہیں۔ میں بخشش خاص کا تمنائی ہوں۔ اگر تجھ کو اُمیدِ رحمتِ عام ہے۔

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام

فرماتے ہیں۔ جو ممدوح تجھ کو ایسی روشنی بخشے گا جو ضیا بخش عالم ہوگی۔ کیا مجھ کو شیشہ کی لال پری جو چاندنی رات کو اور زیادہ روشن کردے گی نہ دے گا۔

جبکہ چودہ منازلِ فلکی ۔۔۔ کرچکی قطع تیری تیزیٔ گام

فرماتے ہیں۔ جب تو تیز رفتاری کے ساتھ آسمان کی چودہ منزلیں طے کرلے گا اور چودھویں رات کا ماہ کامل بن جائے گا۔

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر ۔۔۔ کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

اور تیرے پرتو سے کوچے اور محل سرا اور صحن اور در و بام پر چاندنی پھیل جائے گی تو

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز ۔۔۔ اپنی صورت کا اک بلوریں جام

اِس میرے ہاتھ میں بھی ایک جام بلورین مے انگور سے چھلکتا ہوا تیری شکل کا روشن اور منور ہوگا۔

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا ۔۔۔ توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

فرماتے ہیں، جام شراب اور شبِ ماہ کا ذکر آتے ہی پھر غزل سرائی میں نے شروع کردی گویا توسن طبع باگ کا اشارہ چاہتا تھا۔ اشارہ پاتے ہی چل نکلا۔

غزل

زہرِ غم کرچکا تھا میرا کام ۔۔۔ تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

فرماتے ہیں۔ میرے حق میں تو غم ستم قاتل ثابت ہو ہی چکا تھا، تجھ کو کس بیوقوف نے میرے قتل کرنے کی صلاح دی ناحق ایک تیر لگاکر بدنام ہوا۔

ہے پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں ۔۔۔ غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام

فرماتے ہیں۔ حرام تو شراب بھی ہے اور غم سے زیست بھی حرام ہے پھر میں کیوں نہ شراب پیوں اِس سے کسی قدر غم غلط تو ہوجاتا ہے۔ اگر شراب کو حرام جان کر شراب پینے سے پرہیز کرتا ہوں تو غمِ زیست حرام کئے دیتا ہے۔ لاجواب شعر لکھا ہے۔ نئی قسم کی شوخی ہے۔

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام

فرماتے ہیں۔ بوسہ تو کب وہ دیتا ہے۔ ہم تو اِسی بات کو غنیمت سمجھے ہوئے ہیں کہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ گالیاں کھانے میں بھی ہم کو لطف حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے تو وہ اپنے منہ سے گالیاں بھی نہ دے۔

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

فرماتے ہیں۔ جس طرح بجائے کعبہ کے دیر میں احرام باندھ لیا ہے اسی طرح ایک نہ ایک دن دیر کے بدلے کعبہ میں جاکر ناقوس پھونکیں گے۔

اِس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام

فرماتے ہیں۔ مجھ کو وہ جام عرفاں نصیب ہے جس شراب معرفت سے بیخود ہو کر آسمان رقص کر رہا ہے۔

بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

فرماتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ بوسہ کے دینے میں ان کو انکار ہے جن کو دل لینے میں ضد کرنے کی عادت تھی۔

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصّہ آئے کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

بالکل نئی شوخی میرزا صاحب نے اس مقطع میں برتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے تو صرف چھیڑنے کی غرض سے کہ ان کو غصّہ آئے اور وہ مجھ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیں۔ میں نے اپنا نام غالبؔ رکھ لیا ہے۔ ورنہ میں تو ان کے حُسن دلکش سے مغلوب ہو چکا ہوں، غالبؔ کیونکر بن سکتا ہوں۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ اے پری چہرہ پیک تیز خرام

یہاں سے پھر بادِ نو کی جانب مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ میں تو سب کچھ کہہ چکا۔ اب اے پری چہرہ پیک تیز خرام تو بتا کہ تو کیا کہتا ہے

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

بہرام فلک مریخ کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ وہ کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا مہ و مہر اور زہرہ و بہرام ہیں۔

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

فرماتے ہیں۔ تو اگر نہیں جانتا تو مجھ سے سُن، میرے شہنشاہ بلند مقام کا نام۔

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام

فرماتے ہیں۔ وہ دل و چشم کے قبلہ ہیں۔ یعنی چشم اُمید ان ہی کو دیکھتی ہے اور دل تمنائی انھیں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اُن کا اسم گرامی بہادر شاہ ہے اور وہ مظہر ذوالجلال والاکرام ہیں۔

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام

اور یہ دونوں صفتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیِ الہام

اور وہ بادشاہ ایسا ہے کہ جس کا ہر فعل اعجاز نما ہے اور جس کا ہر قول الہام ثابت ہوتا ہے۔

بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رستم و سام

فرماتے ہیں۔ بزم میں وہ قیصر و جم کا میزبان ہے اور رزم میں رستم و سام کا استاد ہے۔ گویا قیصر و جم اِس سے فیض پاتے ہیں اور رستم و سام اس سے جنگ کے طریقے سیکھتے ہیں۔

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام

یہاں سے مدح جاری شروع ہو گئی ہے۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ عارفانہ کلام

فرماتے ہیں۔ خدا تجھ کو نظر بد سے بچائے۔ تیری خسروانہ شان آنکھوں میں کھبی جاتی ہے اور ماشاءاللہ تیرا عارفانہ کلام دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔

جاں نثاروں میں ترے قیصرِ روم　　جرعہ خواروں میں ترے مرشد جام

فرماتے ہیں۔ تیرے جاں نثاروں میں قیصرِ روم بھی شمار کیا جاتا ہے اور تیرے جرعہ خواروں میں جمشید بھی داخل ہے۔

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے　　ایرج و تور و خسرو و بہرام

فرماتے ہیں۔ یہ سب بادشاہ جن کا مصرعہ ثانی میں نام لیا گیا ہے تجھ کو وارث ملک جانتے ہیں،

زور بازو میں مانتے ہیں تجھے　　گیو و گودرز و بیژن و رہام

مصرعہ ثانی میں زور آور اور مشہور پہلوانوں کا نام لیا گیا ہے۔

قطعہ

مرحبا موشگافئ ناوک　　آفریں آبدارئ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف　　تیغ کو تیری تیغ خصم نیام

دونوں شعر دست و گریباں ہیں اور لف و نشر مرتب۔ فرماتے ہیں۔ تیرا تیر ایسا بال کی کھال کھینچنے والا ہے کہ دشمن کا تیر گویا اس کا نشانہ ہے۔ اور تیری شمشیر اس قدر آبدار ہے گویا دشمن کی تلوار اس کا نیام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا تیر دشمن کے تیر کو نشانہ کی طرح اڑا دیتا ہے اور تیری تلوار دشمن کی تلوار میں نیام کی طرح اتر جاتی ہے۔

قطعہ

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند　　برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا　　تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

فرماتے ہیں۔ رعد کا دم بند کر رہی ہے۔ تیرے فیل فلک شکوہ کی چنگھاڑ اور بجلی کو الزام دے رہا ہے۔ تیرے رخش سبک عناں کا خرام یعنی بجلی سے کہتا ہے کہ تو ایسی سست رفتار ہے کہ میرے ساتھ دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔

قطعہ

فن صورت گری میں تیرا گرز گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

فرماتے ہیں۔ تیرے گرز کو مصوری و صورت گری آتی ہے اور اس فن میں کمال حاصل ہے۔ وہ ایک ضرب میں دشمن کے سر و تن کو اس طرح ملا دیتا ہے کہ ادغام کی تصویر آنکھوں کے روبرو کھنچ جاتی ہے۔

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے صفحہ ہائے لیالی و ایام

فرماتے ہیں۔ ازل کے دن جو احکام رات اور دن کے اوراق پر رقم ہوئے تھے۔

اور ان اوراق میں بکلکِ قضا مجملاً مندرج ہوئے احکام

وہ مجمل طور پر رقم ہوئے تھے۔ ان احکام کی تفصیل ابدالآباد تک ہوتی رہے گی۔ ان ہی احکام کی تفصیل میں یہ حکم بھی مندرج ہوئے تھے کہ

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

معشوقوں کو عاشق کش لکھ دیا اور عاشقوں کو دشمن کام لکھ دیا۔ دشمن کام وہ شخص جو دشمنوں کے حسب مراد خستہ و دل شکستہ ناکام و نامراد ہو۔

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں گنبد تیز گرد نیلی فام

آسمان کی نسبت یہ حکم نافذ ہوا کہ لوگ اس کو گنبد تیز گرد نیلی فام کے نام سے مشہور کریں۔

حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں خال کو دانہ اور زلف کو دام

اسی کے ساتھ یہ حکم بھی لکھا گیا کہ معشوق کے خالِ عارض کو دانہ اور زلف کو دام لکھیں۔

آتش و آب و باد و خاک نے لی وضع سوز و نم و رم و آرام

فرماتے ہیں۔ آگ۔ پانی۔ ہوا۔ خاک کے حصہ میں یہ باتیں آئیں کہ ان کی وضع سے سوز و نم و رم و آرام ظاہر ہو رہا ہے۔ یعنی آگ کو سوز دیا گیا۔ پانی کو نمی عطا ہوئی۔ ہوا کو بھاگنا پھرنا ملا اور خاک کو آرام بخشا گیا۔

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام

فرماتے ہیں۔ مہرِ رخشاں کو خسروِ روز کا خطاب عطا ہوا اور ماہِ تاباں کا نام کوتوال شام قرار پایا۔

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی دی بدستور صورتِ ارقام

فرماتے ہیں۔ تیرے فرمان سلطنت کو حسبِ ضابطہ صورتِ ارقام عطا ہوئی۔ دستور فارسی میں وزیر کو بھی کہتے ہیں۔

کاتبِ حکم نے بموجب حکم اِس رقم کو دیا طرازِ دوام

فرماتے ہیں کاتبِ قدرت نے تیرے واسطے فرمانِ سلطنت لکھ کر اس پر دوام دولت کا طغرہ بنا دیا۔

ہے ازل سے روائیِ آغاز ہو ابد تک رسائیِ انجام

یہ شعر دعائیہ ہے۔ روائی امکان و جواز کے معنی پر استعمال ہوتا ہے۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔ میرزا صاحب کا یہ قصیدہ ان کے کمال شاعری کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ سو برس پہلے اردو زبان میں ایسی تشبیب اور ایسی مدح لکھنی جس کا جواب آج تک بھی کوئی نہیں لکھ سکا۔ کارے دارد کا مصداق ہے۔

قصیدہ

صبح دم دروازۂ خاور کھلا مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

فرماتے ہیں۔ صبح ہو گئی اور مشرق کا دروازہ کھل گیا یعنی جس دریچہ سے مہرِ عالمتاب کا جلوہ نظر آتا ہے وہ منظر ظاہر ہو گیا۔

خسروِ انجم کے آیا صرف میں شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

فرماتے ہیں خسروِ انجم یعنی آفتاب کی ضیاء میں ستارے چھپ گئے۔ گویا خورشید

تاباں نے گنج گوہر کو صرف کر دیا۔

وہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود　　صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا

سیمیا وہ فن ہے جس کے ذریعہ سے اشکال وہمی وغیر واہمی نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ مہ و اختر جو رات کو نظر آرہے تھے صبح ہو جانے پر سیمیائی اشکال کی طرح نظر سے پوشیدہ ہو گئے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھُلا

فرماتے ہیں۔ ستاروں کی اصل وحقیقت کچھ اور ہے اور نظر کچھ اور طریقہ پر آتے ہیں، گویا یہ ایسی قسم کے بازیگر ہیں جو کھُلا ہوا دھوکہ دیتے ہیں۔

سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو　　موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا

فرماتے ہیں۔ سطح گردوں پر رات کو ستارے نہ تھے بلکہ معشوق کا زیور تھا جو موتیوں سے بنایا گیا تھا اور وہ قدر و قیمت میں ستاروں سے بہتر تھا۔ یہاں تشبیہ نے ستاروں کو آفتاب روز سے زیادہ چمکا دیا ہے۔

صبح آیا جانبِ مشرق نظر　　اِک نگارِ آتشیں رخ۔ سر کھُلا

فرماتے ہیں۔ شب کو تو آسمان پر یہ کیفیتیں نظر آرہی تھیں اور صبح کو یہ دیکھا کہ ایک معشوق آتشیں رخسار برہنہ سر سامنے موجود ہے۔

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر　　بادۂ گلرنگ کا ساغر کھُلا

فرماتے ہیں۔ وہ نگار آتشیں رخسار گویا ایک جادو کا پتلا تھا۔ جب ہم نے ردِ سحر کا عمل پڑھا تو یہ ثابت ہوا کہ بادۂ گلرنگ کا ساغر ہے۔

لا کے ساقی نے صبوحی کیلئے　　رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا

اور اس ساغر کو ساقی نے صبوحی کے واسطے لا کر رکھ دیا ہے۔ جو ایک سونے کے جام کی شکل میں بغیر سرپوش کے نظر آرہا ہے۔

بزم سلطانی ہوئی آراستہ   کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

تشبیب ختم ہوئی۔ گریز میں فرماتے ہیں کہ اس تمہید میں صبح کا بیان صرف اس غرض سے کیا گیا تھا کہ جب صبح ہوگئی تو بزم سلطانی آراستہ ہوگئی گویا امن امان کے کعبہ کا دروازہ کھل گیا۔

تاج زریں مہر تاباں سے سوا   خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھُلا

مُنہ پر کھُلنا۔ محاورہ ہے۔ اس کے معنی زیب دینے کے ہیں۔ فرماتے ہیں، مہر تاباں کا تاج زریں اتنا زیبندہ نہ تھا جتنا بادشاہ عالم کا تاج زریں بادشاہ کے منہ پر زیب دیتا ہے۔

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے   رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھُلا

فرماتے ہیں۔ میرا بادشاہ بہادر شاہ روشن دل ہے۔ اور روشن دلی کی دلیل یہ ہے کہ ہستی کا راز اس پر تمام و کمال کھُل گیا ہے۔

وہ کہ جسکی صورتِ تکوین میں   مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھُلا

فرماتے ہیں۔ وہ ذات ستودہ صفات ایسی ہے کہ جس کی تکوین میں نو آسمانوں اور سات ستاروں کا مقصدِ تخلیق ظاہر ہوتا ہے۔ قدیم استادوں کے ہاں اعلان نون بعد اضافت زیادہ عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے   عقدۂ احکام پیغمبر کھُلا

فرماتے ہیں۔ وہ ایسا بادشاہ ہے کہ اس کی تاویل کے ناخن سے عقدۂ احکام پیغمبر کھُل گیا ہے۔ ناخن تاویل اور عقدۂ احکام دونوں استعارے ہیں۔

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام   اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا

فرماتے ہیں، سب سے پہلے دارا کا نام نکلا ہے۔ جب اسکی فوج کے سرہنگوں کا دفتر کھولا گیا ہے۔ مشہور ہے کہ دارا کے پاس بے انتہا فوج تھی اور سرہنگ کے معنی ہراول فوج یا مقدمۃ الجیش لشکر کے ہیں۔

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے   واں لکھا ہے، چہرۂ قیصر کھُلا

فرماتے ہیں۔ اُس کے روشناسوں کی یعنی جاننے والوں کی جہاں فہرست رقم ہے وہاں چہرۂ قیصر یعنی حلیۂ قیصر واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ مدح میں یہ دونوں شعر بے مثل ہیں اور دونوں بادشاہوں کی خصوصیت ان کے صفات کی وجہ سے لازمی اور ضروری تھی۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور نام مثل سکندر یا قیصر رقم کر دیئے جاتے تو یہ دونوں شعر اپنے بلند درجوں سے گر جاتے۔

قطعہ

توسنِ شہ میں ہے، وہ خوبی کہ جب   تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھُلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب   تو کہے بُت خانۂ آذر کھُلا

فرماتے ہیں۔ توسنِ شہ میں وہ خوبیاں ہیں کہ جب تھان سے وہ غیرتِ صرصر یعنی ہوا سے زیادہ چالاک گھوڑا کھُلتا ہے تو اُس کے نقش پا میں ایسی دلفریب شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آذر بُت تراش کا بُت خانہ سامنے نمودار ہو گیا ہے۔

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی   منصبِ مہر و مہ و محور کھُلا

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کی تربیت سے مجھ کو یہ علم حاصل ہو گیا ہے کہ آفتاب کا منصب اور ماہ کا عہدہ اور محور کی حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے۔ محور اس لکیر کو کہتے ہیں جو کرۂ متحرک کے درمیان میں یعنی کرۂ قطبین کے بیچ میں موہوم سی ہوتی ہے۔

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک   میری حدِّ وسع سے باہر کھُلا

فرماتے ہیں۔ میری لاکھوں مشکلیں جن کا حل ہونا میری استطاعت و قدرت سے باہر تھا وہ آسانی سے حل ہو گئیں۔

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید   کس نے کھولا، کب کھُلا، کیونکر کھُلا

فرماتے ہیں۔ میرا دلِ وابستہ تو ایک ایسا قفل تھا کہ جس میں کوئی کُنجی ہی نہیں لگتی تھی۔ مجھ کو

حیرت ہے کہ اِس قفل کو کِس نے کھولا اور یہ کب کھُلا اور یہ کِس طرح کھُل گیا۔

باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار　　مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھُلا

کھُلنے کے معنی بے تکلف ہو کر باتیں کرنے کے ہیں مگر یہاں اس کے دوسرے معنی لئے گئے ہیں فرماتے ہیں۔ باغ معنی کی بہار دکھاؤں گا، اگر بادشاہ نے میرے حال پر نگاہ توجہ فرمائی۔

ہو جہاں گرم غزلخوانی نفس　　لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا

فرماتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اِس موقع پر میں ایک غزل بھی سُنانی شروع کر دوں اور میرے مضامین کی خوشبو سے لوگوں کو یہ گمان گزرے کہ عنبر کا ڈبہ کھول دیا گیا ہے۔

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھُلا　　کاش کے ہوتا قفس کا در کھُلا

فرماتے ہیں۔ افسوس ہے کُنج قفس میں اس طرح سے میں پر کھُلا ہوا بیٹھا رہوں۔ کاش قفس کی کھڑکی کھُلی ہوئی ہوتی اور میں اُڑ جاتا۔

ہم پکاریں اور کھُلے یوں کون جائے　　یار کا دروازہ پائیں گر کھُلا

فرماتے ہیں۔ ہمارا اعزاز یہ چاہتا ہے کہ ہم یار کے دروازے پر جا کر آوازیں دیں اور ہمارے واسطے دروازہ کھولا جائے۔ ایسی حالت میں ہمارے جانے کا لطف ہے۔ یوں ہماری بلا جاتی ہے کہ اُس کا دروازہ کھُلا ہوا دیکھ کر ہم جا کر شریکِ صحبت ہو جائیں۔ اِس طرح عام لوگ جاتے ہیں۔

ہم کو ہے اِس رازداری پر گھمنڈ　　دوست کا ہے راز دشمن پر کھُلا

فرماتے ہیں۔ افسوس ہے ہم کو اِسی رازداری پر گھمنڈ ہے اور ہم یہی سمجھتے ہیں کہ سِوا ہمارے کوئی شخص راز دوست سے آگاہ نہیں ہے حالانکہ دوست کا راز دشمن پر کھُل گیا ہے۔ تُف ہے ہماری رازداری پر۔

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ　　زخم لیکن داغ سے بہتر کھُلا

فرماتے ہیں۔ کہ سچی بات تو یہ ہے کہ دل پر داغ بہت ہی زیب دیتا تھا۔ لیکن زخم داغ سے

بھی بڑھ کر زیبندہ ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں زخم کا کھُلنا ایک دوسرے معنی بھی دیتا ہے جس کا لطف اِس لطفِ معنی سے بالاتر ہے۔

ہاتھ سے رکھدی کب ابروُنے کمان
کب کمر سے غمزہ کا خنجر کھُلا

ابرو جو خود کمان سے مشابہ ہے اس کو کماندار کہنا اور غمزہ جس کو خنجر سے تشبیہ دی جاتی ہے اس کو خنجر گذار لکھنا میرزا صاحب کی جدّتِ طبع کی دلیل ہے۔ مطلب شعر کا صاف ہے یعنی ابروئے یار اور غمزۂ دوست ہر وقت ہمارے قتل کے درپے رہتے ہیں۔

مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھُلا

بدرقہ کے معنی رہبر اور نگہبان قافلہ کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ مفت کا رہبر کس کو بُرا معلوم ہوتا ہے باوجودیکہ رہروی میں رہبر کا بھرم کھُل گیا۔ یعنی ہم نے یہ جان لیا کہ وہ آشنائے منزل مراد ہے لیکن پھر بھی ایک آدمی تو ساتھ چلنے کے لیئے بغیر داموں کا مل گیا، کیا بُرا ہے۔

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھُلا

فرماتے ہیں۔ بارانِ اشک سوزِ دل کیونکر بجھا سکتا ہے۔ جب یہ حالت ہو کہ اگر مینہ برسنا دم بھر کے واسطے بند ہو جاتا ہے تو آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رونے سے دل کی تپش تھمی رہتی ہے۔ اِدھر آنسو بند ہوئے اور اُدھر دل میں شعلہ بھڑکا۔

نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا

شادیِ مرگ ہو جانے کو کِس سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میرزا صاحب کے نشتروں میں کا نشتر ہے۔

دیکھیو غالب سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

فرماتے ہیں۔ خبردار اگر کوئی غالب سے اُلجھے گا تو وہ اُس کے دھرّے بکھیر دے گا۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھُلا

فرماتے ہیں۔ پھر مدح سلطان کی طرف طبیعت رجوع ہوئی اور مدح کے شعر لکھنے شروع

کئے اور ایک ایک شعر چاند سورج کا مقابلہ کر رہا ہے۔

خامہ نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھلا

فرماتے ہیں۔ قلم اُٹھاتے ہی طبیعت شعر گوئی کی طرف رجوع ہو گئی۔ گویا اِدھر جہاز کا لنگر اُٹھایا اور اُدھر بادبان کھل گیا۔ بحرِ معنی میں کشتیِ سخن رواں ہو گئی۔

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — عرض سے یاں رتبۂ جوہر کھلا

فرماتے ہیں۔ یہاں مدح سے ممدوح کی شان و شکوہ ظاہر ہو گئی۔ گویا عرض سے جوہر کا رتبہ کھل گیا۔ جوہر کا لفظ یہاں دُرِ بے بہا سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

فرماتے ہیں۔ آفتاب نشانِ لشکر کے رعب و داب سے لرزاں ہو گیا اور آسمان کو چکر آنے لگے۔

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوِ پایۂ منبر کھلا

فرماتے ہیں۔ منبر کا رتبہ اِس سبب سے بلند ہے کہ اس پر خطیب بادشاہ کا نام خطبہ میں پڑھتا ہے۔

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیارِ آبروئے زر کھلا

فرماتے ہیں۔ زر و سیم کی آبرو اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ اِس پر بادشاہ کا سکہ ہے۔

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

فرماتے ہیں۔ شاہ کے روبرو آئینہ رکھا ہوا ہے۔ اتنے برسوں کے بعد جا کر سکندر کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوا ہے یعنی اس نے اسی آئینہ داری کی تمنا میں آئینہ بنایا تھا۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

فرماتے ہیں۔ ملک کا وارث خاص میرا ممدوح ہونا چاہیئے تھا۔ اب کہیں جا کر حق بحقدار رسید کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ طغرل اور سنجر جو بادشاہ بن بیٹھے تھے وہ ان کا فریب تھا، جو اب کھل گیا۔

ہو سکے کیا مدح ہاں اِک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھُلا

فرماتے ہیں۔ خوش نصیبی سے میرا نام اس کے ممدوحوں میں مشہور ہو گیا ہے اور لوگ جانتے ہیں کہ اس نے دفتر کے دفتر بادشاہ کی مدح میں رقم کر دیئے ہیں، لیکن جیسی مدح رقم ہونی چاہیئے تھی وہ مجھ سے رقم نہ ہو سکی۔

فکر اچھی پر ستائش ناتمام
عجز و اعجاز ستائش گر کھُلا

فرماتے ہیں۔ فکر تو اچھی ہے لیکن مدح ناتمام ہے، وہ پوری پوری ادا نہیں ہو سکی اعجاز مداح کا عجز ظاہر ہو گیا۔ فکر کے کامل تر ہونے سے اعجاز بیانی کا دعویٰ کرنا اور مدح کے ناتمام رہ جانے سے عجز کا اظہار کرنا یہ دونوں باتیں اِس شعر میں ایسی بدیع اور نادر اور اِس خوبی کے ساتھ ادا ہوئی ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

جانتا ہوں خطِ لوحِ ازل
تم پہ اے خاقان نام آور کھُلا

فرماتے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ تم پر لوحِ ازل کا حال واضح اور منکشف ہے اِس لئے یقین ہے کہ میرا حال بھی تم سے پوشیدہ نہ ہو گا، اِس صورت میں مجھ کو کیا ضرورت ہے کہ میں عرضِ حال کروں۔

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھُلا

فرماتے ہیں۔ خدا کرے تم اس وقت تک صاحبقرانی کرتے رہو جب تک طلسمِ روز و شب کا دروازہ کھُلا ہوا ہے۔ صاحبقران فاتح اور جلیل القدر بادشاہ کو کہتے ہیں لفظی معنی صاحبقران کے یہ ہیں کہ وہ بادشاہ جو قرآن عظمیٰ کے وقت پیدا ہو۔

مثنوی

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

فرماتے ہیں۔ اے دل دردمند اور ہاں اے دلِ زمزمہ ساز تو کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز۔

خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا شاخِ گُل کا ہے گُلفشاں ہونا

فرماتے ہیں۔ فکرِ سخن کے وقت خامہ کا صفحہ کاغذ پر چلنا بعینہٖ ایسا ہے جیسے شاخِ گُل سے بہار کے موسم میں پھولوں کا جھڑنا۔

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے نکتہ ہائے خِرد فزا لکھئے

اپنے دل سے کہتے ہیں کہ تو مجھ سے یہ کیا دریافت کرتا ہے کہ کیا لکھنا چاہیئے عقل بڑھانے والے نکات لکھنے چاہئیں۔

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

پھر سوچ کر جواب دیتے ہیں کہ اچھا آموں کی کچھ تعریف لکھنی چاہیئے اور ایسی خوبی کے ساتھ لکھنی چاہیئے کہ خامہ نخلِ رطب فشاں کا مدمقابل بن جائے یعنی بہت ہی شیریں مضامین رقم ہوں۔

آم کا کون مردِ میداں ہے ثمر و شاخ گوئے چوگاں ہے

فرماتے ہیں۔ آم کا کون مردِ میداں یعنی مدمقابل کون ہے۔ ثمر و شاخ گوئے و چوگاں کا حکم رکھتے ہیں۔

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں آئیے یہ گوئے اور یہ میداں

فرماتے ہیں۔ انگور کی بیل کے جی میں کیوں ارمان باقی رہے۔ میدان کارزار میں آم سے چوگاں بازی کر لے۔

آم کے آگے پیش جلے خاک پھوڑتا ہے جلے پھپولے تاک

فرماتے ہیں۔ آم کے آگے پیش تو خاک بھی نہیں جاتی۔ اپنے جلے ہوئے دل کے پھپولے تاک انگور پھوڑ رہا ہے۔

نہ چلا جب کسی طرح مقدور بادۂ ناب بن گیا انگور

فرماتے ہیں۔ جب کسی طرح آم کا مقابلہ نہ کر سکا تو انگور ہار کر شراب ناب بن گیا۔

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے شرم سے پانی پانی ہونا ہے

فرماتے ہیں۔ انگور کا بادۂ ناب بن جانا گویا شرمندگی سے پانی پانی ہو جانا ہے اور مجبوری سے انگور اپنی جان کھوتا ہے۔

مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے ۔۔۔ آم کے آگے نیشکر کیا ہے

فرماتے ہیں۔ مجھ سے پوچھو، تم ابھی اس کی حقیقت سے خبردار نہیں ہو۔ آم کے سامنے نیشکر ایک بے قدر چیز ہے۔

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار ۔۔۔ جب خزاں آئے تب ہو اسکی بہار

فرماتے ہیں۔ گنے میں نہ پھول آتا ہے نہ اس میں شاخیں ہیں نہ پتے ہیں نہ پھل ہیں اور ان سب سے زیادہ برائی کی بات یہ ہے کہ خزاں کا موسم اس کی بہار کا زمانہ ہے۔

اور دوڑائیے قیاس کہاں ۔۔۔ جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

فرماتے ہیں۔ اور کہاں قیاس دوڑا کر آم کی شیرینی کا جواب پیدا کیا جائے۔ جان کو شیریں بیان کیا جاتا ہے، مگر اس میں ایسی مٹھاس کہاں ہوتی ہے۔

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی ۔۔۔ کوہکن باوجود غمگینی

فرماتے ہیں۔ اگر جان میں ایسی شیرینی ہوتی تو کوہکن یعنی فرہاد باوجود غمگین ہونے کے۔

جان دینے میں اس کو یکتا جان ۔۔۔ پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

جان دینے میں اس کو یکتائے روزگار اور بے مثل زمانہ فرض کر لیا جائے تو بھی وہ اس آسانی سے جان نہ دے سکتا۔ یعنی اگر جان میں شیرینی ہوتی تو وہ اِس آسانی سے جان نہ دیتا۔

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ۔۔۔ کہ دواخانۂ ازل میں مگر

مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ثمر یعنی آم دواخانہ ازل کا بنایا ہوا ہے اور یہ اِس طرح بنایا گیا ہے کہ

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام ۔۔۔ شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

آتشِ گل پر قند کا قوام پکایا گیا ہے اور شیرے کے تار کا نام ریشہ رکھ دیا ہے۔

یا یہ ہوگا کہ فرطِ راحت سے　　　باغبانوں نے باغِ جنت سے

یا یہ بات ہوگی کہ جوشِ محبت سے باغبانوں نے باغِ جنت سے۔

انگبیں کے بحکمِ رب النّاس　　　بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

شہد کو خدائے تعالیٰ کے حکم سے گلاسوں میں بھر کر اور ان پر مُہر لگا کر دنیا میں بھیج دیا ہے۔

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات　　　مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

یا یہ بات ہے کہ خضر نے شاخِ نبات لگائی ہے اور مدت تک اس میں آبحیات دیا ہے۔

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل　　　ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

جب جاکر کہیں یہ درخت پھل لایا ہے ورنہ ہم کہاں اور یہ نخل کہاں۔

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس　　　رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا اگر اِک بار　　　پھینک دیتا طلائے دست افشار

بیان کیا جاتا ہے کہ خسرو پرویز کے پاس اِس قسم کا کندن تھا کہ ہاتھ سے دبا کر جو چیز اس کی چاہتے تھے بنا لیتے تھے۔ پرویز نے اسی کا ترنج بنوایا تھا۔ کھانے کے وقت وہ ترنج دسترخوان پر رکھدیا جاتا تھا۔ اس کے بعد کسریٰ نے اسی کو سونے کا ساگ بنوایا اور دسترخوان کی زینت اور آرائش کا اس سے کام لیا۔ دست افشار اسی واسطے میرزا صاحب لکھتے ہیں کہ وہ سونا موم کی طرح دبانے سے دب جایا کرتا تھا۔ باقی دونوں شعروں کے معنی صاف ہیں۔

رونقِ کارگاہ برگ و نوا　　　نازشِ دودمانِ آب و ہوا

برگ و نوا سامان کے معنی پر بھی استعمال ہوتا ہے اور برگ کا لفظ درخت کے ساتھ میں بھی مناسبت رکھتا ہے اور نوا سے طائرانِ خوش الحان کی آواز بھی مراد ہے۔

رہروِ راہِ خلد کا توشہ!　　　طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

فرماتے ہیں۔ آم رہروِ راہِ خلد کا توشہ بھی ہے اور طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ بھی ہے مراد یہ ہے کہ آم کھاتے کھاتے اگر انسان مر بھی جائے تو سیدھا جنت میں پہنچ جاتا ہے

اور طوبےٰ اور سدرہ بھی دانہ انبہ کو عزیز رکھتے ہیں۔

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم　　　ناز پروردۂ بہار ہے آم

فرماتے ہیں۔ آم بڑا ساز و سامان رکھنے والا پھل ہے اور بہار نے بڑے نازوں سے اس کو پالا ہے۔ مصرعہ ثانی کی داد کچھ اہلِ زبان ہی دے سکتے ہیں۔

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو　　　نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

یہ دو باغ باغِ سلطاں مشہور تھے جن میں ایک باغ کا نام باغ حیات بخش تھا اور دوسرے باغ کا نام مہتاب باغ تھا۔ باغ حیات بخش قلعہ معلیٰ کے اندر تھا اور مہتاب باغ زیرِ فصیل کھائی کے اوپر واقع تھا۔ ان باغوں کا آم سلاطین اور بیگمات کے علاوہ کسی کو کھانا نصیب نہ ہوتا تھا۔ ان باغوں میں بہت سے درخت ابوظفر بہادر شاہ آخر بادشاہ دہلی کے ہاتھ کے لگائے ہوئے تھے۔ میرزا صاحب اس شعر میں انھیں آموں کی نسبت نو برِ نخل باغ سلطاں خطاب کر کے لکھتے ہیں۔

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد　　　عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد

فرماتے ہیں۔ وہ بادشاہ کہ ولایت عہد و پیمان کا وارث ہے اور اسی کے عدل اور انصاف سے زمانہ و وقت کی حمایت ہے۔

فخرِ دیں عزّ و شانِ جاہ و جلال　　　زینتِ طینت و جمال و کمال

فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کی ذات والاصفات دین کے واسطے باعثِ فخر و عزّت اور جاہ و جلال کی شان اس سے بڑھ گئی ہے اور نیک طینتی کی وہ زینت ہے اور کمال کے واسطے وہ جمال کا حکم رکھتا ہے۔

کار فرمائے دین و دولت و بخت　　　چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

فرماتے ہیں۔ دین و دولت و بخت کا وہ بادشاہ ہے اور تاج و مسند و تخت کی عزّت میں اُس نے اضافہ کر دیا ہے۔

خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے — سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہے

فرماتے ہیں۔ اس کے سایہ میں جو شخص آجائے وہ بادشاہ بن جائے اور مخلوق کے سر پر وہ ظلِ اللہ کا حکم رکھتا ہے۔

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور — جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوند بندہ پرور کو — وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دلشاد و شادماں رکھیو — اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

یہ تینوں شعر دعائیہ ہیں اور مطلب ان کا صاف ہے۔

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر — اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ عدیل

فرماتے ہیں۔ اے شہنشاہِ فلک رتبہ تو بے مثل اور بے نظیر ہے۔ دوسرے مصرع میں کہتے ہیں۔ اے بادشاہ تیری عادت کرم کرنے کی ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تو عادل زمانہ ہے۔

پانوں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

فرماتے ہیں۔ تختِ شاہی تیرے قدموں سے اپنا سر ارادت ملتا رہتا ہے۔ اور تیرے سر اقدس سے تاجِ شاہی سعادت حاصل کرتا رہتا ہے۔

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام — تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

فرماتے ہیں۔ تیری گفتار میں یہ اعجاز ہے کہ الہامی دقیق باتوں کو الجھی ہوئی زلفوں کی طرح سلجھا دیتی ہے اور تیرے قلم کی رفتار بازوئے جبریل کی جنبش سمجھی جاتی ہے۔

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

فرماتے ہیں۔ جن لوگوں نے قربِ کلیم اور بذلِ خلیل کی کیفیت صرف کانوں سے سُنی تھی آنکھوں سے نہ دیکھی تھی، اُنھوں نے تیری وجہ سے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی کہ تیری ذات میں یہ دونوں صفتیں نظر آتی ہیں۔

بہ سخن اوج دہِ مرتبہٴ معنی و لفظ　　بکرم داغ نہ ناصیہٴ قلزم و نیل

فرماتے ہیں۔ تیرے کلام سے معنی و لفظ کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ اور تیرے کرم سے یعنی تیرے جود و بخشش سے دریائے قلزم و دریائے نیل شرما جاتے ہیں۔

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر　　تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر　　زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

فرماتے ہیں۔ اِس لئے کہ تیرے وقت میں عیش و طرب کی ترقی ہو۔ ماہ نے برجِ ثور سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ اور اِس واسطے کہ تیرے زمانہ میں رنج و الم کم ہو جائے، زہرہ نے برجِ حوت میں داخل ہونا ترک کر دیا ہے۔

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین　　تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحّم مرے جینے کی نوید　　تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

یہاں اقبال کے معنی التفات کرنے کے ہیں۔ باقی دونوں شعروں کا مطلب صاف ہے۔

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں　　چرخِ کجباز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل

فرماتے ہیں۔ میری بدنصیبی یہ چاہتی ہے کہ مجھ کو کہیں امن و امان میسّر نہ آئے۔ اور آسمان کی گردشیں یہ چاہتی ہیں کہ مجھ کو ذلیل کریں۔

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتہٴ اوقات میں گانٹھ　　پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

مطلب یہ ہے کہ پہلے ناخنِ تدبیر کو ناقابل عقدہ کشائی کر دیا گیا ہے، اس کے بعد سر رشتۂ اوقات میں گرہ لگائی ہے۔

تپشِ دل نہیں بے رابطہٴ خوفِ عظیم　　کششِ دم نہیں بے ضابطہٴ جرِّ ثقیل

فرماتے ہیں۔ تپشِ دل خوفِ عظیم سے خالی نہیں ہے۔ میرے واسطے سانس لینا بھی جرِ ثقیل سے کم نہیں ہے۔

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی　　　غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

فرماتے ہیں۔ معنی کے موتیوں سے میرا کاغذِ تحریر لقا کی داڑھی بن گیا ہے (بیان کیا جاتا ہے کہ لقا داڑھی کے بالوں میں موتی پرویا کرتا تھا) اور دنیا کے غموں سے میرا سینہ عمر عیار کی زنبیل بن گیا ہے۔ عمر عیار کی زنبیل کی نسبت داستان گو بیان کرتے ہیں کہ ساری دنیا کی چیزیں اس میں رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ زنبیل عمر بجائے خود ایک دوسری دنیا تھی۔ گویا میرے سینہ میں غمِ گیتی کی اسی طرح سمائی ہے جس طرح عمر عیار کی زنبیل میں اشیاءِ عالم کی۔

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر　　　کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

فرماتے ہیں۔ میں نے اپنی عبارتِ قلیل میں اشاراتِ کثیر ادا کر دیے ہیں۔ مطلب یہ ہے گو میں نے اپنا مختصر حال عرض کیا ہے اور وہ بھی صاف صاف بیان نہیں کیا لیکن پھر بھی اشاراتِ کثیر اس میں ایسے موجود ہیں جس سے میری مصیبتوں کا حال تمام و کمال مفصل و مشرح آپ سمجھ سکتے ہیں۔

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح　　　میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

فرماتے ہیں۔ میں ایسا جادو بیان شاعر ہوں کہ میرا مبہم حال بیان کیا ہوا توضیح سے بڑھ کر ظاہر ہوتا ہے اور میرے مجمل بیان سے تفصیل پڑی ٹپک رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری عبارت کے الفاظ قلیل ہیں اور معنی کثیر۔

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف　　　جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

فرماتے ہیں۔ اگر مجھ کو مصائب کا سامنا نہ ہوا ہوتا تو میں حضور کو تکلیف نہ دیتا اور مصائب سے میرا دل اگر پریشان نہ ہو جاتا تو میں زود طلبی کو کام میں نہ لاتا۔

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر　　　کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

سارے قطعہ کا لب لباب یہ شعر ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ معنی صاف۔

قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

یہاں تقریر کرنا بیان کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جو فارسی محاورہ تقریر کردن کا ترجمہ ہے۔ فرماتے ہیں۔ وہ دن تو گزر گئے کہ تم ناتجربہ کاری سے غیروں کی وفاداری کی تعریف بیان کیا کرتے تھے اور ہم خاموش بیٹھے ہوئے سُنا کرتے تھے اور اپنے دل میں جلا کرتے تھے۔

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

فرماتے ہیں۔ بس اب ان سے بگڑ گئی ہے، تو ہم سے تم کیوں شرمندگی کی وجہ سے نہیں ملتے آؤ مل جاؤ۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ تم سے یہ بات بھی نہ کہیں گے۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے کہ یہ لوگ بے وفا ہیں، تم سے بے وفائی کریں گے۔

قطعہ

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

حف نظر کے معنی چشم بد دور کے ہیں۔ باقی شعر صاف ہیں۔

مدح ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی زیب دیتا ہے اِسے جس قدر اچھا کہئے

اس قطعہ کی نسبت حضرت استاذی مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی یادگار غالب میں تحریر فرماتے ہیں، ۱۸۳۰ء میں جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتہ گئے ہوئے تھے

مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتہ کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے، نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانہ میں میرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا، شعراء کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضیؔ کی بہت تعریف کی۔ میرزا نے کہا فیضیؔ کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے۔ اِس پر بات بڑھی اس شخص نے کہا۔ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا اُس نے ڈھائی سو شعروں کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ میرزا بولے اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال ہتھیلی پر رکھی اور میرزا سے درخواست کی کہ اِس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ میرزا نے تیرہ ۱۳ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا۔ وہ یہی قطعہ ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اِسے کیا لکھئے ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

فرماتے ہیں۔ خامہ انگشت بدنداں، یعنی حیرت میں مبتلا ہے کہ اس چکنی ڈلی کو میں کیا لکھوں اور ناطقہ سر بگریباں یعنی فکر و تشویش میں پھنسا ہوا ہے کہ اس کو کیا کہنا چاہیئے۔

مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھئے حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہئے

فرماتے ہیں۔ اس کو کسی کے نامۂ شوق کی مہر سے مشابہ لکھنا چاہیئے، یا کسی معشوق شوخ و شنگ کے بازو کا تعویذ سمجھنا چاہیئے۔

مِسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھئے داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہئے

چھنگلیا کے پاس کی انگلی سے عورتیں مسی ملا کرتی ہیں۔ اور مسی کے رنگ سے انگلی کی پور سوسنی رنگ کی ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ حسینوں کی مسی آلود پور اس کو لکھنا چاہیئے یا داغ جگر عاشق شیدا قرار دینا مناسب ہے۔

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھئے سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہئے

فرماتے ہیں۔ ایک تشبیہ تو اس کی یہ ہے کہ خاتم دست سلیماں اس کو لکھا جائے اور دوسری

تشبیہ یہ ہے کہ پستان پریزاد کی بھٹنی کہا جائے۔

اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجئے خالِ مشکیں رُخِ دلکش لیلےٰ کہئے

یا اس کو قیس کے اختر سوختہ سے نسبت دینی چاہیئے، یا خالِ مشکیں جو رُخِ لیلیٰ پر تھا وہ اس کو سمجھنا چاہیئے۔

حجر الاسودِ دیوار حرم کیجئے فرض نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہئے

یا اس کو حجر الاسود فرض کرنا چاہیئے، یا آہوئے ختن کا نافہ کہنا چاہیئے۔

وضع میں اس کو اگر سمجھئے قافِ تریاق رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہئے

یہ شعر صاف ہے۔

صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز میکدے میں اسے خشت خمِ صہبا کہئے

فرماتے ہیں۔ عبادت خانہ میں اس کو سجدۂ نماز کا رتبہ حاصل ہے تو میخانہ میں خشت پلائے سر خم کا رتبہ رکھتی ہے۔

کیوں اسے قفلِ درِ گنج محبت لکھئے کیوں اسے نقطۂ پرکار تمنا کہئے

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجئے کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہئے

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ کہئے کیوں اسے نقش پئے ناقۂ سلما کہئے

فارسی میں تکمہ گھنڈی کے معنی پر استعمال ہوتا ہے اور میرزا صاحب نے اسی معنی پر تکمہ کا لفظ برتا ہے۔

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لئے بطور الوش

کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکریہ میں کبھی کبھی میرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گزرانتے تھے، یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے۔ جس وقت چوبدار شاہی یہ اولوش لے کر آیا، ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو میرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا، موجود تھا، چوبدار کے چلے جانے کے بعد اس نے متعجب ہو کر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے۔ میرزا نے کہا، اے احمق چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں۔ پکاتے ہیں۔ اور مجھ سے سینکڑوں چیزیں کھانے کی بنا کر کھاتے ہیں، جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔
(از یادگار غالب)

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا   باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

یہ وہی سہرا ہے جس کے جواب میں استاد ذوق نے بھی سہرا لکھا ہے۔ اور مقطع میں چوٹ کی ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ چوٹ کا جواب دیا ہے۔ معنی صاف ہیں۔

کیا ہی اِس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے   ہے ترے حُسنِ دل افروز کا زیور سہرا

فرماتے ہیں، کس قدر اِس چاند سے چہرہ پر اچھا معلوم ہوتا ہے گویا سہرا تیرے حُسن دلآویز کے واسطے زیور کا کام دے رہا ہے۔

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ   مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

فرماتے ہیں۔ اے گوشۂ کلاہ تجھ کو یہ سرفرازی مبارک ہو کہ تو نوشاہ کے سر تک پہنچ گیا ہے، مگر مجھ کو یہ خوف ہے کہ تیرے درجہ اور مرتبہ کو سہرا چھین نہ لے۔

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی   ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

میرزا صاحب کی نزاکت معنی اِس شعر میں اپنی آب و تاب دکھا رہی ہے۔ مطلب صاف ہے اور کوئی بات شرح طلب نہیں۔

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی　　تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

گویا سہرے میں اتنے موتی پروئے گئے ہیں کہ جب تک ہفت قلزم کے گوہر آبدار جمع نہ کئے جائیں اُس وقت تک گز بھر کی لڑی بھی سہرے کی نہیں بن سکتی۔

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا　　ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

فرماتے ہیں۔ دولھا کے رُخ پر گرمی سے پسینے کے قطرے جمع ہوگئے ہیں۔ اُن کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابرِ نیساں بارِ موتی برسا رہا ہے، سہرے کی لڑی نہیں ہے بلکہ رگِ ابر ہے۔

یہ بھی اِک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے　　رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اِک چیز　　چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مکرّر سہرا

یہ دونوں شعر صاف ہیں۔ معنی میں کسی قسم کی دقت نہیں ہے۔

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے　　گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

کلیوں کا کِھلنا گویا قبائے گُل کا جوشِ مسرت سے چاک ہو جانا ہے۔ ایسی صورت میں سہرے کا گوندھا جانا دشوار ہو گیا ہے۔

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک　　کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

رخِ روشن کو فروغِ ماہ سے اور گوہرِ غلطاں کو ستاروں کی چمک سے تعبیر کیا ہے، باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار　　لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

فرماتے ہیں۔ یہ ریشم کا تار نہیں ہے، رگِ ابرِ بہار ہے۔ ریشم کا تار اتنے بڑے بڑے موتیوں کو کب سنبھال سکتا ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں   دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ میرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشدزادوں سے چھوٹے تھے، مگر بیگم کی خاطر سے ان کی ولیعہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقعہ آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا کہہ کر زر نگار کاغذ پر لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گزرانا۔ جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ استاد مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ استاد اسے تو دیکھو، اُنھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی، پیر و مرشد درست، بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو، اور کہا مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی حضور دیکھا۔ غرض بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا   آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک   کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا
تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید   رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا
وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ   دیکھے مُکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
تم ہنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم   گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی   گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا
رُوئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار   تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا
ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش   سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا
ایک گوہر بھی نہیں صدفِ کانِ گہر میں چھوڑا   تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
پھر گئی خوشبو سے ہوا اترائی ہوئی بادِ بہار   اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا
سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدّھی!   کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے یہ وخورشید فلک — کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اُٹھا کر سہرا
کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے — دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا
جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سُنا دو اُن کو — دیکھو اِس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں، اسی وقت انھیں ملا اور شہر کی گلی گلی، کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ میرزا بڑے اداشناس تھے، سمجھے، کہ کیا تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور۔ یہ قطعہ لکھ کر حضور میں گزرانا، سب طرف تعریفیں ہوئیں (از شمس العلما مولانا آزاد مؤلف آبحیات و دیوان ذوق وغیرہ)

قطعۂ معذرت

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ واقعی حال گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو اپنے حُسنِ طبیعت کا بیان کرنا منظور نہیں ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ اہلِ سیف کی عزّت و توقیر اہلِ قلم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور میرا موروثی پیشہ سپہ گری ہے اور یہی میرا باعثِ عزت ہے۔ یہ شاعری کو میں اپنی عزّت کا سبب نہیں سمجھتا۔

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ میں آزاد روش کا انسان ہوں اور میرا طریقہ صلحِ کُل ہے، میں کبھی کسی سے عداوت نہیں رکھتا۔

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ یہ شرف میرے لئے کیا کم ہے کہ میں ظفر کا غلام ہوں۔ پھر کیا دیوانہ ہوں کہ شاعری

کو عزت کا ذریعہ سمجھوں۔ اس بات کو میں مانتا ہوں کہ اور غلاموں کی طرح مجھ کو ثروت و منصب و حاصل نہیں ہے، نہ ہو۔ مجھ کو کچھ اس کا افسوس بھی نہیں۔

اُستاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

اِس شعر کا مطلب صاف ہے۔

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو ریختہ گوئی سے کیا واسطہ۔ اُردو شعر کہاں، میں کہاں۔ مجھ کو اگر ہے تو فارسی زبان میں شعر کہنے کا شوق ہے۔ یہ تو صرف حضور کے خوش کرنے کو اُردو میں غزل وغیرہ لکھ لیا کرتا ہوں۔ چنانچہ:-

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

حضور کے حکم سے سہرا میں نے لکھا ہے۔ جب یہ دیکھا کہ سوائے اطاعت کے یعنی حکم بجالانے کے مجھے چارہ ہی نہیں ہے۔

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ اِس سہرے کا مقطع جو میں نے یہ لکھا ہے:۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

یہ ایک شاعرانہ بات ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں دوستانہ مراسم قطع کر دوں۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنون نہیں وحشت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ میں نے اگر کسی پر چوٹ کی ہو تو کالا منہ ہو۔ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ مجھ کو جنون نہیں ہے۔ میں انسان ہوں۔ ذی عقل ہوں۔ وحشی جانور نہیں ہوں۔

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ میں بد قسمت ہوں۔ بد طینت نہیں ہوں۔ یہ شکر کی بات ہے کہ مجھ کو کسی بات کی شکایت نہیں ہے۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ اے غالبؔ میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں صادق القول شخص ہوں اور میں جو کچھ کہتا ہوں، یعنی کہہ رہا ہوں وہ سچ کہہ رہا ہوں مجھ کو جھوٹ کی عادت نہیں ہے۔

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

فرماتے ہیں۔ اے نصرت الملک بہادر مجھ کو جو تجھ سے اِس قدر ارادت ہے میں حیران ہوں کہ یہ کس وجہ سے ہے یعنی انعام و احسان کی وجہ سے جو ارادت ہوا کرتی ہے اس میں روحانی تعلق خاطر کی جھلک نہیں ہوا کرتی۔ محبت قلبی دوسری شے ہے اور بغیر احسان مندی کے قدرتی طور سے دل میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ عجیب بلیغ شعر لکھا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے رونقِ بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ تو وہ ہے کہ اگر دربار آراستہ کرے تو بزم مہ مہر کو بھی تیری ذات سے رونق حاصل ہو جائے۔

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

فرماتے ہیں۔ تیری خوبیوں کا موازنہ جب اپنی ذات سے کرتا ہوں تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ مجھ سا ننگ آفرینش تیرے لطف و عنایت کا سزاوار نہیں ہے۔ غیر تو غیر مجھ کو خود اپنی اوقات سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست نسبت اِک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

فرماتے ہیں۔ میری خستہ دلی کا بھلا ہو جس کے سبب سے سردستِ تیری ذرہ نوازی کی بدولت مجھ کو بھی تجھ سے ایک شکر گزاری کا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصیبت زدہ شخص ہوں اور تو مصیبت زدہ آدمیوں کی امداد کا خوگر ہے۔

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں　　یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے

فرماتے ہیں۔ تیرے دستِ زبردست میں توسنِ دولت کی باگ رہے۔ صبح و شام قاضی الحاجات کی درگاہ میں یہ دعا کیا کرتا ہوں۔

تو سکندر ہے مرا فخر ہے مِلنا تیرا　　گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

تو میرا سکندر ہے۔ مجھ کو تجھ سے مل کر فخر حاصل ہوتا ہے اگرچہ حضرت خضر کی بھی ملاقات سے مجھ کو شرف حاصل ہوتا ہے۔ یہ اشارہ خضر و سکندر کے مشہور قصہ کی طرف ہے۔

اس پہ گذرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار　　غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

فرماتے ہیں۔ مکاری و ریاکاری کے واسطے اہلِ اصلاح و تقویٰ مخصوص ہیں۔ غالبِ خاک نشیں رندانِ خرابات سے ہے جن کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے فریب و مکر جانتے ہی نہیں۔

قطعہ

ہے چہار شنبہ آخر ماہِ صفر چلو　　رکھدیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

فرماتے ہیں۔ آج آخری چہار شنبہ ہے۔ سبزہ روندنے کے لئے باہم مل کر احباب آتے ہیں۔ ہم بھی چمن میں مئے مشکبو کی ناند بھر کر رکھ دیں۔

جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست　　سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

جو شخص آئے ایک جام بھر کے پی لے اور مست ہو کے سبزے کو روندے اور پھولوں پر سے کود جائے۔

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ　　بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتِ خواند

فرماتے ہیں۔ اے غالب اس قطعہ کی تشبیب میں تو فضول باتیں کیا لکھ رہا ہے۔ تشبیب کو

چھوڑ کر تو شاہ کی مدح کی طرف متوجہ ہو جا۔ مجھ کو بجز مدح بادشاہ کے اور کوئی بات پسند نہیں آتی۔

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں　　ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند

فرماتے ہیں۔ آج کے دن بادشاہ کے دربار میں سونے چاندی کے چھلّے، عمل کے دم کئے ہوئے پانی میں بُجھا کر تقسیم کئے جاتے ہیں اور وہ چھلّے ایسے آب و تاب کے ہوتے ہیں کہ جن کے سامنے مہر و ماہ کا سیم و زر بھی چمک دمک نہیں دکھا سکتا۔ دھوپ کا سنہری رنگ مانا گیا ہے اور چاندنی کا سفید۔ چنانچہ کسی شاعر کا مصرعہ ہے، ع

چاندنی چاندی کا پتّر دھوپ سونے کا ورق

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے　　لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

فرماتے ہیں۔ ان سونے چاندی کے چھلّوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر بیچ سے خالی نہ ہوتے تو گویا لاکھوں آفتاب اور بے شمار چاند تھے۔

در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیر، جہاں بخش، جہاندار　　ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

میرزا صاحب نے اس شعر میں بادشاہ کی تین صفتیں بیان کی ہیں۔ پہلی صفت جہانگیری، دوسری صفت جہاں بخشی، تیسری صفت جہانداری۔ فرماتے ہیں۔ یہ صفتیں تجھ کو اسی وجہ سے حاصل ہو گئی ہیں کہ تجھے ہر کام کے کرنے کے لئے غیب سے بشارت ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تیرا ہر ارادہ پورا ہو جاتا ہے اور کسی کام میں ناکامی کا دخل نہیں ہوتا۔

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو　　تو وا کرے اس عقدے کو سو وہ بھی بہ اشارت

فرماتے ہیں۔ تیرے ادنیٰ سے ایک اشارے سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جو برسوں کی کوشش سے بھی حل نہیں ہو سکتی۔

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر　　گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

فرماتے ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ حضرت خضر سکندر سے تیرے عزّ و جاہ کا ذکر فرمائیں اور پہلے آبِ حیواں سے کلیاں نہ کرلیں۔

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا ۔۔۔ ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت

فرماتے ہیں۔ آصف کو حضرت سلیمانؑ کا وزیر بن کر شرف حاصل ہوگیا تھا۔ اگر حضرت سلیماں تیری وزارت کا کام انجام دیں تو ان کے لئے باعثِ فخر ہے۔

ہے نقش مریدی ترا فرمانِ الٰہی! ۔۔۔ ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

فرماتے ہیں۔ تجھ سے ارادت رکھنی اور تیری فرمانبرداری حکمِ الٰہی کے موافق ہے اور جس کو ترا داغ غلامی نصیب ہوگیا اس کو گویا امیری کی سند حاصل ہوگئی۔

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں ۔۔۔ تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈھے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی ۔۔۔ باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

لف و نشر مرتب ہے۔ یعنی اگر تو پانی سے اس کے بہنے کی طاقت کو سلب کرلے تو موجۂ دریا میں روانی باقی نہ رہے۔ اور اگر تو اس آگ سے اس کی گرمی کو دفع کر دینا چاہے تو جلتی ہوئی آگ میں گرمی باقی نہ رہے۔

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل ۔۔۔ ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر ۔۔۔ قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ میں بہت مشاق شاعر ہوں اور بہت بڑے مضمون کو تھوڑی عبارت اور کم لفظوں میں ادا کرسکنے پر قادر ہوں لیکن تیرے اوصاف بیان کرنے میں بھی قاصر ہو جاتا ہوں۔ اس لئے مجبور ہو کر مدح کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں ۔۔۔ نظارگی صنعتِ حق اہلِ بصارت

فرماتے ہیں۔ آج جشن نوروز کا دربار ہے اور تماشائی چشمِ بصیرت سے اللہ تعالےٰ کی صنعتِ تخلیق کو دیکھ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے چہرۂ انور کی زیارت سے مشرف

ہوئے ہیں۔

بجھ کو شرفِ مہرِ جہانتاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

فرماتے ہیں۔ بجھ کو شرفِ آفتاب مبارک ہو اور غالب کو تیری زیارت۔

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

میرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کے حضور میں پڑھا گیا تھا جس کو سُن کر بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے (از یادگارِ غالب)

قطعہ

یہ وہ قطعہ ہے جو میرزا نے بادشاہ کے حضور میں اس درخواست سے گزرانا تھا کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی گزرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ بماہ ملا کرے، چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ملنے لگی تھی (از یادگارِ غالب)

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اِک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اِک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی!
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرّہ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشاہ کا غلامِ کارگزار
خانہ زاد اور مرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی میرزا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی۔ اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے ہاں گزرانتے تھے اور خلعت پاتے تھے۔

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان! — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربّنا عذاب النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے — اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیے — ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میرا ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ | تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام | شاعری سے نہیں مجھے سروکار

شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے۔ چونکہ یہ قطعہ میرزا نے اپنی خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جس میں کسی طرح کی صنعتِ شاعرانہ نہیں ہے (از یادگار غالب)

تم سلامت رہو ہزار برس | ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے | جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے | کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

شریک غالب اس شریک کو کہتے ہیں جس کا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ شریکِ غالب کے لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے (از یادگار غالب)

قطعہ

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی | مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد | تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کَے دن ہوئے

ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے۔ یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔ (از یادگار غالب)

قطعۂ تاریخ

خجستہ انجمنِ طوے میرزا جعفر | کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب | نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی محظوظ

۱۸۵۴ء

طوئے کے معنی بیاہ کے ہیں۔ شاہزادہ میرزا جعفر کی تاریخ لکھی ہے۔ مادہ محظوظ ہے۔ سنہ ۱۲۵۴ھ نکلتا ہے۔

ایضاً

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہوا بزمِ طرب میں رقص ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اسکی کیا ہے — تو بولا "اِنشراحِ جشنِ جمشید"
سنہ ۱۲۷۰ھ

قطعہ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام — اِس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ ادب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے، چونکہ اُردو محاورہ میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں۔ اِس لئے میرزا نے اس کو اس پیرایہ میں بیان کیا ہے (از یادگار غالبؔ)

رُباعیات

بعد از اتمام بزمِ عیدِ اطفال — ایامِ جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم — اے عمرِ گذشتہ یک قدم استقبال

اس رباعی میں میرزا صاحب نے عمرِ گزشتہ کو واپس پلٹ آنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے عمرِ گزشتہ تو جہاں ہے اِسی اقلیم کے قرب وجوار میں ہم بھی آپہنچے ہیں۔ ہمارے استقبال کے لئے ایک قدم تو بھی واپس چلی آ۔ شاید تیرے واپس آنے سے دو چار دن کے لئے

شباب رفتہ بھی واپس آجائے۔

رُباعی

شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا　　کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک　　ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُرنم تھا

فرماتے ہیں۔ رات کے وقت مجھ کو اس کی زلفیں اور رُخِ عرق فشاں یاد آکر کچھ ایسی پریشانی پیدا ہو گئی تھی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور چونکہ زلف اور رُخ کا تصوّر تھا، اس لئے آنسو نے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی پیدا کر لی تھی۔ گویا ہر آنسو میرا ایک آنکھ بن گیا تھا اِس لئے ہزاروں آنکھوں سے روتا رہا۔

رُباعی

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال　　ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی　　لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

فرماتے ہیں۔ آتشبازی جس طرح بچّوں کا کھیل ہے اِسی طرح معشوقانِ ستمگار سوزِ جگر عاشق کو دلچسپی کا باعث سمجھتے ہیں۔ موجدِ عشق بھی کوئی قیامت کا پُتلا تھا جو ان معشوقوں کے لئے یہ کھیل ایجاد کر گیا ہے۔

رُباعی

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی　　بیتابیٔ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلّی افسوس　　تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

فرماتے ہیں۔ کچھ روز پہلے ہمارے پہلو میں دل تھا۔ ہم دل رکھتے تھے جو زندگانی پر درد کی سختیاں برداشت کر لیتے تھے۔ بیتابیٔ رشک کو جھیلا اور دیدار کی حسرت سہہ لی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اب ہم ہیں اور افسردگی اور بے دلی۔ اے تجلّی طور اگر تیری تکرار ناممکن اور محال ہے تو تجدید ہی سہی کہ مجھ سے افسردہ دل کو پھر اسی سوز و گداز کی ہوس ہے۔ گو تکرار ہر شئے

کی مجال ہے۔ یعنی معدوم کا اعادہ نہیں ہو سکتا۔ مگر سوز و گداز کا از سرِ نو پیدا ہو جانا تو ناممکنات سے نہیں ہے۔

رُباعی

ہے خلق حسد قماش لڑنے کیلئے　　وحشت کدۂ تلاش لڑنے کیلئے
یعنی ہر بار صورت کاغذ باد　　ملتے ہیں یہ بد معاش لڑنے کیلئے

فرماتے ہیں۔ یہ مخلوق جس نے اپنا شعار حسد و بغض کر لیا ہے، رات دن لڑتے رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور وحشت کدۂ تلاش یعنی تلاش معاش لڑنے کے واسطے ہے۔ تکلّوں اور گڈیوں کی طرح یہ بدمعاش باہم ملتے ہیں۔ ملنے سے ان کی مراد لڑائی ہوتی ہے۔ جس طرح تکل اور گڈی آپس میں مل کر لڑتی ہے۔

رُباعی

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا　　اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں　　غالبؔ مُنہ بند ہو گیا ہے گویا

فرماتے ہیں۔ دل نہایت غمگین ہو گیا گویا، اور اس سے گلہ مند ہو گیا ہے۔ گویا باوجود اِن دونوں باتوں کے یار کے سامنے طاقتِ گویائی باقی نہیں رہتی۔ گویا غالبؔ کا منہ بند ہو گیا ہے۔

رُباعی

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ　　دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں　　سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

اکثر دیوانوں میں اس رُباعی کا مصرعۂ ثانی رُک رُک کر لکھ دیا گیا ہے اور اِس صورت میں دو حرف وزن سے بڑھ جاتے ہیں۔ باقی رباعی کے معنی صاف ہیں۔

رُباعی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائیش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اس اخیر کے مصرعے میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر ان کی فرمائیش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنورانِ کامل کی نافہمی وکند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں۔ پس ہر طرح مشکل ہے۔ (از یادگار غالب)

قطعہ

بھیجی ہے جو مجھکو شاہ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اس کے شکریہ میں لکھی گئی ہے۔

رباعی

ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم
آثار جلالی و جمالی باہم

ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کے شب قدر و دیوالی باہم

فرماتے ہیں۔ دیوالی کی بت پرستی مرتبہ سافل ہے اور شبِ قدر کی عبادت درجہ عالی ہے۔

قطعہ

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوع دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر، کہ افزائش اعداد کرے

رباعی

اِس رشتے میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا

ہر سالگرہ کو ایک گرہ فرض کریں — ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

یہ دونوں رباعیاں بادشاہ کی سالگرہ کی مبارکباد میں لکھی گئی تھیں۔ دونوں بے مثل ہیں۔ دونوں رباعیوں میں ترقیِ عمر کی دعائیں دی گئی ہیں۔

رباعی

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں — عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا — کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

کسی کام سے ہاتھ اٹھانا۔ گویا اس کام سے دست بردار ہونا۔ اور دوسرے معنی ہاتھ اٹھانے کے ہیں کہ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھانا۔

رباعی

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں، کہیں خدا سے اللہ اللہ — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

اس رباعی میں میرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم ہرچند دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں، مگر وہ ہماری کارروائی میں درنگ ولیت ولعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت ولعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے، تو خدا کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کارروائی خلق میں جیسی لیت ولعل وہاں ہوتی ہے ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا (از یادگار غالب)

رباعی

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزہ کا مضمون باندھا ہے، دربار میں پیش کی گئی تھی۔

رُباعی

اِن سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گِن کر دیویں گے ہم دعائیں سَو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا، اس کے شکریہ میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے (از یادگار غالبؔ)

رُباعی

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقبؔ حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلّو کو دیکے بے وجہ جواب
غالبؔ کا پکا دیا کلیجا تم نے

ایضاً

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خاں
کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں

میرزا صاحب نے یہ دونوں رباعیاں شہاب الدین احمد خاں المتخلص بہ ثاقبؔ، خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر المتخلص بہ نیر درخشاں کو لکھ کر بھیجی تھیں۔ حضرت ثاقبؔ میرزا صاحب کے بہت عزیز شاگرد تھے اور فارسی بھی میرزا صاحب سے پڑھی تھی۔ علاوہ شاگردی کے قرابت بھی رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ عہد جوانی میں انتقال فرما گئے۔

تمام شد

بار چہارم ـــــــــــــــ دسمبر ۱۹۵۵ء

نوٹ: غلطی سے صفحہ ۲ پر بار دوم چھپ گیا ہے، صحیح بار چہارم ہے۔